قرآنِ کریم کے واقعات

مولانا ندیم الواجدی

دار الکتاب دیوبند

قرآنِ کریم کے واقعات

مولانا ندیم الواجدی

دارُالکتاب دِیوبند

تفصیلات

نام کتاب............: قرآنِ کریم کے واقعات

نام مصنف.............: مولانا ندیم الواجدی

طبع اوّل ....: ۲۰۱۹ء

صفحات.................: ۲۹۶

کمپیوٹر کتابت ....: محمد مستقیم سالک قاسمی مدھوبنی

یاسر ندیم کمپیوٹرس دیوبند

مطبع.................: یاسر ندیم آفسیٹ پریس دیوبند

باہتمام.................: واصف حسین مالک دارالکتاب دیوبند

ناشر

دارالکتاب دیوبند

DARUL KITAB

DEOBAND- 247554 U-P

Ph-(o) 01336- 222558- (H) 222924 (Fax) 222558

9412557658 - 9997520332

nadimulwajidi@gmail.com

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
☆	پیش لفظ	۱۵
۱	**حضرت آدم علیہ السلام**	۱۷
۲	قرآن کریم میں حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر	۱۷
۳	دنیا میں تشریف آوری	۱۸
۴	**حضرت نوح علیہ السلام**	۲۰
۵	حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت	۲۰
۶	قوم نوح پر عذاب خداوندی	۲۱
۷	**حضرت ادریس علیہ السلام**	۲۳
۸	قرآن کریم میں حضرت ادریس علیہ السلام کا مختصر تذکرہ	۲۳
۹	بابل؛ مرکز دعوت	۲۳
۱۰	مصر کی طرف ہجرت	۲۴
۱۱	وفات کا حیرت انگیز واقعہ	۲۵
۱۲	**حضرت ہود علیہ السلام**	۲۶
۱۳	قوم عاد قوم نوح کی جانشین	۲۶
۱۴	قوم عاد کی سرکشی اور عذاب الٰہی	۲۷
۱۵	**حضرت صالح علیہ السلام**	۲۹
۱۶	عاد ثانیہ یا قوم ثمود	۲۹
۱۷	حضرت صالح علیہ السلام کا معجزہ	۳۱
۱۸	قوم ثمود کی ہلاکت اور بربادی	۳۱

۱۹	**حضرت ابراہیم علیہ السلام**	۳۳
۲۰	ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام	۳۳
۲۱	والد کو قائل کرنے کی کوشش	۳۳
۲۲	قوم سے خطاب	۳۴
۲۳	نمرود کے دربار میں	۳۵
۲۴	آتشِ نمرود	۳۷
۲۵	**حضرت اسماعیل علیہ السلام**	۳۹
۲۶	حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے بیٹے	۳۹
۲۷	حکم الٰہی کی تعمیل	۳۹
۲۸	دعائے ابراہیمی	۴۰
۲۹	چشمۂ زمزم پھوٹ پڑا	۴۱
۳۰	قبیلۂ بنو جرہم کی آمد	۴۲
۳۱	حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خواب	۴۲
۳۲	اہل وعیال کی خبر گیری	۴۴
۳۳	تعمیر کعبہ	۴۵
۳۴	**حضرت لوط علیہ السلام**	۴۶
۳۵	قوم لوط کی بے حیائی	۴۶
۳۶	بستی الٹ دی گئی	۴۸
۳۷	**حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہما السلام**	۵۰
۳۸	دو بڑے پیغمبر	۵۰
۳۹	ذبیح اللہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں	۵۱
۴۰	حضرت یعقوب کی پیدائش	۵۱
۴۱	**حضرت یوسف علیہ السلام**	۵۲
۴۲	قرآن کریم میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ	۵۲

۴۳	بیٹے کا خواب اور باپ کی ہدایت	۵۳
۴۴	بھائیوں کا اصرار	۵۵
۴۵	بھائی دشمن بن گئے	۵۶
۴۶	اللہ کی نصرت	۵۸
۴۷	کنویں سے محل تک	۵۹
۴۸	عزیز مصر کی ملکہ	۶۱
۴۹	بیگماتِ مصر بھی فریفتہ	۶۲
۵۰	قید خانے کی سرگزشت	۶۳
۵۱	بادشاہ کا خواب	۶۳
۵۲	قید سے رہائی	۶۵
۵۳	مصر میں قحط سالی اور حضرت یوسف علیہ السلام کی تدبیر	۶۶
۵۴	مصر میں برادران یوسف کی آمد	۶۸
۵۵	**حضرت شعیب علیہ السلام**	۷۰
۵۶	خطیب الانبیاء حضرت شعیب علیہ السلام	۷۰
۵۷	اہل مدین کی اخلاقی برائیاں	۷۱
۵۸	اہل مدین پر اللہ کا عذاب	۷۲
۵۹	**حضرت موسیٰ علیہ السلام**	۷۳
۶۰	بنی اسرائیل میں پیغمبروں کی بعثت	۷۳
۶۱	فرعون کا خواب	۷۵
۶۲	دشمن کے محل میں	۷۷
۶۳	مصر سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہجرت	۷۹
۶۴	حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین میں	۸۰
۶۵	مصر کی طرف روانگی	۸۲

۶۶	کوہ طور پر اللہ سے شرفِ ہم کلامی	۸۳
۶۷	بارگاہِ الٰہی میں درخواست	۸۴
۶۸	فرعون کی طرف جانے کا حکم	۸۵
۶۹	جادوگروں سے مقابلہ	۸۷
۷۰	فرعون کو منہ کی کھانی پڑی	۸۸
۷۱	فرعون کی نافرمانی اور اللہ کا عذاب	۹۰
۷۲	مصر سے بنی اسرائیل کی ہجرت	۹۱
۷۳	فرعون مصر کی لاش یا نشان عبرت	۹۳
۷۴	بنی اسرائیل کی نافرمانیوں کا آغاز	۹۴
۷۵	من وسلویٰ	۹۵
۷۶	مصر میں شان دار واپسی	۹۶
۷۷	سامری کا قصہ	۹۷
۷۸	حضرت موسیٰ کوہِ طور پر	۹۸
۷۹	حضرت موسیٰ کی وطن واپسی	۹۸
۸۰	حضرت ہارون علیہ السلام کی صفائی	۹۹
۸۱	بنی اسرائیل کو نافرمانی کی سزا دی گئی	۱۰۰
۸۲	معافی کا عام اعلان	۱۰۱
۸۳	کوہِ طور اور ستّر سردارانِ بنی اسرائیل	۱۰۱
۸۴	یقین اور بے یقینی کی کیفیت	۱۰۲
۸۵	بنی اسرائیل کی معاندانہ روش اور اللہ کا فضل وکرم	۱۰۴
۸۶	ارضِ مقدس کی وراثت	۱۰۴
۸۷	بنی اسرائیل کی بزدلی	۱۰۵
۸۸	اللہ کے نبی کی ناراضگی اور قوم کے لئے بددعا	۱۰۶

۸۹	حضرت ہارون اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کی وفات	۱۰۷
۹۰	کچھ ذکر قارون کا	۱۰۹
۹۱	ایک قتل کا واقعہ	۱۱۱
۹۲	حضرت خضر علیہ السلام کا ذکر خیر	۱۱۲
۹۳	حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تنبیہ اور آگاہی	۱۱۳
۹۴	حضرت خضر علیہ السلام کی تلاش	۱۱۴
۹۵	ملاقات کے بعد	۱۱۶
۹۶	ایک بستی کا واقعہ	۱۱۶
۹۷	کشتی کا واقعہ	۱۱۷
۹۸	معصوم بچے کا قتل	۱۱۸
۹۹	**حضرت یوشع بن نون علیہ السلام**	۱۱۹
۱۰۰	حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رفیقِ سفر	۱۱۹
۱۰۱	حضرت یوشع بن نون کا ایک واقعہ	۱۲۰
۱۰۲	حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جانشینی	۱۲۰
۱۰۳	سکینۂ بنی اسرائیل	۱۲۲
۱۰۴	**حضرت الیاس علیہ السلام**	۱۲۳
۱۰۵	قرآن کریم میں حضرت الیاس علیہ السلام کا ذکر	۱۲۳
۱۰۶	حضرت الیاس علیہ السلام کے مختصر حالات	۱۲۴
۱۰۷	بت پرستی کے خلاف جدو جہد	۱۲۵
۱۰۸	قحط سالی کا عذاب	۱۲۶
۱۰۹	**حضرت الیسع علیہ السلام**	۱۲۸
۱۱۰	**حضرت ذوالکفل علیہ السلام**	۱۲۹
۱۱۱	**حضرت شمویل علیہ السلام**	۱۳۰

۱۱۲	شموئیل کے معنی	۱۳۰
۱۱۳	طالوت و جالوت کا قصہ	۱۳۱
۱۱۴	بنی اسرائیل کے وعدے اور وعدہ شکنی	۱۳۳
۱۱۵	طالوت کی بادشاہت	۱۳۴
۱۱۶	جالوت سے جنگ	۱۳۵
۱۱۷	بنی اسرائیل کی فتح	۱۳۶
۱۱۸	**حضرت داؤد علیہ السلام**	۱۳۹
۱۱۹	قرآن کریم میں ذکر	۱۳۹
۱۲۰	لحن داؤدی	۱۴۰
۱۲۱	چرند و پرند کی تسبیح	۱۴۱
۱۲۲	حضرت داؤد علیہ السلام کا ایک اور معجزہ	۱۴۲
۱۲۳	دنیوی نعمتوں پر شکر	۱۴۳
۱۲۴	بنی اسرائیل کے مکر و فریب کا ایک واقعہ	۱۴۳
۱۲۵	حضرت داؤد علیہ السلام کی آزمائش و ابتلاء کا واقعہ	۱۴۵
۱۲۶	تمام انبیاء معصوم ہیں	۱۴۶
۱۲۷	واقعۂ آزمائش کی حقیقت	۱۴۸
۱۲۸	حضرت داؤد علیہ السلام کی عبادت کا حال	۱۴۹
۱۲۹	**حضرت سلیمان علیہ السلام**	۱۵۰
۱۳۰	حضرت سلیمان علیہ السلام کی فہم و فراست	۱۵۱
۱۳۱	بے مثال سلطنت	۱۵۲
۱۳۲	ہواؤں کی تسخیر	۱۵۴
۱۳۳	تخت سلیمانی	۱۵۵
۱۳۴	جنات بھی مسخر تھے	۱۵۷

۱۳۵	جانوروں کی بولیاں	۱۵۹
۱۳۶	ایک چیونٹی کا قصہ	۱۵۹
۱۳۷	ہدہد کا واقعہ	۱۶۰
۱۳۸	قوم سبا اور ملکہ بلقیس	۱۶۳
۱۳۹	آصف بن برخیا	۱۶۶
۱۴۰	ملکہ بلقیس کا تخت شاہی	۱۶۷
۱۴۱	حضرت سلیمان علیہ السلام کا امتحان	۱۷۰
۱۴۲	حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات	۱۷۱
۱۴۳	**حضرت ایوب علیہ السلام**	۱۷۲
۱۴۴	بیماری کے ذریعہ حضرت ایوب علیہ السلام کی آزمائش اور بے مثال صبر	۱۷۳
۱۴۵	حضرت ایوب علیہ السلام کی دُعا	۱۷۴
۱۴۶	بیماری سے نجات	۱۷۴
۱۴۷	اہلیہ کی وفاداری	۱۷۵
۱۴۸	**حضرت یونس علیہ السلام**	۱۷۶
۱۴۹	نینوا میں بعثت	۱۷۶
۱۵۰	قوم کی سرکشی اور حضرت یونس علیہ السلام کی پیش گوئی	۱۷۶
۱۵۱	حضرت یونس علیہ السلام کی نینوا سے روانگی	۱۷۸
۱۵۲	وطن کی طرف واپسی	۱۷۸
۱۵۳	**حضرت عزیر علیہ السلام**	۱۷۹
۱۵۴	حضرت عزیر اور قرآن حکیم	۱۷۹
۱۵۵	سوسال کے بعد زندہ کیے گئے	۱۸۰
۱۵۶	یروشلم کی طرف کوچ	۱۸۲

۱۵۷	**حضرت زکریا علیہ السلام**	۱۸۳
۱۵۸	ایک عظیم پیغمبر	۱۸۳
۱۵۹	حضرت مریم کے مربی اور اتالیق	۱۸۴
۱۶۰	بیٹے کی پیدائش	۱۸۵
۱۶۱	باپ بیٹے دونوں نبی	۱۸۶
۱۶۲	**حضرت یحیٰ علیہ السلام**	۱۸۷
۱۶۳	حضرت مریم کے خالہ زاد بھائی	۱۸۷
۱۶۴	قرآن کریم میں ذکر	۱۸۸
۱۶۵	حضرت یحیٰ علیہ السلام کی دعوتِ دین	۱۸۹
۱۶۶	پیغمبر کا قتل	۱۹۰
۱۶۷	**حضرت لقمان علیہ السلام**	۱۹۱
۱۶۸	نبی تھے یا بزرگ	۱۹۱
۱۶۹	حافظ ابن کثیرؒ کی رائے	۱۹۲
۱۷۰	قرآن کریم میں حضرت لقمان کا تذکرہ	۱۹۳
۱۷۱	پندِ لقمانی	۱۹۴
۱۷۲	**اصحاب السبت**	۱۹۵
۷۳	سنیچر کے دن والے	۱۹۵
۱۷۴	قوم کے نیک لوگ	۱۹۷
۱۷۵	سرکشی اور تمرد کا انجام	۱۹۷
۱۷۶	مسخِ صورت	۱۹۸
۱۷۷	**سکندر ذوالقرنینؒ**	۱۹۹
۱۷۸	چار بڑے بادشاہوں میں سے ایک	۱۹۹
۱۷۹	ذوالقرنین کون تھے	۲۰۰

۱۸۰	قریش کے سوالات	۲۰۱
۱۸۱	ذوالقرنین کی امتیازی شخصیت	۲۰۲
۱۸۲	ذوالقرنین کی وجہ تسمیہ	۲۰۳
۱۸۳	ذوالقرنین کا عدل وانصاف	۲۰۴
۱۸۴	مغرب سے مشرق کی طرف	۲۰۵
۱۸۵	سد سکندری کی تعمیر	۲۰۶
۱۸۶	دیوار کے جغرافیائی پہلو	۲۰۸
۱۸۷	**یاجوج اور ماجوج**	۲۱۰
۱۸۸	یاجوج ماجوج کون ہیں	۲۱۰
۱۸۹	روایات میں یاجوج ماجوج کا کردار	۲۱۱
۱۹۰	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول	۲۱۲
۱۹۱	کچھ اور روایات	۲۱۴
۱۹۲	واقعات کی ترتیب	۲۱۶
۱۹۳	**اصحابِ کہف**	۲۱۸
۱۹۴	اصحاب کہف کا قصہ	۲۱۸
۱۹۵	اصحاب کہف کون تھے	۲۱۹
۱۹۶	قصے کا تاریخی پہلو	۲۱۹
۱۹۷	کہف کہاں واقع ہے	۲۲۰
۱۹۸	اصحاب کہف کی جرأت ایمانی	۲۲۲
۱۹۹	اصحاب کہف کا مذہب	۲۲۳
۲۰۰	عقیدۂ ایمان کی سلامتی مقدم ہے	۲۲۵
۲۰۱	اصحابِ کہف کی طویل نیند سے بیداری	۲۲۷
۲۰۲	اہل شہر کی حیرت	۲۲۸

۲۰۳	**قومِ سبا اور سیل عرم**	۲۲۹
۲۰۴	قوم سبا کا محل وقوع	۲۲۹
۲۰۵	قوم سبا کا تعارف	۲۳۰
۲۰۶	قوم سبا کی معاشی اور تمدنی ترقی	۲۳۱
۲۰۷	سدّ مآرب	۲۳۲
۲۰۸	باغات، نہریں اور چشمے	۲۳۳
۲۰۹	نعمتوں کی قدر دانی اور جذبۂ شکر گزاری	۲۳۴
۲۱۰	پانی کا سیلاب	۲۳۵
۲۱۱	اہلِ سبا کو حاصل ایک اور نعمت	۲۳۶
۲۱۲	**اصحاب الاخدود**	۲۳۷
۲۱۳	اہل ایمان کی آزمائش	۲۳۷
۲۱۴	بادشاہ وقت درپئے آزار	۲۳۸
۲۱۵	واقعات کی منظر کشی	۲۴۰
۲۱۶	**اصحاب الفیل**	۲۴۰
۲۱۷	ہاتھی والوں کا قصہ	۲۴۰
۲۱۸	واقعۂ فیل کا پس منظر	۲۴۱
۲۱۹	ابرہہ اور یمن میں کلیسا کی تعمیر	۲۴۳
۲۲۰	خانۂ کعبہ کو شہید کرنے کا منصوبہ	۲۴۴
۲۲۱	عالم عرب میں بے چینی	۲۴۴
۲۲۲	حضرت عبدالمطلب اور ابرہہ کی ملاقات	۲۴۶
۲۲۳	حضرت عبدالمطلب کی دُعا	۲۴۷
۲۲۴	ابرہہ خانۂ کعبہ کی طرف بڑھا	۲۴۸
۲۲۵	ابابیل پرندوں کے غول	۲۴۸

۲۲۶	قرآن کا معجزانہ اسلوب بیان	۲۵۰
۲۲۷	حقیقت واقعہ کا انکار	۲۵۰
۲۲۸	**حضرت عیسیٰ علیہ السلام**	۲۵۱
۲۲۹	اولوالعزم پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر	۲۵۱
۲۳۰	حضرت مریم علیہا السلام کے احوال	۲۵۲
۲۳۱	حضرت مریم علیہا السلام بیت المقدس میں	۲۵۴
۲۳۲	بیت المقدس میں حضرت مریم کی پرورش	۲۵۴
۲۳۳	کیا حضرت مریم نبی تھیں	۲۵۵
۲۳۴	صدیقہ کا مفہوم کیا ہے	۲۵۷
۲۳۵	اصل موضوع کی طرف واپسی	۲۵۸
۲۳۶	نویدِ مسیح	۲۵۸
۲۳۷	حضرت مریم کی گزارش	۲۵۹
۲۳۸	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش	۲۶۰
۲۳۹	نومولود کو گویائی ملی	۲۶۲
۲۴۰	عیسائیوں کے وفد کی آمد	۲۶۲
۲۴۱	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا حلیۂ مبارک	۲۶۳
۲۴۲	بنی اسرائیل کی دینی اور معاشرتی صورت حال	۲۶۴
۲۴۳	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت	۲۶۵
۲۴۴	معجزاتِ مسیح	۲۶۶
۲۴۵	بیماروں کی شفا	۲۶۷
۲۴۶	مُردوں کی زندگی	۲۶۷
۲۴۷	بنی اسرائیل کا انکار	۲۶۸
۲۴۸	منکرین نبوت	۲۶۹

۲۴۹	کچھ سعید روحیں	۲۶۹
۲۵۰	اللہ رب العزت کے پانچ وعدے	۲۷۱
۲۵۱	آسمان پر اٹھائے جانے کا مسئلہ	۲۷۳
۲۵۲	قرآن کریم میں نزول عیسیٰ کا ذکر	۲۷۳
۲۵۳	ایک آیت کریمہ کی تفسیر	۲۷۴
۲۵۴	ایک اور آیت سے استدلال	۲۷۷
۲۵۵	نزول عیسیٰ علیہ السلام کی حکمت ومصلحت	۲۷۷
۲۵۶	قرآن کریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تفصیلی ذکر کیوں ہے؟	۲۷۹
۲۵۷	نزول عیسیٰ کے سلسلے میں کچھ روایات	۲۸۱
۲۵۸	بعثت انبیاء کا مقصد	۲۸۴
۲۵۹	یہودیوں کی سرشت میں بغاوت	۲۸۴
۲۶۰	بنی اسرائیل کے مختلف گمراہ طبقات	۲۸۵
۲۶۱	حواریین کی جماعت	۲۸۷
۲۶۲	آسمان سے خوان نعمت کے نزول کا مطالبہ	۲۸۹
۲۶۳	خوان نعمت کا نزول	۲۸۹
۲۶۴	یہود کا گمراہ کن عقیدہ	۲۹۲
۲۶۵	عیسائیوں کا عقیدۂ تثلیث	۲۹۲
۲۶۶	قرآن کریم میں عقیدۂ تثلیث کی تردید	۲۹۳

☆☆☆

پیشِ لفظ

پیشِ نظر کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے قرآن کریم میں بیان کئے گئے قصص وواقعات پر مشتمل ہے، تین سال پہلے روزنامہ ''انقلاب'' کے ایڈیٹر جناب شاہد لطیف صاحب (بمبئی) کی فرمائش پر میں نے قصص القرآن کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا، یہ مضامین رمضان المبارک کے مہینے میں تین سال تک لگاتار چھپتے رہے، دل چاہا کہ ان کو کتابی شکل میں شائع کردیا جائے، یہ کتاب اسی خواہش کی تکمیل کی ادنیٰ سی کوشش ہے۔

قرآن کریم کے ہر پہلو پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، لکھا جارہا ہے اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا، قصصِ قرآن کا موضوع بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے، اُردو زبان میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کی کتاب ''قصص القرآن'' اسی سلسلے کی نادرۂ روزگار کتاب ہے، جو ہندوپاک میں برابر چھپ رہی ہے اور شوق وذوق کے ساتھ پڑھی جاتی ہے، کتاب نہایت محققانہ ہے، اس کا اسلوب بیان بھی انتہائی دل نشیں ہے، کتاب میں تمام واقعات تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، مصنف نے کوئی گوشہ تشنۂ گفتگو نہیں چھوڑا، اس کے بعد بھی کچھ کتابیں لکھی گئیں، میرے پیشِ نظر یہ تمام کتابیں ہیں، مگر میں نے اختصار کے ساتھ جامعیت کے پہلو کو زیادہ سامنے رکھا ہے، کوشش کی ہے کہ قصے کے جو ضروری پہلو ہیں وہ سب سامنے آجائیں، جو کچھ لکھا جائے وہ مستند ہو، رطب ویابس سے گریز ہو، سادہ اور عام فہم اندازِ بیان ہو تاکہ کم پڑھے لکھے لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں، میں اپنی اس کوشش میں کس حد تک کامیاب رہا ہوں اس کا فیصلہ تو پڑھنے والے ہی کریں گے، خودستائی سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

قرآن کریم میں واقعات مرتب شکل میں بیان نہیں کئے گئے بل کہ جہاں جیسی ضرورت سمجھی گئی وہاں واقعہ کا کوئی حصہ بیان کردیا گیا، کسی جگہ اس کا دوسرا جزء ذکر کردیا گیا، صرف حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ تفصیلی ہے، مرتب بھی ہے، اور پوری ایک

سورت میں یہ قصہ بیان کیا گیا ہے، مگر اس کا اسلوب بھی ہمارے آپ کے قصوں کی طرح نہیں ہے بل کہ جو بات جہاں اور جتنی ضروری سمجھی گئی وہ بیان کردی گئی اور جو بات غیر ضروری سمجھی گئی اس کو نظر انداز کر دیا گیا۔

حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ قدس سرہ نے اپنی کتاب "الفوز الکبیر" میں قرآن کریم کے مضامین کو پانچ ابواب پر تقسیم کیا ہے، جن میں سے ایک التذکیر بایام اللہ ہے، ایام اللہ سے مراد وہ واقعات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرماں بردار بندوں کو انعام دینے اور نافرمان بندوں کو سزا دینے کے ضمن میں بیان فرمائے ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ نے ان واقعات کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ "ان قصوں میں سے وہی باتیں ذکر کی گئی ہیں جو ان سے مقصود ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان قصوں میں سے ایسی جامع باتوں کا انتخاب فرمایا ہے جو تذکیر و موعظت میں نفع بخش ہیں"۔ اس لیے قرآن کریم کے واقعات کو عام قصوں کی طرح محض تفریح طبع کے لیے نہ پڑھا جائے بل کہ ان کے ضمن میں جو حکمتیں اور نصیحتیں پوشیدہ ہیں ان پر نظر رکھی جائے، واقعات کے جو تذکیری پہلو ہیں ان پر غور کیا جائے، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ فرماتے ہیں: "قرآن پاک ان تاریخی واقعات کو محض اس لیے نہیں بیان کرتا کہ یہ وہ واقعات ہیں، جن کا ایک تاریخ مین درج ہونا ضروری ہے بل کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ ان واقعات سے پیدا شدہ نتائج کو انسانی رشد و ہدایت کے لیے نصیحت و عبرت بنائے اور انسانی عقل و جذبات سے اپیل کرے کہ وہ آئین و قوانینِ فطرت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ان تاریخی نتائج سے سبق حاصل کریں"۔ (ماخوذ از قصص القرآن)۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ اس کتاب کو تمام پڑھنے والوں کے حق میں مقبول اور نافع اور مصنف کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین۔ وما توفیقی إلا باللہ

ندیم الواجدی

۱/محرم الحرام ۱۴۴۱ھ

۱/ستمبر ۲۰۱۹ء

حضرت آدم علیہ السلام

قرآن کریم میں حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر:

حضرت آدم علیہ السلام سب سے پہلے انسان ہیں، تمام انسانوں کے باپ ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے سب سے پہلے نبی ہیں، قرآن کریم میں آپ کا ذکر پچیس مرتبہ آیا ہے، قرآن کریم قصوں کہانیوں کی کتاب نہیں ہے بلکہ یہ کتاب ہدایت ہے، اور اس سے مقصود نسل انسانی کی اصلاح ہے، اس کتاب میں کہیں کہیں پچھلی قوموں کا اور گذشتہ انبیاء کرام کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور ان کے واقعات بھی بیان کئے گئے ہیں، اس سے بھی ہدایت اور عبرت ہی مقصود ہے، اگر ہم ان تمام آیات کو ایک جگہ جمع کریں جن میں حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر کیا گیا ہے، تو ان کا قصہ کچھ اس طرح ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو پیدا کرنا چاہا تو فرشتوں کو اپنے ارادے سے آگاہ فرمایا کہ میں ایک انسان کی تخلیق کرنا چاہتا ہوں جو زمین پر میرا نائب اور خلیفہ ہوگا، فرشتوں نے عرض کیا کہ اگر انسان کی پیدائش کا مقصد یہ ہے کہ وہ دن رات تیری پاکی بڑائی اور کبریائی بیان کرے تو اس کے لیے ہم کافی ہیں، ہر وقت تیری حمد و ثنا بیان کرتے ہیں اور تیرے گن گاتے ہیں، اور تیرا ہر حکم بے چون و چرا بجالاتے ہیں، ہمیں تو اس ہستی سے فتنہ و فساد کی بو آتی ہے، ایسا نہ ہو کہ وہ دنیا میں جا کر فساد پھیلائے اور خوں ریزی کرے؟ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے اس سوال کا براہ راست کوئی جواب نہیں دیا، بلکہ پہلے اپنے ارادے کے مطابق مٹی سے انسان کی تخلیق کی، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ. (۱) ''اور ہم نے بنایا آدمی کو کھنکھناتے سنسنے گارے سے''۔ روایات میں ہے کہ جب اللہ رب العزت نے حضرت آدم کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو حضرت عزرائیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ زمین سے ایک مٹھی مٹی لائیں، چناں چہ حضرت عزرائیل زمین پر اترے اور انھوں

(۱) الحجر:۲۶۔

نے ایک مٹھی مٹی کی بھری، روئے زمین کی اوپری پرت چھلکے کی طرح اتر کر ان کی مٹھی میں سماگئی، اس میں ہر رنگ اور ہر ذائقے اور ہر کیفیت کی مٹی تھی، یعنی سفید وسیاہ، لال پیلی تلخ وشیریں، نرم وسخت وغیرہ ہر طرح کی مٹی ان کے ہاتھ میں آگئی۔(۱) جب حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق عمل میں میں آگئی تو انھیں تمام اسماء کا علم عطا کیا گیا، پھر انھیں فرشتوں کے سامنے لایا گیا اور ان سے پوچھا گیا کیا تم ان چیزوں کا علم رکھتے ہو جو یہ انسان رکھتا ہے؟ فرشتوں نے اپنی عاجزی کا اظہار کیا، اس طرح فرشتوں کو ان کے اس سوال کا جواب مل گیا کہ اس خاکی ہستی کی تخلیق کے پیچھے کیا حکمت ہے؟ تب فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں، یہ حکم سنتے ہی تمام فرشتے سجدہ ریز ہو گئے، صرف ابلیس کھڑا رہا، اس نے یہ کہہ کر سجدہ کرنے سے انکار کردیا کہ: أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَّخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ. (۲) ”میں اس سے برتر ہوں، تونے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے پیدا کیا ہے“۔ گویا اسے یہ غرور ہوا کہ میری تخلیق آگ سے ہوئی ہے جس کی لپٹیں اوپر کی طرف اٹھتی ہیں، اور آدم کو مٹی سے بنایا گیا ہے جس کی خاصیت پستی ہے، وہ پیروں سے روندی جاتی ہے، ابلیس کو اس کے تکبر کی سزا ملی، حکم ہوا کہ یہاں سے دُور ہو جا، تو اس سرکشی کی وجہ سے دائمی عذاب کا مستحق ہے۔

دنیا میں تشریف آوری:

ایک مدت تک حضرت آدم علیہ السلام تنہا زندگی بسر کرتے رہے، تمام نعمتوں اور راحتوں کے باوجود انھیں ایک طرح کی کمی محسوس ہوتی تھی، وہ چاہتے تھے کہ اس وسیع وعریض جنت میں کوئی تو ان جیسا ہو، ان کا ہمدم وہمراز ہو، اپنی تکوینی مصلحت کے تحت اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے حضرت حواء کو پیدا کیا جو ہم سب کی ماں ہیں، دونوں کو ہر طرح کی نعمتیں اور راحتیں میسّر تھیں، انھیں اجازت تھی کہ وہ جنت میں جہاں دل چاہے جائیں اور جو جی چاہے کھائیں، صرف ایک درخت کو متعین کر کے بتلا دیا گیا کہ اس کے قریب بھی مت جانا، یہاں شیطان لعین نے انتقام لینے کا منصوبہ بنایا، انسان کو بہکانے اور ورغلانے کی اجازت وہ پہلے ہی حاصل کر چکا تھا جو اسے روز قیامت

(۱) تذکرۃ الانبیاء، ص:۴۸۔ (۲) اعراف:۱۲۔

تک کے لیے دیدی گئی تھی، شیطان نے ان دونوں میاں بیوی کے دلوں میں یہ وسوسہ ڈالا کہ جس درخت سے تم کو روکا اور منع کیا جارہا ہے وہ شجرۃ الخلد (دائمی زندگی دینے والا درخت) ہے، اس کا پھل کھالو گے تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنت میں رہو گے، اس وسوسے کا دل میں آنا تھا کہ بہ تقاضائے بشریت یہ دونوں اس شجر ممنوعہ کے قریب چلے گئے اور اس کا پھل کھالیا، اس کا پھل کھانا تھا کہ بشری لوازم ظاہر ہونے لگے، سب سے پہلے تو وہ لباسِ جنت سے محروم ہوگئے، دونوں نے دوڑ کر اپنے جسموں کو درخت کے پتوں سے ڈھانپا، حضرت آدم علیہ السلام سمجھ چکے تھے کہ ان کے ازلی دشمن شیطان نے ان کو ابتلاء اور آزمائش میں ڈال دیا ہے، اشک ندامت بہانے اور عفو ومغفرت کی دعا مانگنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا، بالآخر رحمت حق کو جوش آیا، اور توبہ قبول کر لی گئی، مگر ساتھ ہی یہ حکم بھی ہوا کہ اب تم لوگوں کا جنت میں رہنا ممکن نہیں ہے، اب تمہیں میرا نائب اور خلیفہ بن کر زمین پر جانا ہے، اور جب تک میں چاہوں وہاں قیام کرنا ہے، تم اور تمہاری نسل ایک مقررہ مدت تک زمین پر قیام کر کے خلافت الٰہیہ کے فرائض ادا کرے گی، تمہارا دشمن ابلیس بھی تمہارے ساتھ دنیا میں بھیجا جارہا ہے وہ تمہاری اولاد در اولاد کو بہکائے گا، اور بہکاتا رہے گا، جو لوگ اس کے ورغلانے میں نہیں آئیں گے، اور اس کی تمام تر کوششوں کے باوجود میری اطاعت اور میری عبادت میں اپنی زندگی بسر کریں گے ان کے لیے یہ جنت تیار رہے گی وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس میں رہیں گے اور اس کی نعمتوں سے بہرہ ور ہوں گے، البتہ جو لوگ ابلیس کے راستے پر چلیں گے، سرکشی کریں گے، میری نافرمانی کی راہ اختیار کریں گے ان کے لیے اس جنت کے دروازے بند ہیں، اس وقت سے انسان اور شیطان کی دشمنی کا سفر جاری ہے اور یہ سفر قیامت تک جاری رہے گا، بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام دنیا میں تشریف لانے کے بعد نو سو ساٹھ برس تک زندہ رہے، وفات کے بعد کہاں دفن ہوئے اس کے بارے میں مختلف اقوال ملتے ہیں، کوئی کہتا ہے کہ جبل ابوقبیس کے مغارۃ الکنوز میں مدفون ہیں، کوئی مسجد خیف میں بتلاتا ہے، کوئی کہتا ہے کہ آپ کی قبر مبارک سری لنکا میں ہے، کسی کی رائے ہے کہ آپ عراق میں کسی جگہ دفن ہیں، حقیقت حال اللہ ہی کو معلوم ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام

حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت:

حضرت نوح علیہ السلام اللہ کے نبی بھی ہیں اور رسول بھی، دنیا میں سب سے پہلے جس شخصیت کو اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول بنا کر بھیجا وہ حضرت نوح ہیں، قرآن کریم میں آپ کا ذکر اٹھائیس سورتوں میں تینتالیس جگہ آیا ہے، ان کو آدم ثانی اور ثانی ابوالبشر یعنی انسانوں کا دوسرا باپ بھی کہا جاتا ہے، انھوں نے ساڑھے نوسو برس کی لمبی عمر پائی اور یہ پوری مدت اپنی قوم کو ہدایت کی طرف بلاتے ہوئے گزاری، جس وقت آپ کی پیدائش ہوئی دنیا میں حضرت آدم اور حضرت حواء علیہما السلام کی اولاد در اولاد کا سلسلہ وسیع ہو چکا تھا، لیکن یہ لوگ اپنے حقیقی خالق اور رب کو بھولتے جا رہے تھے، اور آہستہ آہستہ بتوں کی پوجا کرنے لگے تھے، کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں مٹی اور لکڑی کے بنے ہوئے بت نہ رکھے ہوئے ہوں، لوگ ان ہی کے سامنے سر جھکاتے ان ہی کو سجدہ کرتے اور ان ہی سے اپنی حاجتیں مانگتے، ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو اپنا پیغمبر بنا کر بھیجا، انھوں نے بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہِ حق کی طرف بُلایا، قوم نے ان کی ایک نہ سنی بلکہ اُلٹا ان کا مذاق اڑایا، قوم کے رؤساء نخوت وحقارت سے کہتے تھے بھلا تم پیغمبر کیسے بن سکتے ہو، تم میں کون سے سُرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں، تم نہ مال و دولت میں ہم سے بڑھے ہوئے ہو اور نہ تمہارے پاس کوئی رتبہ اور عہدہ ہے، اللہ اگر چاہتا تو وہ کسی فرشتے کو بھی رسول بنا کر ہمارے پاس بھیج سکتا تھا، تم تو ہمارے مقتدا اور پیشوا بننے کے ہرگز اہل نہیں ہو، پھر جو لوگ تمہاری اتباع کر رہے ہیں وہ بھی معاشرے کے پست اور کم تر طبقے کے لوگ ہیں، انھیں نہ سمجھ ہے نہ شعور ہے، نہ ان کی اپنی کوئی رائے ہے، ان کے رہتے ہوئے تو ہم تمہارے گروہ میں کسی بھی طرح شامل نہیں ہو سکتے، حضرت نوح علیہ السلام فرماتے کہ یہ لوگ غریب اور کم زور ضرور ہیں لیکن انھوں نے اللہ کا دین قبول کیا ہے، اور وہ تمہاری طرح بتوں کی پرستش نہیں کرتے، بھلا میں ان کو کس طرح چھوڑ سکتا ہوں، اگر تم ہمارے ساتھ آنا چاہو تو آ جاؤ ورنہ ایک دن تم پر اللہ کا

عذاب آئے گا اور تم میں سے کوئی شخص اس عذاب سے بچ نہیں پائے گا، یہ کُل اسّی لوگ تھے جنھوں نے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت پر لبیک کہا تھا، باقی پوری قوم سرکشی اور نا فرمانی پر آمادہ تھی، اور کھلے بندوں اللہ سے روگردانی کر رہی تھی، اللہ کے پیغمبر کو ستا رہی تھی ان کا مذاق اڑا رہی تھی، جب پانی سر سے اونچا ہوگیا اور ان گمراہ لوگوں کی ہدایت کی کوئی امید باقی نہیں بچی تب حضرت نوح علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا: رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا إِنَّكَ إِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا.(۱) ''اے پروردگار! تو کافروں میں سے کسی کو بھی زمین پر باقی نہ چھوڑ، اگر تو نے ان کو یونہی چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو بھی گمراہ کریں گے اور ان کی نسل بھی انہی کی طرح نافرمان پیدا ہوگی''۔

قوم نوح پر عذاب خداوندی:

اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی یہ دُعا قبول فرمائی، ویسے بھی قوم کے نافرمان لوگ بہ طور تمسخر حضرت نوح علیہ السلام سے کہا کرتے تھے کہ اپنے ربّ سے کہہ کر عذاب لے آوٴ، (۲) حضرت نوح علیہ السلام جواب میں فرماتے: قَالَ إِنَّمَا يَأْتِيكُمْ بِهِ اللَّهُ إِنْ شَاءَ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ.(۳) ''بلاشبہ اللہ چاہے گا تو وہ عذاب بھی لے آئے گا تم اس کو تھکا دینے والے نہیں ہو''۔ جب ان کے دلوں پر مہر لگ چکی اور یہ بات طے ہوگئی کہ اب ان اسّی لوگوں کے علاوہ کوئی ہدایت پانے والا، اور پیغمبر کی دعوت قبول کرنے والا نہیں ہے، تب اللہ رب العزت نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ تم ایک کشتی تیار کرو، تعمیل حکم میں حضرت نوح علیہ السلام کشتی بنانے میں لگ گئے، قوم کے بد بخت لوگ ان کو کشتی بناتے ہوئے دیکھتے اور ہنستے ہوئے گزر جاتے، بعض بد باطن لوگ تو سر عام ان کا مذاق بھی اڑاتے، کوئی کہتا اچھا تو ہم پر عذاب آنے والا ہے، آپ اس کشتی پر بیٹھ کر محفوظ رہیں گے اور ہم غرق ہو جائیں گے، کوئی کشتی سازی کے اس عمل کو احمقانہ خیال تصور کرتا، ادھر سمندر سے اٹھنے والے بادل اور زمین سے ابلنے والے چشمے حکم الٰہی کے منتظر تھے کہ کب اللہ کا حکم ہو اور کب وہ اس دنیا کو جل تھل کریں، یہاں تک کہ کوئی بستی، کوئی گھر ایسا باقی نہ بچے جو

(۱) نوح: ۲۶-۲۷۔ (۲) ہود: ۳۲۔ (۳) ہود: ۳۳۔

اس میں غرق نہ ہوجائے، جب کشتی تیار ہوگئی تو حکم ہوا کہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ اور راستی افراد کے اس مختصر نا فلے کے ساتھ جو آپ کی دعوت قبول کر چکے ہیں اس کشتی پر سوار ہوجاؤ، جب یہ لوگ کشتی پر سوار ہوگئے تو آسمان کو حکم ہوا کہ وہ پانی برسادے اور زمین کو حکم ہوا کہ وہ ابل پڑے، اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے حد نظر تک پانی ہی پانی پھیل گیا، حضرت نوح علیہ السلام کا ایک بیٹا کنعان جو آپ کے دین پر نہیں تھا کشتی پر سوار نہیں ہوا، شفقت پدری کی وجہ سے حضرت نوح علیہ السلام چاہتے تھے کہ وہ بھی کشتی میں آجائے، وہ پانی میں ڈوبنے لگا تو حضرت نوح علیہ السلام نے اسے آواز بھی دی کہ اب بھی آجاؤ تا کہ خدا کے عذاب سے محفوظ رہ سکو، اس نے تکبر سے جواب دیا تم لوگ جاؤ میں کسی پہاڑ پر چڑھ کر اپنی جان بچالوں گا، اس سے مایوس ہوکر انھوں نے انتہائی لجاجت اور عاجزی کے ساتھ بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ آپ نے میرے اہل وعیال کی سلامتی کا وعدہ فرمایا تھا میرا بیٹا ڈوبنے والا ہے: إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ. (۱) ''میرا بیٹا میرے اہل میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے'' جواب آیا: قَالَ يَا نُوحُ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ. (۲) ''اے نوح یہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے، یہ تو بدعمل شخص ہے، جس چیز کا تجھے علم نہ ہو اس کا سوال مجھ سے مت کرنا'' ۔تب حضرت نوح علیہ السلام اللہ کے فیصلے پر راضی ہوگئے، کشتی روانہ ہوئی اور جودی پہاڑ پر جاکر ٹھہر گئی، قرآن کریم میں ہے: وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ وَقِيلَ بُعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ. (۳) ''اور حکم پورا ہوا اور کشتی جودی پہاڑ پر جاکر ٹھہر گئی اور اعلان کردیا گیا کہ قوم ظالمین کے لیے ہلاکت ہے''۔ جودی پہاڑ کہاں واقع ہے، اس کے محل وقوع کے بارے میں اختلاف ہے، بعض مفسرین اور مؤرخین کا خیال ہے کہ یہ پہاڑی بحیرۂ مردار (بحر لوط) کے مغرب میں اسرائیل کے اندر واقع ہے، معجم البلدان میں لکھا ہے کہ یہ پہاڑ دجلہ سے مشرقی جانب جزیرۂ ابن عمر میں ہے اور یہ جگہ عراق کے شہر موصل کے مضافات میں آرمینیا کی سرحد پر واقع ہے، یہ ایک کوہستانی سلسلہ ہے جس کے ایک پہاڑ کا نام جودی ہے اس کو اراطاط بھی کہتے ہیں، توراۃ میں کشتی ٹھہرنے کا مقام کوہِ اراطاط ہی بتلایا

(۱) ہود: ۴۵۔ (۲) ہود: ۴۶۔ (۳) ہود: ۴۴۔

گیا ہے، عراق کی بہت سی جگہوں پر کشتی نوح کے ٹکڑے دستیاب ہوئے ہیں جن کو تبرک کے طور پر احتیاط کے ساتھ رکھا گیا ہے، بعض روایات میں ہے کہ جبرئیل امین نے بذریعہ وحی الٰہی حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی بنانے کی تعلیم دی، انھوں نے سال کی لکڑی سے یہ کشتی تیار کی، بعض تاریخی روایات میں اس کی پیمائش یہ بتلائی گئی ہے کہ یہ تین سو گز لمبی، پچاس گز چوڑی، تیس گز اونچی اور تین منزلہ کشتی تھی، جس میں دروازے اور روشن دان بھی تھے اس طرح جہاز سازی کی صنعت کا آغاز حضرت نوح علیہ السلام سے ہوا بعد میں اس کے اندر ترقیات ہوئیں جن کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے، تاریخی روایات میں یہ بھی ہے کہ اس کشتی میں انسانوں کے علاوہ ہر طرح کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا بھی تھا، بعد میں جو نسلیں وجود میں آئیں وہ کشتی نوح کے انھی مسافروں کی نسلیں ہیں۔(۱) حضرت نوح کا مزار آزربائیجان میں ہے جو آج تک مرجع عام وخاص بنا ہوا ہے۔

حضرت ادریس علیہ السلام

قرآن کریم میں حضرت ادریس علیہ السلام کا مختصر تذکرہ:

یہ بھی اللہ تعالیٰ کے اولوالعزم پیغمبروں میں سے ایک ہیں، قرآن کریم میں ان کا ذکر دو جگہ آیا ہے، ایک تو سورۂ مریم کی آیت: ۵۵ میں، اس میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنا سچا نبی کہا ہے اور ان کی رفعت شان کا ذکر فرمایا ہے، دوسرے سورۂ الانبیاء کی آیت: ۸۵ میں، اس آیت میں حضرت ادریس علیہ السلام کا ذکر حضرت اسماعیل اور حضرت ذوالکفل کے ساتھ فرمایا اور ان تینوں ہستیوں کو اہل صبر کے زمرے میں شمار فرمایا، قرآن کریم میں اس سے زیادہ کوئی ذکر نہیں ملتا، البتہ حدیث کی کتابوں میں کچھ تذکرہ ملتا ہے، بائبل وغیرہ میں ان کا تفصیلی ذکر موجود ہے لیکن اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

بابل؛ مرکز دعوت:

مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ نے اپنی کتاب ''قصص القرآن'' کی پہلی جلد میں ان

(۱) تفسیر معارف القرآن: ۶۲۰/۴۔

پر تفصیل سے لکھا ہے، مگر وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ ان کے حالات میں جو کچھ بھی ہے وہ اسرائیلی روایات سے ماخوذ ہے، پھر بھی انھوں نے تحقیق کے بعد جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام کی پیدائش بابل میں ہوئی، انھوں نے وہیں نشو ونما پائی، حضرت شیث بن آدم علیہما السلام سے علم حاصل کیا، سن شعور کو پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب نبوت سے سرفراز فرمایا، نبوت ملنے کے بعد انھوں نے اپنی قوم میں دعوت وتبلیغ کا سلسلہ شروع کیا، کچھ لوگوں نے ان کی بات سنی اور ان پر ایمان لانے کا شرف حاصل کیا، اکثر لوگ نافرمان ہی رہے، یہ وہ لوگ تھے جو حضرت آدم اور حضرت شیث علیہما السلام کی لائی ہوئی شریعتوں کے بھی منکر تھے، اور اب حضرت ادریس علیہ السلام کے لائے ہوئے دین کو بھی نخوت اور تکبر کے ساتھ ٹھکرا رہے تھے، قوم کی بدسلوکی سے عاجز آکر اللہ کے اس عظیم پیغمبر نے اپنے وطن بابل سے ہجرت کرنے کا ارادہ کیا، جو لوگ ان کے راستے پر چل رہے تھے، ان کا دل ہجرت پر آمادہ نہ تھا، کیوں کہ بابل اس وقت کے لحاظ سے نہایت ترقی یافتہ شہر تھا، اس کے باغوں، نہروں اور چشموں کی ہر طرف دھوم تھی، لوگ بابل میں آکر رہنے کی تمنا کرتے تھے اور یہاں ان کو بابل چھوڑ کر جانا پڑ رہا تھا، اللہ کے رسول نے انھیں تسلی دی، اور یقین دلایا کہ اللہ تمھیں اس سے بہتر جگہ عطا فرمائیں گے۔

مصر کی طرف ہجرت:

اس طرح اللہ پر ایمان رکھنے والوں کا یہ قافلہ اپنے ہم وطنوں کے ظلم وستم سے عاجز آکر مصر کی طرف چلا اور دریائے نیل کے کنارے ایک مناسب جگہ پر فروکش ہوگیا، یہاں بھی حضرت ادریس علیہ السلام نے دعوت دین کا سلسلہ جاری رکھا، ان کے زمانے میں بہتر (۷۲) زبانیں بولی اور سمجھی جاتی تھیں، اللہ نے اپنے پیغمبر حضرت ادریس علیہ السلام کو یہ تمام زبانیں سکھلا دی تھیں اور وہ ہر زبان میں دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دیا کرتے تھے، بعض روایات میں ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام دنیا کے پہلے شخص ہیں جن کو قلم عطا کیا گیا، گویا سب سے پہلے روئے زمین پر اگر کسی نے قلم سے کچھ لکھا وہ حضرت ادریس علیہ السلام ہیں، وہ معلم انسان تھے، ان کے نام ادریس کے معنی ہی ہیں درس دینے والا، ان کی کچھ اور

بھی خصوصیات بیان کی جاتی ہیں، مثلاً یہ کہ وہ علم نجوم اور دوسرے علوم فلکیات میں بھی ماہر تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو ستاروں کی گردش اور ان کے اثرات کا علم بھی دیا تھا، ان کو طب کے اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا تھا، اور علم الاعداد اور علم الحساب کی بھی تعلیم دی تھی، وہ علم مدنیت کے بھی ماہر تھے، انھوں نے اپنی صلاحیتوں کو بہ روئے کار لاکر دوسو بستیاں آباد کیں، انھوں نے دنیا کو چار حصوں میں تقسیم کیا، اور ہر حصے کے لیے الگ الگ حاکم مقرر فرمایا جو لوگوں کی دنیوی ضرورتوں کا نگراں بھی تھا اور ان کے دینی امور کی اصلاح کا ذمہ دار بھی، دوسرے پیغمبروں کی طرح حضرت ادریس علیہ السلام کی تعلیم کا خلاصہ بھی یہی تھا کہ انسان اپنے خالق اور رب پر ایمان لائے، اسی کی عبادت کرے، اگر آخرت میں فلاح و نجات کی امید رکھتا ہے تو اچھے عمل کرے، دنیا سے بے رغبتی، عدل و انصاف، عبادت الٰہی کا التزام، ایام بیض کے روزے، جہاد، زکوٰۃ، طہارت نظافت، نشہ آور اشیاء سے پرہیز، کتے اور سور سے اجتناب وغیرہ اُمور حضرت ادریس علیہ السلام کی تعلیمات کا نچوڑ اور خلاصہ ہیں۔

وفات کا حیرت انگیز واقعہ:

بعض روایات میں ہے کہ وفات سے کچھ دیر پہلے اللہ تعالیٰ نے آپ سے فرمایا کہ اس وقت سے جتنی دیر بھی آپ زندہ رہیں گے دنیا میں جتنے لوگ بھی اس دوران نیک عمل کریں گے اس کا آدھا ثواب آپ کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا یہ سن کر آپ بے حد خوش ہوئے، اتنے میں ایک فرشتے نے آکر اطلاع دی کہ حضرت عزائیل آپ کی روح قبض کرنے کے لیے آرہے ہیں، یہ سن کر آپ حیران ہوئے اور ایک فرشتے کے پروں پر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے لیے آسمانوں کی طرف چل پڑے، جب آپ نے پہلا، دوسرا اور تیسرا آسمان پار کرلیا اور چوتھے آسمان پر پہنچے تو وہاں حضرت عزرائیل علیہ السلام موجود تھے، آپ نے اللہ تعالیٰ سے کچھ اور زندگی کی مہلت مانگی جو نہیں دی گئی اور چوتھے آسمان پر ہی آپ کی روح قبض کرلی گئی، بعض حضرات کہتے ہیں کہ وہ چوتھے آسمان پر بقید حیات ہیں، ان کو وفات نہیں دی گئی بلکہ ان کو آسمانوں پر اٹھالیا گیا ہے، حافظ ابن کثیرؒ

نے آیت کریمہ ورفعنٰہ مکانا علیا کی تفسیر میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حضرت ادریس چوتھے آسمان پر اٹھا لیے گئے تھے اور وہیں ان کی وفات ہوئی، حضرت ضحاک رحمہ اللہ کا قول بھی یہی ہے۔(۱)

حضرت ہود علیہ السلام

قوم عاد قوم نوح کی جانشین:

ایسا لگتا ہے کہ شیطان اور انسان کی کش مکش کا سلسلہ روز اوّل سے جاری ہے اور روزِ قیامت تک جاری رہے گا، اولوالعزم انبیاء اور صالحین کی مسلسل کوششوں کے باوجود شیطان غالب رہتا ہے اور حضرت انسان کو صراط مستقیم سے منحرف کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے، حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ ان کی کشتی میں اسّی افراد تھے، یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت پر لبیک کہا تھا، ان اسّی افراد کے علاوہ روئے کائنات کا ہر فرد وبشر اور ہر ذی روح طوفان نوح میں غرق ہوکر ہلاک ہوگیا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان اسّی لوگوں کی نسلوں میں اتنی برکت دی کہ یہ پھر ہزاروں لاکھوں سے تجاوز کرگئے، کچھ روز تو یہ اسی دین حق پر قائم رہے، اس کے بعد ان میں بھی وہی خرابیاں پیدا ہونے لگیں جو تباہی اور بربادی کی طرف لے جاتی ہیں، ان میں بت پرستی عام ہوگئی، لوگ اللہ کو چھوڑ کر غیر اللہ کی پرستش کرنے لگے، قرآن کریم نے ان لوگوں کو قوم عاد کا نام دیا ہے اور بتلایا ہے کہ یہ قوم؛ قوم نوح کی جانشین تھی، دو ہزار سال قبل مسیح یہ قوم ارضِ احقاف میں آباد تھی، یہ جگہ حضر موت کے شمال میں اس طرح واقع ہے کہ اس کے مشرق میں عمان اور شمال میں ربع الخالی ہے، آج یہاں ریتیلے میدانوں کے سوا کچھ نہیں ہے، قوم عاد اپنے ڈیل ڈول اور جسمانی قوت وطاقت اور شکل وصورت کے لحاظ سے پوری دنیا میں ممتاز سمجھی جاتی تھی، افسوس کی بات یہ تھی کہ جس ہستی نے اس قوم کو کائنات میں ساری قوموں پر امتیاز اور فوقیت

(۱) قصص الانبیاء، ابن کثیر، ص:۸۰۔

عطا کی تھی اسی قوم نے اللہ کی ان نعمتوں کی قدر نہ کی اور اس کے بتلائے ہوئے راستے سے بھٹک گئی، حق تو یہ تھا کہ اس قوم کو بلا تاخیر ہلاک کر دینا چاہیے تھا اور اس کو ایسا خوفناک عذاب دینا چاہیے تھا کہ وہ آنے والی نسلوں کے لیے نشان عبرت بنتی، لیکن اللہ رب العزت نے اپنی قدیم سنت کے مطابق پہلے ان کے پاس ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا تا کہ وہ ان کو بتلائے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر صنم پرستی میں مبتلا ہو، یہ غلط ہے، اللہ کے اس رسول کا نام نامی تھا حضرت ہود علیہ السلام جو قوم عاد کی سب سے زیادہ معزز اور سر برآوردہ شاخ خلود سے تعلق رکھتے تھے، انھوں نے اپنی قوم کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی اور بتلایا کہ عبادت کے لائق صرف اللہ ہی ہے جس نے تمھیں ہر طرح کی طاقت وقوت اور شان وشوکت سے نوازا ہے، تم سر سے پاؤں تک اس خالق حقیقی کی نافرمانیوں میں غرق ہو، اللہ اگر چاہتا تو تمھیں اس کی سزا ابھی دے سکتا تھا لیکن وہ تمام تر گناہوں کے باوجود تم پر ابھی تک مہربان ہے، اور تم اس کی مہربانیوں کو ٹھکرا کر اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے معبودان باطلہ کی پرستش میں لگے ہوئے ہو، حضرت ہود علیہ السلام کی رسالت اور ان کی دعوت کا بیان قرآن کریم کی اس آیت میں موجود ہے: وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا مُفْتَرُونَ.(۱) ''اور ہم نے عاد کی طرف ان کے بھائی ہود (کو رسول بنا کر بھیجا) انھوں نے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو! اللہ ہی کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے تم (جو کچھ کہتے ہو) جھوٹ کہتے ہو۔

قوم عاد کی سرکشی اور عذاب الٰہی:

حضرت ہود علیہ السلام کی قوم نے اپنے پیغمبر کی دعوت کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا، جب آپ انھیں مسلسل اور لگاتار سمجھاتے رہے تو قوم کے لوگوں نے اُن سے چھٹکارا پانے کے لیے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہم تمہاری بات کیسے مان لیں، تم نے اپنی حقانیت ثابت کرنے کے لیے ہمیں کوئی معجزہ تو دکھلایا نہیں اور نہ کوئی ایسا ثبوت ہمارے سامنے پیش کیا جس سے پتہ چلے کہ آپ اللہ کے پیغمبر ہیں، آپ کے کہنے پر

(۱) سورۂ ہود: ۵۰۔

ہم اپنے آباؤ اجداد کا دین چھوڑنے والے نہیں ہیں، ہمیں تو ایسا لگتا ہے کہ (نعوذ باللہ) آپ کے دماغ میں فتور پیدا ہو گیا ہے اور آپ کی عقل کہیں چلی گئی ہے کیوں کہ آپ ہمارے معبودوں کو بُرا بھلا کہتے رہتے ہیں، قوم عاد کے کبر و غرور کا عالم یہ تھا کہ وہ اپنی طاقت اور قوت اور مال و دولت کے سامنے کسی کو کچھ نہ سمجھتے تھے، جب بھی انھیں سمجھانے اور عار دلانے کی کوشش کی جاتی وہ اپنی طاقت کے نشے میں چور ہو کر کہتے: "مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً"۔(۱) "دنیا میں ہم سے زیادہ طاقت و قوت والا کون ہے" حضرت ہود علیہ السلام انھیں یاد دلاتے کہ گذشتہ زمانے کی کئی قومیں تم سے زیادہ طاقت ور، اور تم سے زیادہ خوش حال تھیں، لیکن انھوں نے اللہ کی نافرمانی کی اور اس کی سزا بھگتی، آج ان قوموں کا نشان بھی باقی نہیں ہے، اے قوم کے لوگو! مجھے ڈر ہے کہ کہیں تمہیں بھی وہی عذاب اپنی گرفت میں نہ لے لے جس نے پچھلی قوموں کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کیا ہے، تم پر بھی خدا کا قہر اور غضب نازل ہوگا اور تم بھی نیست و نابود ہو جاؤ گے، تمہاری جگہ اللہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور یہ شان و شوکت اسے دیدے گا، حضرت ہود کی یہ دھمکی بھی کام نہ آئی اور ان کی سرکشی و بغاوت کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا، نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے ہوا کے طوفان کی صورت میں ان پر اپنا عذاب مسلط کر دیا، آٹھ دن اور سات راتوں تک عاد کی بستیاں اس طوفان کی زد میں رہیں، ان کے عالیشان اور پختہ مکانات تنکوں کی طرح بکھر گئے، تناور درخت جڑوں سے اکھڑ کر زمین پر گر پڑے، انسان اور جانور ہوا میں اڑ کر آسمان کی فضاؤں میں بلند ہوتے اور اوندھے منہ زمین پر گر کر ہلاک ہو جاتے، اس طرح قوم عاد نے اپنے کئے کا خمیازہ بھگتا، تمام لوگ ہلاک ہو گئے، صرف حضرت ہود علیہ السلام اور ان کے مٹھی بھر متبعین باقی رہ گئے جو عذاب آنے سے پہلے ہی ارض احقاف سے نکل کر حضر موت کی وادیوں میں خیمہ زن ہو چکے تھے، یمن میں یہ جگہ آج بھی آباد ہے، جب کہ قوم عاد کی بستیاں ریت کے میدانوں میں تبدیل ہو کر مقام عبرت بنی ہوئی ہیں، قرآن کریم میں حضرت ہود کا ذکر متعدد سورتوں میں ہے اور نہایت تفصیل کے ساتھ ہے، اللہ تعالیٰ کے اس عظیم پیغمبر نے اپنی عمر طبعی مکمل کر کے حضر موت میں وفات پائی اور وہیں ان کا مزار مبارک ہے۔

(۱) حم سجدہ: ۱۵۔

حضرت صالح علیہ السلام

عاد ثانیہ یا قوم ثمود:

قوم عاد میں سے جو لوگ عذاب الٰہی سے محفوظ رہے بعد کے زمانے میں ان ہی کی نسل پھیلی اور قوم ثمود کہلائی، ان کو عاد ثانیہ اور ثمود ارم بھی کہا جاتا ہے، یہ لوگ حِجر میں آباد تھے، حجاز اور شام کے درمیان جو میدان ہے اس کو قرآن کریم نے الحجر کہا ہے، قوم ثمود کی بستیاں اسی علاقے میں تھیں، اب یہ علاقہ مدائن صالح کہلاتا ہے، ثمود اپنے زمانے کی ترقی یافتہ قوم تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی نعمتوں سے نوازا تھا، ان کی مہارت اور طاقت وقوت کا حال یہ تھا کہ انھوں نے پہاڑوں کو تراش کر رہائشی مکانات بنالئے تھے، آج بھی یہ مکانات موجود ہیں اور لوگ انھیں دیکھنے جاتے ہیں، قرآن کریم میں قوم ثمود کا قصہ متعدد سورتوں میں آیا ہے، یہ قوم بھی اپنی پیش رو قوم عاد کی طرح دولت مند، بہادر اور طاقت ور قوم تھی، سنگ تراشی کے فن میں مہارت رکھتی تھی، حِجر میں انھوں نے پہاڑوں کو کاٹ کر جو مکانات بنائے ہیں انھیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانے میں جب کہ وسائل تعمیر محدود تھے کس طرح پورے پورے پہاڑ تراش کر انھوں نے مکانات بنائے تھے، حِجر کے علاقے میں یہ مکانات دور تک پھیلے ہوئے ہیں اور مرقّع عبرت بنے ہوئے ہیں، قرآن کریم نے سنگ تراشی میں قوم ثمود کی مہارت کا ذکر اس آیت میں کیا ہے۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِى الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا.(۱) ”اور یاد کرو جب تم کو عاد کا جانشین بنادیا اور تم کو زمین میں آباد کردیا جہاں تم زمین میں محل بناتے ہو اور پہاڑوں میں گھر تراشتے ہو“۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم کے لوگ زمین پر بھی بڑے بڑے محلات تعمیر کیا کرتے تھے مگر اب ان محلات کا نام ونشان بھی باقی نہیں ہے، البتہ

(۱) الاعراف:۷۴۔

پہاڑوں میں انھوں نے جو مکانات بنائے تھے وہ ابھی تک موجود ہیں، قوم عاد کی طرح یہ قوم بھی سر سے پاؤں تک بت پرستی میں ڈوبی ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ نے اپنی قدیم سنت کے مطابق اس قوم کی اصلاح کے لیے بھی ان ہی میں سے ایک مرد صالح حضرت صالح علیہ السلام کو نبی بنا کر بھیجا، اپنی قوم کے لیے حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت کا خلاصہ یہ تھا۔ يَاقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ.(۱) ''کہ اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، تمہارے لیے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے''۔ یہ وہی دعوت ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء کرام نے اپنے اپنے زمانے میں دی ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ.(۲) ''اور ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ وہ لوگوں کو یہ ہدایت کرے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور بت پرستی سے بچو''۔ حضرت صالح علیہ السلام نے بھی راہ حق سے بھٹکی ہوئی قوم کے سامنے یہ دعوت پیش کی، مگر قوم نے صاف انکار کر دیا اور عذر وہی کہ ہم تو اپنے آباؤ واجداد کے دین پر ہیں، اور یہ دعوی بھی کہ ہم شان وشوکت والے ہیں، عزت دار ہیں، مال ودولت، اختیار اور حکومت سب کچھ ہمارے پاس ہے، بھلا تم جس کے پاس ان چیزوں میں سے کچھ بھی نہیں ہے اللہ کے رسول کیسے بن سکتے ہو، اللہ کو رسول بھیجنا ہوتا تو وہ ہم میں سے کسی کو بنا کر بھیجتا، اس کے ساتھ ہی انھوں نے حضرت صالح علیہ السلام کو آزمانے کے لیے یہ مطالبہ بھی کر دیا کہ اگر آپ سچے ہیں تو فلاں پہاڑی سے اونٹنی پیدا کر کے دکھلائیں، حضرت صالح علیہ السلام نے پہلے تو ان سے یہ عہد وپیمان لیا کہ اگر تمہارا یہ مطالبہ پورا ہو گیا تو کیا تم مجھ پر ایمان لے آؤ گے، سب نے وعدہ کر لیا، حضرت صالح علیہ السلام نے دو رکعت نماز پڑھی اور یہ دعا کی کہ اے اللہ آپ کے لیے تو مشکل سے مشکل کام بھی دشوار نہیں ہے، میری قوم کے لوگ یہ چاہتے ہیں، آپ ان کا مطالبہ پورا فرما دیں، دعا کرتے ہی پہاڑی کے اندر جنبش ہوئی، ایک چٹان شق ہوئی اور ایک زندہ اونٹنی نکل کر باہر آ گئی، قوم کو یقین ہی نہیں تھا کہ پہاڑوں سے سے بھی کوئی زندہ جانور برآمد ہو سکتا ہے، اور وہ بھی ایسا جانور جیسا وہ چاہتے ہیں، مگر جب اونٹنی میدان میں

(۱) الاعراف: ۷۳۔ (۲) النحل: ۳۶۔

دوڑ۔نے لگی تو ان کو حیرت میں پڑنا ہی تھا، کچھ لوگ تو یہ معجزہ دیکھ کر اسی وقت مسلمان ہو گئے اور کچھ لوگ ایمان لانے نہ لانے میں پس وپیش کرتے رہے، ایسے لوگوں کو قوم کے سرداروں نے بہکا کر ایمان لانے سے روک دیا۔

حضرت صالح علیہ السلام کا معجزہ:

اونٹنی کے نمودار ہونے کے بعد حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ یہ اونٹنی اللہ کی نشانی ہے اس کی حفاظت کرو اگر تم نے اس کو ذرا بھی نقصان پہنچایا تو تم سب اللہ تعالیٰ کی پکڑ میں آسکتے ہو، قوم ثمود جس کنویں سے پانی پیتی تھی اسی کنویں سے یہ اونٹنی بھی پانی پینے لگی، مگر یہ عجیب الخلقت اونٹنی جب کنویں پر پانی پینے کے لیے آتی تو چشمِ زدن میں سارا پانی ختم کر دیتی، اس سے قوم میں بے چینی شروع ہو گئی کہ ہم نے کس مصیبت کو آواز دے لی، یہ تو ہمارے حصّے کا بھی پانی پی جاتی ہے، مگر اب ہو بھی کیا سکتا تھا، قوم کی بے چارگی اور ضرورت کا احساس کر کے حضرت صالح علیہ السلام نے فیصلہ فرمایا کہ ایک روز کنویں کا پانی اونٹنی پئے گی اور ایک روز قوم کے لوگ پئیں گے، قوم کے لوگوں نے یہ فیصلہ بادل ناخواستہ قبول تو کر لیا مگر اندر ہی اندر کڑھتے بھی رہے، بعض سرکش جوان چاہتے تھے کہ یہ اونٹنی ہلاک ہو جائے تاکہ لوگوں کو اس پریشانی سے نجات مل سکے، چناں چہ مصدع اور قذار نامی دونو جوانوں میں سے ایک نے تیر چلا کر اور دوسرے نے اس اونٹنی کے پاؤں کاٹ کر اسے ہلاک کر دیا۔

قوم ثمود کی ہلاکت اور بربادی:

اونٹنی کی ہلاکت کے بعد حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کو یاد دلایا کہ میں تم سے پہلے ہی یہ بات کہہ چکا تھا کہ یہ عام اونٹنی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی نشانی ہے اس کو تکلیف مت پہنچانا، تم نے اسے مار ہی ڈالا، اب تم پر عذاب آنے والا ہے، تمہارے پاس صرف تین دن باقی بچے ہیں، ان تین دنوں میں جو عیش کرنی ہو کر لو: تَمَتَّعُوْا فِیْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَیْرُ مَكْذُوْبٍ.(۱) ”تین دن اپنے گھروں میں عیش کر لو! پھر

(۱) سورۂ ہود: ۶۵۔

عذاب آئے گا اور یہ وعدہ جھوٹا نہیں ہے"۔ تین دن کے بعد قوم ثمود پر عذاب کی علامتیں شروع ہوگئیں، پہلے دن ان کے چہرے زرد پڑ گئے جیسا کہ خوف کی حالت میں رنگ پیلا پڑ جاتا ہے، دوسرے دن ان کے چہروں کا رنگ سرخ ہوگیا، اور تیسرے دن سیاہ، چوتھے روز ان کی بستیوں میں ایک چیخ گونجی اور ایک ہیبت ناک آواز پیدا ہوئی، قرآن کریم نے اس آواز کو مختلف نام دیئے ہیں، صاعقہ (کڑک دار بجلی) رجفہ (زلزلہ برپا کرنے والی آواز) طاغیۃ (دہشت ناک) صیحۃ (زبردست چیخ) یہ خوفناک آواز سن کر قوم کا ہر شخص اوندھے منہ زمین پر گر پڑا اور جو شخص جس حالت میں تھا اسی حالت میں ہلاک ہوگیا، قوم تو ہلاک ہوگئی، مگر ان کے مکانات آج بھی موجود ہیں، روایات سے پتہ چلتا ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ سے تبوک جاتے ہوئے اس بستی کے قریب قیام فرمایا، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے ساتھ حجر میں اترے تو لوگوں نے بستی کے کنوؤں سے پانی لینا شروع کردیا، کچھ لوگوں نے اس پانی سے آٹا بھی گوندھ لیا، ہانڈیاں بھی چڑھادیں، یہ دیکھ کر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہانڈیاں الٹ دو، اور گندھا ہوا آٹا اونٹوں کو کھلا دو، ایسا نہ ہو کہ تم بھی اسی عذاب میں مبتلا ہوجاؤ جس میں وہ قوم مبتلا ہوئی تھی، یہ سن کر تمام صحابہ نے اپنی ہانڈیاں الٹ دیں اور گندھا ہوا آٹا اونٹوں کو کھلا دیا۔(۱) لوگ مدائن صالح میں ان مکانات کو دیکھنے جاتے ہیں، مگر اب گھروں کے علاوہ تمام آثار مٹ چکے ہیں، کہتے ہیں کسی باغ میں ابھی تک حضرت صالح علیہ السلام کا کنواں اور وہ کونڈ موجود ہے جس میں اونٹنی پانی پیا کرتی تھی۔

(۱) مسند ابی الجعد، رقم الحدیث: ۲۵۷۱۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام

ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کو تینوں بڑے مذاہب عیسائیت، یہودیت اور اسلام میں یکساں اہمیت اور احترام حاصل ہے، اوّل الذکر دونوں مذاہب کے ماننے والے تو انھیں اپنے اپنے مذہب کا بانی بھی قرار دیتے ہیں، اسلام کا انھیں بانی تو نہیں سمجھا جاتا لیکن یہ پہلے پیغمبر ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے مسلم کہہ کر پکارا ہے، قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر پینتس سورتوں کی اڑسٹھ آیات میں ہے، ایک جگہ تو اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنا خلیل بھی کہا ہے اس لیے مسلمان بھی ان کے نام کے ساتھ خلیل اللہ کا لقب لگانا باعث سعادت تصور کرتے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک لقب ابوالانبیاء بھی ہے، کیوں کہ ان کی اولاد میں انبیاء ورسل کا ایک طویل سلسلہ ہے جو اللہ کے آخری نبی سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر جا کر ختم ہوجاتا ہے، قرآن کریم میں انھیں امام الناس بھی کہا گیا ہے۔

والد کو قائل کرنے کی کوشش:

حضرت ابراہیم کی پیدائش چار ہزار سال قبل عراق کے قصبے ادر میں ہوئی، ان کے باپ کا نام آزر تھا، جو مذہبی پیشوا بھی تھا، اور لکڑی کے بت تراش کران کو فروخت بھی کیا کرتا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آنکھ کھول کر گھر میں بت بنتے ہوئے دیکھے اور چاروں طرف لوگوں کو بتوں کی پرستش کرتے ہوئے پایا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کو بت تراش کے گھر میں بت شکن پیدا کرنا تھا اس لیے روز اوّل ہی سے ان کی طبیعت بتوں سے متنفر اور اللہ کی وحدانیت اور ربوبیت کے مظاہر کی طرف مائل تھی، کچھ شعور سنبھالا تو ان کی پہلی گفتگو اپنے باپ سے ہوئی، قرآن کریم کی سورۂ مریم میں باپ بیٹے کی یہ گفتگو موجود ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: يَأَبَتِ لِمَ تَعۡبُدُ مَا لَا يَسۡمَعُ وَلَا يُبۡصِرُ وَلَا يُغۡنِي عَنكَ شَيۡـًٔا يَٰٓأَبَتِ إِنِّي قَدۡ جَآءَنِي مِنَ ٱلۡعِلۡمِ مَا لَمۡ

يَاتِكَ فَاتَّبِعْنِيْ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا يٰاَبَتِ لَاتَعْبُدِ الشَّيْطَانَ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا يٰاَبَتِ إِنِّيْ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ(۱)

''ابا جان! آپ ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہیں جو نہ سنتی ہیں، نہ دیکھتی ہیں اور نہ آپ کو کوئی فائدہ پہنچاتی ہیں، ابا جان! میرے پاس ایسا علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا، آپ میرے کہنے پر چلیں میں آپ کو سیدھا راستہ دکھلاؤں گا، ابا جان! آپ شیطان کی عبادت نہ کریں، شیطان اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہے، ابا جان مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ پر رحمٰن کی طرف سے کوئی عذاب نہ آپڑے''۔ بیٹے کی زبان سے یہ صاف صاف باتیں سن کر باپ کو بڑا غصہ آیا، اس کو چاہیے تھا کہ وہ ٹھنڈے دل سے بیٹے کی باتوں پر غور کرتا اس کے بجائے اس نے غصے میں کہدیا: قَالَ أَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰاِبْرَاهِيْمُ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا.(۲) ''کیا تم میرے معبودوں سے پھرے ہوئے ہو، اگر تم اپنی اس حرکت سے باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کروں گا، اور تم مجھ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلے جاؤ''۔ ان حالات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے باپ کے ساتھ رہنا ممکن نہ تھا، انھوں نے صاف کہہ دیا اب میرا آپ کے ساتھ رہنا دشوار ہے، میں آپ کو اور آپ کے ان معبودانِ باطلہ کو چھوڑ کر جا رہا ہوں، لیکن میں آپ کے لیے مغفرت کی دُعا ضرور کرتا رہوں گا۔

قوم سے خطاب:

باپ سے رخصت ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم کی طرف متوجہ ہوئے، اور ان کے سامنے پیغمبرانہ دعوت رکھی جس میں مورتی پوجا کی کوئی گنجائش نہیں تھی، سب سے پہلے انھوں نے قوم سے یہ پوچھا کہ یہ کیسی (واہیات) مورتیاں ہیں جن پر تم جمے بیٹھے ہو، (۳) انھیں جواب دیا گیا ہم نے تو اپنے باپ دادا کو انھی مورتیوں کی پوجا کرتے ہوئے پایا ہے، حضرت ابراہیم نے ان سے کہا کہ تم اور تمہارے باپ دادا سب کھلی گمراہی میں مبتلا ہیں، بھلا یہ مٹی اور لکڑی کی بے جان مورتیاں تمہیں کیا فائدہ پہنچا سکتی ہیں، انھوں نے عملی طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اگر ان مورتیوں کو توڑ دیا جائے تو وہ اپنا دفاع

(۱) مریم: ۴۲-۴۵۔ (۲) مریم: ۴۶-۴۷۔ (۳) الانبیاء: ۵۲۔

تک نہیں کرسکتیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مدلل گفتگو سن کر بہت سے لوگوں کا عقیدۂ بت پرستی متزلزل ہوگیا، ان کے دل میں یہ بات گھر کرنے لگی کہ واقعی ان بے جان مورتیوں کی عبادت سے کوئی فائدہ پہنچنے والا نہیں ہے، بت پرستی کے علاوہ اس قوم میں ایک بیماری کواکب پرستی کی بھی تھی، یعنی وہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ چاند، سورج اور دوسرے کواکب انسانی زندگی کو براہِ راست متاثر کرتے ہیں، موت وحیات، نفع وضرر، خوش حالی، قحط سالی، شکست وفتح اور جو کچھ انسان کو ملنے والا ہے، یا حاصل ہونے والا ہے ان سب کے پیچھے ان کواکب کی حرکات واثرات کارفرما ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے اس عقیدے کا رد بھی کیا کہ بھلا یہ چاند تمہارا معبود کیسے ہوسکتا ہے جو صبح ہوتے ہی چھپ جاتا ہے، یہ سورج تمہیں کیا نفع دے سکتا ہے رات آتے ہی جس کی ساری چمک اور روشنی ختم ہوجاتی ہے، باقی ستاروں کا بھی اپنا کوئی مستقل وجود نہیں، سورج کی روشنی ان کو تمہاری نگاہوں سے اوجھل کردیتی ہے بھلا یہ ستارے سیارے جو خود اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے دوسروں کے محتاج ہیں تم لوگوں کو کیا نفع پہنچا سکتے ہیں اور تمہارا کیا نقصان کرسکتے ہیں؟

نمرود کے دربار میں:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس مناظرانہ روش اور کھلی دعوت نے قوم کے سربرآوردہ لوگوں کو اس قدر مشتعل کیا کہ وہ ان کو راستے سے ہٹانے کی تدبیریں کرنے لگے، اور ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ اس گستاخ کو سزا ضرور ملنی چاہئے، یہ ہمارے معبودوں کی توہین کررہا ہے، اگر دیوتاؤں کی خوشنودی چاہتے ہو تو اسے دہکتی ہوئی آگ کے حوالے کردو تاکہ اس کا قصہ ہی ختم ہوجائے اور آئندہ کسی کو ہمارے دیوتاؤں کی شان میں گستاخی کرنے کی جرأت نہ ہو، شدہ شدہ یہ بات نمرود تک بھی پہنچ گئی جو بادشاہ وقت تھا اور قوم کا سب سے بڑا معبود بھی، جب بادشاہ کو پتہ چلا کہ ایک لڑکا ہمارے دیوتاؤں کو کھلے عام برا بھلا کہہ رہا ہے، تو اس نے اس لڑکے کو اپنے دربار میں حاضر کرنے کا حکم دیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام حالاں کہ نوعمر لڑکے تھے مگر کسی خوف کے بغیر دربار میں پہنچے اور نمرود کے ہر سوال کا جواب دیا، قرآن کریم نے نمرود اور ابراہیم علیہ السلام کی یہ بات چیت ذکر کی

ہے، نمرود سمجھتا تھا کہ موت وحیات اس کے ہاتھ میں ہے، چنانچہ اس نے جلاد کو حکم دیا کہ فلاں شخص کی گردن اڑادو، اس نے حکم کی تعمیل کی، نمرود نے فاتحانہ شان سے کہا کہ دیکھا میں موت پر اختیار رکھتا ہوں، ابراہیم علیہ السلام نے اس سے کہا کہ اگر تجھے اپنی ملوکیت اور خودساختہ الوہیت پر اسی قدر گھمنڈ ہے تو ذرا سورج کو مشرق کے بجائے مغرب سے نکال کر دکھا، یہ سن کر نمرود حیرت زدہ رہ گیا، اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ اس کا کیا جواب دے، اس کے بس میں تھا ہی نہیں کہ وہ سورج کو مشرق کے بجائے مغرب سے نکالتا۔

قرآن کریم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کا یہ مناظرہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۵۸: میں بیان کیا ہے، جس بادشاہ کا یہ ذکر ہے اس کا نام نمرود تھا، تفسیر ابن کثیر میں حضرت مجاہدؒ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ دنیا میں مشرق سے مغرب تک حکومت کرنے والے بادشاہ چار ہوئے ہیں، دو مؤمن اور دو کافر، مؤمنوں میں حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام اور حضرت ذوالقرنین، اور کافروں میں نمرود بن کنعان اور بخت نصر، غور کیجئے ایک نوعمر لڑکا جس کی پوری قوم مخالف ہے، شہنشاہ وقت کے دربار میں کھڑا ہے اور اسے چیلنج دے رہا ہے، صرف چیلنج ہی نہیں دے رہا ہے بلکہ اس کو اپنے جوابات سے حیران و پریشان بھی کررہا ہے، مفسرین نے لکھا ہے کہ نمرود بڑا جابر اور ظالم بادشاہ تھا، انسانی جان کی اس کے نزدیک کوئی قیمت نہیں تھی، وہ لطف اندوزی کے لیے بے گناہ انسانوں کو بھی قتل کرادیا کرتا تھا، اس کا دعوی تھا کہ لوگوں کی موت اور زندگی اس کے ہاتھ میں ہے، کیوں کہ اس کی حکمرانی طویل عرصے سے جاری تھی اس لیے وہ بہ زعم خود دنیا کا مالک بن بیٹھا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ اس کی یہ حکومت کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے، لوگ اسے خدا سمجھ کر پوجتے تھے، ایک مرتبہ اس نے خواب مین دیکھا کہ آسمان پر ایک ستارہ طلوع ہوا جس کی روشنی میں چاند سورج اور تمام ستاروں کی چمک دمک ماند پڑگئی، اس نے اپنے دربار کے کاہنوں اور نجومیوں سے اس خواب کی تعبیر دریافت کی، اسے بتلایا گیا کہ تیری مملکت میں ایک بچہ ایسا پیدا ہوگا جو تیری بادشاہت کے زوال کا سبب بنے گا، یہ سن کر نمرود پریشان ہوگیا اور اس نے یہ اعلان کرادیا کہ اس شہر میں جو بچہ بھی پیدا ہو اسے فوراً قتل کردیا جائے، اس نے یہاں تک حکم دیا کہ کوئی مرد اپنی بیوی کے قریب نہ جائے تاکہ مملکت میں کوئی بچہ جنم نہ لے

سکے، اسی دوران آزر کے گھر حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدا ہو گئے، ان کی والدہ نے قتل کے خوف سے بچے کو ایک غار میں چھپا دیا، روز آنہ ان کی والدہ ان کو دودھ وغیرہ پلانے جایا کرتی تھیں، بعض لوگوں کا بیان ہے کہ سات سال تک اور بعض کے مطابق سترہ سال تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کی والدہ نے اسی غار میں چھپا کر رکھا۔(۱)

آتشِ نمرود:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس مطالبے کے جواب میں کہ سورج کو مغرب سے نکال کر دکھاؤ نمرود سے کوئی معقول جواب نہ بن پڑا، اپنی بادشاہت قائم رکھنے کے لیے اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہ تھا کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کو اُن کی اس جرأت اور گستاخی کی سزا دیتا، اور سزا بھی ایسی کہ دنیا دیکھتی اور عبرت پکڑتی، چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ آگ دہکائی جائے اور ابراہیم کو اس آگ میں ڈال دیا جائے، دیوی دیوتاؤں کی توہین وتحقیر اور سب سے بڑھ کر ''معبودوں کے معبود'' نمرود کی اہانت کا انتقام اسی طرح لیا جا سکتا ہے، چنانچہ آگ دہکائی گئی اور ابراہیم علیہ السلام کو پکڑ کر اس کے حوالے کر دیا گیا، پورا شہر سزا کا یہ منظر دیکھ رہا تھا، اور خوش ہو رہا تھا کہ اب ان کے دیوتاؤں کا دشمن آگ میں جل کر خاک ہونے والا ہے، لوگوں کو کیا پتہ تھا کہ جس قادر مطلق نے آگ میں جلانے کی تأثیر رکھی ہے اسی نے آگ کو حکم دے رکھا ہے کہ وہ ابراہیم کے لیے ٹھنڈی ہو جائے، ان کے حق میں سلامتی کا گہوارہ بن جائے، علامہ اقبال نے اس واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کیا خوب کہا ہے۔

آج بھی ہو جو براہیم سا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

آگ سرد ہو گئی، اس کے دہکتے ہوئے انگارے حضرت ابراہیم کے جسم کے لیے پھول بن گئے اور وہ ہنستے مسکراتے اور اپنے رب کریم کا شکر ادا کرتے ہوئے آگ سے باہر آ گئے، آگ سے صحیح سلامت نکلنے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس شہر سے دوسرے شہر جانے کا ارادہ کیا اور اس کا اعلان بھی کر دیا: ''وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي

(۱) تفسیر روح البیان: ۳/۵۹۔

سَیَھْدِیْنِ.(۱) میں جانے والا ہوں اپنے پروردگار کی طرف عنقریب وہ ہی میری راہ نمائی کرنے والا ہے''۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم نمرود کے پایۂ تخت بابل سے نکل کر فدان کی طرف چلے تاکہ وہاں کے لوگوں کو اللہ کی طرف بلاسکیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باقی قصہ تو ہم بعد میں بیان کریں گے یہاں نمرود کے انجام کا ذکر بھی ضروری ہے، مفسرین نے لکھا ہے کہ اس بدبخت نے اللہ کے ساتھ مقابلے کی ٹھانی اور اپنا لاؤ لشکر لے کر ایک بڑے میدان میں خیمہ زن ہوگیا اس کا اعلان تھا کہ اگر میرے علاوہ کوئی دوسرا خدا ہے تو وہ آئے اور میرا مقابلہ کرے، اللہ تعالیٰ نے مچھروں کو حکم دیا کہ وہ اس لشکر کو تہس نہس کردیں، مچھر اتنی تعداد میں تھے کہ پورے میدان پر چھا گئے یہاں تک کہ ان کی کثرت سے سورج کی روشنی بھی چھپ گئی، کچھ ہی دیر میں مچھروں نے نمرود کی فوج کا سارا خون چوس لیا اور ان کا گوشت پوست کھالیا، ان مچھروں میں سے ایک مچھر نمرود کی ناک کے ذریعے دماغ میں جا گھسا اور چار سو سال تک اس کا دماغ چاٹتا رہا، جب مچھر اس کے دماغ میں ڈنک مارتا تو وہ دیواروں سے سر ٹکراتا اور یہ تمنا کرتا کہ کاش اسے موت آجائے کیوں کہ موت کی تکلیف اس عذاب سے بدرجہا بہتر تھی غرضیکہ وہ چار سو سال تک مچھر کی تکلیف سے چیختا چلاتا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہلاک ہوگیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنا دعوتی سفر جاری رکھا، اس سفر میں ان کے ہمراہ اہلیہ حضرت سارہؓ، حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی بیوی بھی تھیں، چار آدمیوں کا یہ مختصر سا قافلہ مختلف شہروں اور قریوں میں دعوت دین دیتا ہوا فلسطین پہنچا، کچھ عرصے وہ لوگ فلسطین کے مغربی شہر شیکم (موجودہ نابلس) میں قیام پذیر رہے پھر مغرب کی جانب آگے بڑھتے چلے گئے یہاں تک مصر جا پہنچے، اور مصر سے واپس آکر فلسطین میں مقیم ہوگئے، یہاں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے جس میں بناء کعبہ جیسے اہم واقعات بھی ملتے ہیں مگر ان واقعات کا تعلق ان کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام سے بھی ہے اس لیے باقی تفصیلات حضرت اسماعیل علیہ السلام کے تذکرے کے ضمن میں پیش کی جائیں گی ان شاء اللہ۔

---

(۱) سورۃ الصفت: ۹۹۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے بیٹے:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں آپ نے پڑھا ہے کہ مصر سے واپسی پر آپ نے فلسطین میں سکونت اختیار کرلی تھی، وہ علاقہ اس وقت کنعان کے نام سے مشہور تھا، آپ نے ایک سو پچھتر سال (۱۷۵) کی عمر میں وفات پائی اور یروشلم کے قریب حبرون میں دفن کیے گئے، ستاسی سال کی عمر تک آپ کے کوئی اولاد نہیں ہوئی، آپ کو بڑی تمنا تھی کہ کوئی بچہ پیدا ہو، اس کے لیے دُعا کرتے رہتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ستاسی سال کی عمر میں دوسری اہلیہ حضرت ہاجرہؓ کے بطن سے ایک بیٹا عطا فرمایا جن کا نام نامی حضرت اسماعیل علیہ السلام ہے، دوسرا بیٹا سو سال کی عمر میں پہلی اہلیہ حضرت سارہؓ کے بطن سے ہوا جن کا نام حضرت اسحاق علیہ السلام ہے، ان دو کے علاوہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک بیوی تھیں جن کا نام قطورہؓ تھا، ان سے چھ بیٹے پیدا ہوئے ان کی نسل بنی قطورہ کہلاتی ہے۔

حکم الٰہی کی تعمیل:

ابھی حضرت اسماعیل شیر خوار ہی تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے رب کے حکم سے انھیں اور ان کی والدہ حضرت ہاجرہؓ کو لے کر اس وَادیِ غیر ذی زرع (بنجر اور بے آب و گیاہ میدان) کی طرف چلے جہاں آج کعبۃ اللہ واقع ہے، لمبے سفر کے بعد تین افراد کا یہ قافلہ یہاں پہنچا، اس وقت یہ جگہ پہاڑوں کے بیچ میں تھی، نہ یہاں پانی تھا اور نہ کوئی آبادی تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک مشکیزہ پانی اور کھجوروں کی ایک تھیلی ان کے سپرد کر کے روانہ ہو گئے، حضرت ہاجرہؓ ان کی طرف دوڑیں اور پوچھنے لگیں کہ آپ ہمیں اس ویران جگہ چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نہ پیچھے مڑ کر دیکھا اور نہ کوئی جواب دیا، خاموشی سے چلتے رہے، حضرت ہاجرہؓ کو خیال آیا کہ یقیناً ہمیں یہ چھوڑ کر جانا اللہ کے حکم سے ہوا ہے، ورنہ ایک شوہر اپنی بیوی کو اور ایک باپ اپنے نومولود بیٹے کو

جو بڑی تمناؤں اور دعاؤں سے والدین کی آغوش میں آیا ہے اس طرح بے سہارا چھوڑ کر نہیں جاسکتا، یہ سوچ کر حضرت ہاجرہؓ کی اضطرابی کیفیت کچھ کم ہوئی اور انھوں نے اپنے شوہر سے پوچھا کیا آپ اللہ کے حکم سے ہمیں یہاں چھوڑ کر جارہے ہیں؟ انھوں نے مڑکر بیوی کی طرف دیکھا اور جواب دیا ہاں! یہ کہہ کر تیزی سے چلنے لگے، حضرت ہاجرہؓ نے کہا اگر یہ اللہ کے حکم سے ہے تب وہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا، یہ کہہ کر وہ اپنے بچے کے پاس لوٹ گئیں، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئے، وادی سے باہر نکل کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ادھر رخ کیا جہاں بیت اللہ ہے اور یہ دُعا کی:

دعائے ابراہیمی:

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُم مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ. (۱) ''اے ہمارے رب! میں نے اپنی نسل کو ایک بے آب وگیاہ وادی میں تیرے محترم گھر کے پاس ٹھہرایا ہے، اے ہمارے رب اس لیے کہ وہ نماز قائم کریں، آپ کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کردیں، اور ان کو ہر قسم کے پھلوں سے رزق عطا کیجیے تاکہ وہ آپ کا شکر ادا کریں''۔ یہ بڑی جامع اور بامعنی دعا ہے جو ایک پیغمبر نے اپنے رب کے حضور کی ہے، دعا کا آغاز اس حوالے سے ہوا ہے کہ یہ ایک چٹیل میدان ہے، نہ یہاں آدم ہے نہ آدم زاد ہے نہ پانی ہے، نہ کھیت ہیں نہ باغات ہیں، بس آپ ہی ان کی دیکھ بھال کرنے والے ہیں، آپ ہی ان کی حفاظت کرنے والے ہیں، آپ مقلب القلوب ہیں، کچھ لوگوں کے دلوں میں یہ خیال ڈال دیجیے کہ وہ اس چٹیل میدان میں میرے بیوی بچوں کے پاس آکر رہنے لگیں تاکہ یہاں کچھ رونق ہوجائے اور یہاں کے رہنے والوں کو اپنی قدرت سے پھل وغیرہ کھانے کو دیجیے جس کا بہ ظاہر یہاں کوئی ذریعہ نہیں ہے، مگر آپ کی قدرت میں سب کچھ ہے، یہ دعاء ابراہیمی اس طرح قبول ہوئی کہ کچھ ہی دنوں میں یہ جگہ لوگوں سے آباد ہوگئی، اور کھانے کی اشیاء بھی وافر مقدار میں پہنچنے لگیں، مکہ مکرمہ میں آج بھی کاشت کا کوئی سلسلہ نہیں ہے لیکن دنیا بھر سے اتنے پھل

(۱) سورۂ ابراہیم: ۳۷۔

یہاں پہنچتے ہیں کہ دوسرے بہت سے شہروں میں ان کا ملنا مشکل ہے۔

چشمۂ زم زم پھوٹ پڑا:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو معلوم تھا کہ یہ جگہ معمولی نہیں ہے، بلکہ یہاں اللہ کا مقدس ومحترم گھر ہے جو اگر چہ زمانے کے تغیرات کی وجہ سے اس وقت نگاہوں سے اوجھل ہے لیکن اللہ کو اپنا یہ گھر آباد کرنا مقصود ہے اور اللہ میری اولاد کے ذریعے یہ گھر آباد کرانا چاہتا ہے اس لیے وہ اپنے اہل وعیال کی طرف سے پوری طرح مطمئن تھے اگر چہ بشری تقاضوں کی بنا پر اس جدائی پر غمگین بھی تھے، یہ دعا مانگ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام تو شام کی طرف روانہ ہوگئے جہاں جانے کا حکم انھیں دیا گیا تھا اور حضرت ہاجرہؓ اپنے بچے کے ساتھ وہاں رہ گئیں، جو کچھ زادراہ ان کے پاس تھا وہ چند دنوں میں ختم ہوگیا، اب کیا کریں کب تک بھوکا پیاسا رہا جاسکتا ہے، خود تو صبر کرسکتی تھیں مگر معصوم بچہ کیسے صبر کرتا، بھوک سے زیادہ پیاس سے پریشان تھیں، خود بھی بے چین تھیں اور بچہ بھی بھوک پیاس سے بے حال تھا، ماں سے اپنے بچے کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی، جب بچہ زیادہ روتا تو وہ اسے ہر ممکن طریقے سے بہلانے کی کوشش کرتیں، اور زیادہ روتا تو بچے سے کچھ دور جاکر بیٹھ جاتیں تاکہ اس کے رونے کی آواز کانوں میں نہ پڑے، ماں کی ممتا سے مجبور ہوکر پھر قریب آکر بیٹھ جاتیں، پانی کی تلاش میں ادھر سے ادھر دوڑتیں، پہاڑیوں پر چڑھ کر دور دور تک نظر دوڑاتیں کہ شاید کوئی قافلہ آتا جاتا نظر آجائے اور وہ اسے اپنی طرف متوجہ کرلیں، اس طرح انھوں نے جائے قیام کے قریب دو پہاڑیوں صفا اور مروہ کے درمیان سات چکّر لگائے، ساتویں چکر میں حضرت ہاجرہؓ مروہ پر کھڑی ہوکر کسی قافلے کی امید میں نگاہیں دوڑا رہی تھیں اسی وقت حضرت جبرئیل امین علیہ السلام تشریف لائے، انھوں نے اپنی ایڑی زمین پر ماری جس سے پانی کا چشمہ ابل پڑا، یہ دیکھ کر حضرت ہاجرہ دوڑتی ہوئی آئیں اور انھوں نے پانی کے اردگرد مٹی پتھر ڈال کر حوض بناکر پانی کو بہنے سے روکا، یہ وہی چشمۂ آب ہے جو بئر زمزم کے نام سے مشہور ہے اور اس وقت سے آج تک جاری ہے، پانی کی یہ فراوانی دیکھ کر قبیلۂ جرہم کے لوگ جو قافلے کی صورت میں اِدھر سے گزر رہے

تھے یہیں رہ پڑے اس طرح یہ وادیٔ غیر ذی زرع انسانوں سے آباد ہونے لگی۔

قبیلۂ بنو جرہم کی آمد:

روایات میں ہے کہ جس وقت حضرت ہاجرہؓ مروہ پر تھیں انھوں نے ایک آواز سنی، دل میں کہنے لگیں کہ شاید کوئی پکار رہا ہے کان لگائے، پھر آواز آئی، حضرت ہاجرہؓ نے کہا کہ اگر تم مدد کر سکتے ہو تو سامنے آؤ تمہاری آواز میں نے سن لی ہے، دیکھا تو حضرت جبرئیل امین ہیں، انھوں نے اپنی ایڑی اس جگہ ماری جہاں زمزم کا کنواں ہے، اس جگہ سے پانی ابلنے لگا، حضرت ہاجرہ نے جلدی سے آکر پانی کے چاروں طرف باڑ لگادی، اگر وہ ایسا نہ کرتیں تو یہاں پانی کا زبردست چشمہ بن جاتا، بہ ہر حال حضرت ہاجرہؓ نے پانی پیا، اور حضرت اسماعیل کو دودھ پلایا، فرشتے نے حضرت ہاجرہؓ کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ غم نہ کرو، اللہ تعالیٰ تمہیں اور تمہارے بچے کو ضائع نہیں کرے گا، یہ مقام بیت اللہ ہے جس کی تعمیر اس بچے اسماعیل اور اس کے والد ابراہیم کی قسمت میں لکھ دی گئی ہے، جب پانی کا چشمہ بہنے لگا تو پرندے بھی اڑ کر وہاں آنے لگے، ایک قافلے کے لوگوں نے پرندوں کو اڑتے ہوئے دیکھا تو خیال آیا کہ یہاں یقیناً کوئی آبادی ہے وہ اپنا راستہ چھوڑ کر ادھر آئے، دیکھا تو پانی کا ایک چشمہ بہہ رہا ہے اور ایک عورت اپنے شیر خوار بچے کے ساتھ وہاں موجود ہے، یہ قبیلہ جرہم کے لوگ تھے جن کے قافلے تجارت کی غرض سے ادھر سے ادھر گزرتے رہتے تھے، ان لوگوں نے حضرت ہاجرہ سے یہاں رہنے کی اجازت چاہی، انھوں نے خوشی کے ساتھ اجازت دیدی، یہ لوگ یہاں مکانات بنا کر رہنے لگے، ان ہی لوگوں میں اسماعیل علیہ السلام بھی رہتے ان کے بچوں کے ساتھ کھیلتے کودتے اور ان کی زبان سیکھتے جب حضرت اسماعیل بڑے ہوگئے تو ان کا طور طریقہ عادت واخلاق اور خوب صورتی قبیلے والوں کو بہت اچھی لگی، انھوں نے اپنی ایک لڑکی کی شادی ان سے کردی، کچھ روز بعد حضرت ہاجرہؓ انتقال کر گئیں۔(۱)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خواب:

حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنی والدہ کے ساتھ اس وادیٔ غیر ذی زرع میں ج

(۱) بخاری شریف، کتاب الرویاء، کتاب الانبیاء۔

اب لوگوں سے آباد ہوگئی تھی رہ رہے تھے ان کے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام گاہے بہ گاہے اپنے اہل وعیال سے ملنے کے لیے تشریف لایا کرتے تھے، جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کچھ بڑے ہوگئے اور اس قابل ہوگئے کہ وہ اپنے والد کے ساتھ چلنے پھرنے لگیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنے بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں، آپ نے اپنے اس خواب کو محض خیال سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا بلکہ اسے حکم الٰہی سمجھا کیوں کہ انبیاء کے خواب بھی سچے ہوتے ہیں، اب ضروری تھا کہ وہ اپنا خواب بیٹے کو بتلاتے، چنانچہ انھوں نے بیٹے سے فرمایا میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں، اب تم بتلاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟ بیٹے نے کسی توقف کے بغیر کہا ابا جان! آپ تعمیل حکم میں تاخیر نہ کریں، میں ذبح ہونے کے لیے تیار ہوں، ان شاء اللہ تعالیٰ آپ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے، اس گفتگو کے بعد دونوں باپ بیٹے قربانی کے حکم پر عمل کرنے کے لیے جنگل کی طرف روانہ ہوگئے، تفسیری روایات سے پتہ چلتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے لخت جگر کو لے کر چلے تو راستے میں تین جگہ شیطان نے انھیں بہکانے اور ورغلانے کی کوشش کی، تینوں مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سات سات کنکریاں مار کر اسے بھگا دیا، حج کے دوران عرفات سے واپسی کے بعد منیٰ میں آج تک تینوں جمرات پر اسی ادائے ابراہیمی کی یادگار کے طور پر شیطان کو کنکریاں ماری جاتی ہیں، بہرحال حضرت ابراہیم علیہ السلام بیٹے کو لے کر قربان گاہ پہنچے، اور رب کے حکم پر عمل کی تیاری شروع کردی، بیٹے نے عرض کیا ابا جان! آپ مجھے اچھی طرح باندھ دیجئے تاکہ میں زیادہ ہاتھ پیر نہ ہلاؤں اور کہیں آپ میرا اضطراب اور بے چینی دیکھ کر پریشان نہ ہوجائیں، آپ اپنے دامن کو بھی سنبھال کر رکھئے کہیں وہ میرے خون سے تر نہ ہوجائے اور آپ کے خون آلود کپڑے دیکھ کر میری امّی کو دکھ نہ ہو، آپ اپنی چھری کی دھار بھی تیز کرلیجئے تاکہ میرا گلا جلد از جلد کٹ جائے اور میرا دم آسانی کے ساتھ نکل جائے، میری امی کو میرا سلام کہئے اور میرا یہ کرتا انھیں دیدیجئے تاکہ ان کے بے چین اور مضطرب دل کے لیے میرا یہ کرتا وجہ سکون بن جائے، باپ نے بیٹے سے فرمایا تم کتنے اچھے ہو کہ خدا کے حکم کی تعمیل میں میری مدد کر رہے ہو، یہ کہہ کر انھوں نے بیٹے کی پیشانی چومی، اس کے ہاتھ پیر باندھ دئے

اور اوندھے منہ لٹا دیا، اسی کو قرآن کریم نے ان دو لفظوں میں بیان کیا ہے: "وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ" (۱) "اور بیٹے کو کروٹ کے بل لٹا دیا" بعض روایات میں ہے کہ پہلے انھیں سیدھا لٹایا تھا لیکن جب چھری گلے پر چلائی اور اس نے اپنا کام نہیں کیا تو بیٹے نے کہا ابا جان! آپ مجھے منہ کے بل لٹا دیجیے، ایسا لگتا ہے میرا چہرہ آپ کی نظروں کے سامنے ہونے کی وجہ سے آپ کے ہاتھ پوری طاقت سے کام نہیں کر رہے ہیں، اس کے بعد انھیں اوندھے منہ لٹا دیا اور چھری چلا دی لیکن چھری نے اپنا کام نہیں کیا، آسمان سے آواز آئی! بس بہت ہوا، تم نے اپنا خواب سچ کر دکھایا، اب بیٹے کو چھوڑ دو، اور تمہارے پاس جو مینڈھا کھڑا ہوا ہے اس کو بیٹے کے بدلے میں ذبح کر دو، ہم نیک لوگوں کو اسی طرح نوازتے ہیں، ابراہیم علیہ السلام نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو جھاڑی کے قریب ایک مینڈھا کھڑا تھا، آپ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے اسے ذبح کر دیا، عید الاضحیٰ کے موقع پر صاحب نصاب مسلمان مرد و خواتین قربانی کا جو فریضہ ادا کرتے ہیں وہ اسی تاریخی واقعے کی یادگار ہے۔

اہل و عیال کی خبر گیری:

اس طرح دونوں باپ بیٹے گھر واپس آ گئے، حضرت ابراہیم اپنے سفر پر نکل پڑے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام وہیں رہ گئے، جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے اہل و عیال سے ملنے کے لیے اور ان کی خبر گیری کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً مکہ مکرمہ تشریف لاتے تھے، اس وقت تک بیت اللہ تعمیر نہیں ہوا تھا، حضرت اسماعیل علیہ السلام جوان ہو چکے تھے اور ان کی شادی قبیلے کی ایک لڑکی سے ہو چکی تھی، حضرت ہاجرہؓ فوت ہو گئی تھیں، ایک مرتبہ تشریف لائے تو آپ کا استقبال ان کی بہو نے کیا، بیٹا گھر پر نہیں تھا، انھوں نے پوچھا اسماعیل کہاں ہے؟ بہو نے جواب دیا روزگار کی تلاش میں باہر گئے ہوئے ہیں، پوچھا حالات کیسے ہیں، گزر بسر کس طرح ہو رہی ہے؟ بہو نے جواب دیا سخت مصیبت اور بڑی پریشانی میں گزر رہی ہے، نہایت دکھ اور تکلیف ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ سن کر فرمایا! اسماعیل واپس آئیں تو ان کو میرا اسلام کہہ دینا اور کہنا اپنے گھر کی چوکھٹ بدل لیں، حضرت اسماعیل علیہ السلام سفر سے واپس آئے تو اہلیہ نے آنے والے مہمان کا

(۱) الصافات: ۱۰۳۔

سلام بھی پہنچایا اور پیغام بھی، پیغام سن کر حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کہا وہ مہمان میرے والد تھے، انھوں نے اس پیغام کے ذریعے مجھے یہ ہدایت کی ہے کہ میں تمہیں طلاق دیدوں، دوبارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پھر تشریف لائے، اس وقت بھی حضرت اسماعیل کہیں باہر گئے ہوئے تھے، گھر میں دوسری خاتون تھیں، پوچھا تمہارے شوہر کہاں ہیں، انھوں نے کہا تلاش معاش میں باہر نکلے ہوئے ہیں، پوچھا زندگی کیسی گزر رہی ہے، انھوں نے عرض کیا اللہ کا شکر واحسان ہے بہت اچھی گزر رہی ہے، کھانے کو گوشت ہے اور پینے کے لیے پانی ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کچھ دیر ٹھہر کر واپس ہوگئے اور جاتے ہوئے کہہ گئے جب تمہارا شوہر آئے تو اسے میرا سلام کہنا اور یہ بھی کہنا کہ اپنے گھر کی چوکھٹ کو باقی رکھنا، حضرت اسماعیل علیہ السلام واپس تشریف لائے اور بیوی کی زبان سے یہ پیغام سنا تو فرمایا کہ میرے والد تشریف لائے تھے، اور وہ یہ کہہ کر گئے ہیں کہ تم زندگی بھر میری رفیقۂ حیات بن کر رہو، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی زندگی کا اہم واقعہ رسم ختنہ بھی ہے، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام ننانوے برس کے ہوگئے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر تیرہ سال کی ہوگئی تو حکم الٰہی ہوا کہ ختنہ کرو، اس حکم کے بعد پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ختنہ کیں، اس کے بعد حضرت اسماعیل کی ختنہ کی، یہ رسم ختنہ آج بھی ملّت ابراہیمی کا شعار ہے اور سنت ابراہیمی کے طور پر ادا کی جاتی ہے۔

تعمیر کعبہ:

ایک مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ وہ وہاں جائیں جہاں اہل وعیال کو چھوڑ کر آئے تھے اور اللہ کے گھر کی تعمیر کریں، چناں چہ آپ ملک شام سے مکہ مکرمہ تشریف لائے اور اپنے جواں سال صاحبزادے کو خانۂ کعبہ کی تعمیر کے متعلق اللہ کا حکم سنایا، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ان دونوں حضرات کو ایک جگہ دکھلائی جو ایک ٹیلے کی شکل اختیار کر گئی تھی، اس ٹیلے کو کھودنے پر بیت اللہ شریف کی پرانی بنیادیں نکل آئیں، انہی بنیادوں پر دونوں نے خانۂ کعبہ کی تعمیر کی، جب بیت اللہ کی اونچائی لگ بھگ ایک میٹر ہوگئی تو حضرت اسماعیل علیہ السلام نے ایک پتھر لا کر رکھ دیا جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم نے خانۂ کعبہ کی دیواروں کو مزید اونچا اٹھایا، اس پتھر کو مقام ابراہیم کہتے ہیں، اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام

کے پاؤں کے نشانات ہیں جو اتنا زمانہ گزرنے کے باوجود آج تک قائم ہیں، تعمیر کعبہ کے وقت حضرت اسماعیل اپنے والد بزرگوار کو پتھر اٹھا اٹھا کر دیتے تھے اور حضرت ابراہیم وہ پتھر دیوار پر رکھتے جاتے تھے، یہاں تک کہ اس کی بلندی چار میٹر ہوگئی۔

حضرت اسماعیل کے بارہ بیٹے ہوئے، جو بارہ قبیلوں کے سردار بنے، ایک بیٹی تھی جس کے بیٹے ثابت کی نسل سے اصحاب الحجر اور اصحاب الرس کے قبیلے وجود میں آئے قرآن کریم میں حضرت اسماعیل کا ذکر سورۂ مریم سمیت کئی سورتوں میں ہے، انھوں نے ایک سو چھتیس سال کی عمر میں وفات پائی، بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ ان کی وفات فلسطین میں ہوئی اور وہیں مدفون ہیں، اور بعض عرب مؤرخین کا خیال ہے کہ ان کی وفات مکہ مکرمہ میں ہوئی اور بیت اللہ کے قریب دفن کیے گئے۔

حضرت لوط علیہ السلام

حضرت لوط علیہ السلام کا شمار بھی اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبروں میں ہوتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے ہیں، انہی کی آغوش تربیت میں پرورش پائی، متعدد اسفار میں ساتھ رہے، مصر کا سفر بھی دونوں حضرات نے ساتھ کیا، واپسی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام تو فلسطین میں آباد ہو گئے اور حضرت لوط علیہ السلام نے اردن کے مشرق میں واقع شہر سدوم میں سکونت اختیار کر لی، وہیں ان کو پیغمبری عطا ہوئی اور اہل سدوم کی اصلاح پر مامور کیے گئے، قرآن کریم کی متعدد سورتوں میں حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی قوم کا ذکر موجود ہے۔

قوم لوط کی بے حیائی:

سدوم کے لوگ طرح طرح کی بے حیائیوں اور برائیوں میں مبتلا تھے، دنیا کی کوئی برائی ایسی نہ تھی جو ان میں نہ پائی جاتی ہو، ایک برائی ایسی تھی جو سب سے پہلے اسی قوم میں پائی گئی اور وہ یہ کہ اس قوم کے لوگ جنسی خواہشات کی تکمیل کے لیے عورتوں کے بجائے لڑکوں کے پاس جاتے تھے، ان کو اس عادت بد میں شیطان لعین نے مبتلا کیا، تفسیر کی

کتابوں میں یہ قصہ مذکور ہے کہ قوم لوط کا شہر سدوم اس علاقے کا نہایت سرسبز وشاداب شہر تھا، ہر طرح کے پھل، غلّے اور میوے وہاں پیدا ہوتے تھے جس کی وجہ سے اس کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی، لوگ مہمان بن کر اس شہر میں آتے اور کئی کئی دن ٹھہرتے، قوم لوط کو مہمانوں کا آنا پسند نہ تھا مگر ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ مہمانوں کو اپنے شہر میں آنے سے کس طرح روکیں، ان حالات میں شیطان ایک مکار بوڑھے کے بھیس میں لوگوں کے پاس آیا اور کہنے لگا اگر تم مہمانوں سے چھٹکارا پانا چاہتے ہو تو مرد مہمانوں کے ساتھ ایسا ایسا کرو، اس نے ان لوگوں کو مہمانوں کے ساتھ لواطت کی ترغیب دی، سب سے پہلے خود ہی ایک خوب رولڑکے کی شکل میں وارد ہوا اور لوگوں سے بدفعلی کرائی، اس طرح لوگوں کو اس کی عادت پڑگئی، حضرت لوط ان کو ان بے حیائیوں سے روکتے تھے، قرآن کریم نے حضرت لوط کی نصیحت ان الفاظ میں نقل کی ہے: إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِّنَ الْعَالَمِينَ. إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُونِ النِّسَاءِ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُونَ.(۱) ''انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ کیا تم ایسے فحش کام میں مشغول ہو جو کام تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا، اور وہ یہ کہ تم عورتوں کے بجائے مردوں سے اپنی شہوت پوری کرتے ہو، بلاشبہ تم حد سے گزر رہے ہو''۔ مگر قوم لوط پر اپنے پیغمبر کی کسی نصیحت کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا، بلکہ جس قدر وہ نصیحت کرتے اسی قدر وہ لوگ بے حیائی کے کاموں میں زیادہ حصّہ لیتے، حضرت لوط علیہ السلام کی باتوں کا ان کے پاس کوئی معقول جواب تو تھا نہیں، بس ایک دوسرے سے یہ کہتے: أَخْرِجُوهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ.(۲) ''آل لوط کو اپنی بستی سے باہر نکال دو یہ وہ لوگ ہیں جو بڑے پاک باز بنتے ہیں''۔ گویا یہ ایک طنزیہ جملہ تھا جو ہر وقت ان کی زبانوں پر رہتا تھا، مگر حضرت لوط تو پیغمبر تھے، انھوں نے اپنی نصیحت جاری رکھی، قوم کے لوگ عاجز آکر کہنے لگے: اِئْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ.(۳) ''اگر تم سچے ہو تو ہم پر اللہ کا عذاب لے آؤ''۔ یہ اللہ تعالیٰ کا طریقہ رہا ہے کہ پہلے وہ اپنے پیغمبروں کے ذریعے سرکش اور گمراہ قوموں کو ان سرکشی اور گمراہی سے روکتا ہے، ان کے پاس آسمانی کتابیں اور

(۱) الاعراف: ۸۰/۸۱۔ (۲) الاعراف: ۸۲۔ (۳) العنکبوت: ۲۹۔

صحیفے بھیجتا ہے، جب اس کے رسولوں اور پیغمبروں کی کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں، اور قوم اپنی سرکشی اور گمراہی سے باز نہیں آتی تب اللہ تعالیٰ زمین پر اپنا عذاب بھیجتا ہے، قوم لوط کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا، قرآن کریم میں قوم لوط پر عذاب کا ذکر تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

بستی الٹ دی گئی:

عذاب کی صورت یہ ہوئی کہ آسمان سے چند فرشتے زمین پر اترے، پہلے وہ اس جگہ پہنچے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام قیام پذیر تھے، ایک صبح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین اجنبی لوگوں کو گھومتے ہوئے دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور انھیں مہمان بنا کر اپنے گھر لے آئے، حضرت ابراہیم علیہ السلام بڑے مہمان نواز انسان تھے، ان کے دستر خوان پر کوئی نہ کوئی مہمان ضرور رہتا تھا، یہ تین مہمان گھر میں آئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لیے ایک بچھڑا ذبح کیا اور اس کا گوشت بھون کر ان کے سامنے رکھا، مگر مہمانوں نے کھانے سے انکار کر دیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خیال ہوا کہ یہ دشمن ہیں جو مہمان کی صورت اختیار کر کے گھر میں گھس آئے ہیں، اس خیال کے ساتھ ہی کچھ خوف سا بھی پیدا ہوا جو بہ تقاضائے بشریت انسان کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے، مہمانوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ اضطراب دیکھا تو ہنس کر کہنے لگے کہ ہم انسان نہیں ہیں، ہم تو فرشتے ہیں اور قوم لوط کو تباہ و برباد کرنے کے لیے آسمان سے اتر کر آئے ہیں اور اب سدوم کی طرف جا رہے ہیں، حضرت ابراہیم کو اس بات کا تو اطمینان ہو گیا کہ یہ لوگ دشمن نہیں ہیں مگر یہ سن کر پریشان ہو گئے کہ ان کا ارادہ سدوم کو تباہ کرنے کا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مزاج میں شفقت اور ہمدردی بھی بہت تھی، یہ خبر سن کر انھوں نے فرشتوں سے جھگڑنا شروع کر دیا کہ بھلا تم اس قوم کو کیسے تباہ و برباد کرو گے، ان میں تو لوط موجود ہیں جو اللہ کے نبی ہیں اور پھر وہ میرے بھتیجے بھی ہیں، فرشتوں نے کہا کہ قوم لوط تو اپنی سرکشی اور بے حیائی کی وجہ سے ضرور ہلاک کی جائے گی، البتہ لوط اور ان کے گھر والے اس عذاب سے محفوظ رہیں گے، مگر ان کی بیوی کا حشر تو قوم کے ساتھ ہی ہوگا کیوں کہ وہ نبی کی بیوی ہونے کے باوجود ان کی مخالف ہے اور قوم کے ساتھ ان کی بداعمالیوں میں شریک ہے، وہ

تینوں فرشتے یہاں سے نکل کر سدوم پہنچے، ارض فلسطین اور سدوم میں کچھ زیادہ فاصلہ نہیں ہے، روایات میں تو یہاں تک ہے کہ جب عذاب الٰہی نازل ہوا اور اس بستی سے آگ کے شعلے بلند ہوئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بستی سے اس کا نظارہ کیا، بہ ہر حال فرشتے سدوم پہنچ گئے اور حضرت لوط کے مہمان ہوئے، تینوں نے خوب صورت لڑکوں کی شکل اختیار کر رکھی تھی، حضرت لوط علیہ السلام تین خوب صورت اور نوجوان لڑکوں کو اپنے گھر میں دیکھ کر پریشان ہو گئے کہ اگر میری قوم کو ان کی آمد کا پتہ چل گیا تو وہ ان مہمانوں کے ساتھ غلط طریقے سے ضرور پیش آئیں گے، فرشتوں نے پیغمبر کی پریشانی دیکھی تو اپنے آپ کو ظاہر کر دیا کہ ہم اللہ کی طرف سے آئے ہیں اور ہمارے آنے کا مقصد یہ ہے، عذاب الٰہی کا وقت آ پہنچا ہے، آپ اپنے گھر والوں کے ساتھ یہاں سے تشریف لے جائیں، چنانچہ حضرت لوط سدوم سے روانہ ہو گئے، ان کی بیوی نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا، رات کے آخری حصے میں جب کہ بستی کے لوگ خواب خرگوش میں مست تھے ایک زبردست چیخ بلند ہوئی جس نے اہل سدوم کو بدحواس کر دیا، پھر ان پر پتھروں کی بارش ہوئی اور پوری بستی آسمان کی طرف اٹھا کر نیچے کی طرف پلٹ دی گئی۔

روایات میں ہے کہ یہ چار بڑے شہر تھے جن کو قرآن کریم نے مؤتفکات سے تعبیر کیا ہے، جب عذاب الٰہی کا فیصلہ ہوا تو حضرت جبرائیل نے ان بستیوں کو آسمان پر اٹھا کر اس زور سے زمین پر پٹخا کہ وہ زمین کی سب سے نچلی سطح پر پہنچ گئیں، اور وہاں ایک گہری جھیل بن گئی جو سطح سمندر سے بھی نیچے واقع ہے، اسے بحر میت یا بحر مردار کہا جاتا ہے، اردن کی راجدھانی عمّان سے پچیس کلومیٹر دوری پر واقع یہ جھیل بیاسی کلومیٹر لمبی اور گیارہ کلومیٹر چوڑی ہے، اس کے مغرب میں غزّہ مغربی کنارہ اور اسرائیل اور مشرق میں اردن ہے، یہ دنیا کی نمکین ترین جھیل ہے، اس میں کوئی جانور زندہ نہیں رہتا، اور بھاری پانی ہونے کی بنا پر اس میں کوئی انسان ڈوبتا بھی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے رہتی دنیا تک کے لیے اس علاقے کو مقام عبرت بنا دیا ہے، اگرچہ اس علاقے کے رہنے والوں کے لیے یہ بہترین تفریح گاہ بھی ہے، حضرت لوط علیہ السلام کا مزار مبارک اردن میں ہے۔

حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہما السلام

دو بڑے پیغمبر:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصّے میں یہ بات لکھی گئی ہے کہ ستاسی سال کی عمر میں ان کے کوئی اولاد نہیں تھی، پہلا بیٹا ان کی دوسری اہلیہ حضرت ہاجرہؓ کے بطن سے پیدا ہوا جن کا نام اسماعیل تھا، یہ بھی اللہ کے پیغمبر ہوئے، ان کا قصّہ بھی آپ پڑھ چکے ہیں، حضرت لوط کے واقعات میں ہم نے ذکر کیا ہے کہ جب قوم لوط پر عذاب کا فیصلہ کیا گیا تو تین فرشتے حسین وجمیل لڑکوں کی شکل میں آسمان سے اُترے، حضرت لوط علیہ السلام کی طرف جانے کے بجائے وہ لوگ پہلے فلسطین میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے اور ان کے مہمان بنے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لیے بچھڑا ذبح کیا اور اس کا گوشت بھون کر مہمانوں کے سامنے رکھا لیکن انھوں نے کھانے سے انکار کردیا، بعد میں راز کھلا کہ یہ تو فرشتے ہیں اور اللہ کے حکم سے قوم لوط کی بستیوں کو تباہ کرنے آئے ہیں، اس گفتگو کے دوران حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی بیوی حضرت سارہ بھی موجود تھیں، حضرت ابراہیم اس وقت سو برس کے ہوچکے تھے اور حضرت سارہؓ کی عمر نوے (۹۰) سال کی تھی، فرشتوں نے دونوں میاں بیوی کو بیٹے اسحاق اور پوتے یعقوب کی خوش خبری سنائی، فرشتوں کی یہ بات سن کر حضرت سارہؓ کہنے لگیں! ہائے، کیا میں اس بڑھاپے میں بچہ پیدا کروں گی اور یہ میرے شوہر بھی کوئی جوان آدمی نہیں بلکہ بوڑھے ہیں، فرشتوں نے کہا کیا آپ کو اللہ کے معاملات میں تعجب ہوتا ہے اور پھر آپ کے خاندان پر تو اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہیں، آپ کو تو حیرت ہونی ہی نہیں چاہئے، (سورۂ ہود: ۷۲/۷۳) بہ ہر حال فرشتوں کی خوش خبری کے مطابق حضرت سارہ کے بطن سے ان کے دوسرے بیٹے پیدا ہوئے، نام تو پہلے ہی آسمان پر طے ہوچکا تھا بلکہ ان کے بیٹے کا بھی طے کرکے بتلا دیا گیا تھا، حضرت اسحاق کی شادی حضرت ابراہیم کے بھتیجے کی بیٹی سے ہوئی اور ان کے یہاں دو بیٹے پیدا ہوئے، ایک کا نام عیسو اور دوسرے کا نام یعقوب تھا، عیسو کی شادی

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بیٹی سے ہوئی اور حضرت یعقوب کی اپنے ماموں کی بیٹی سے، قرآن کریم میں یہ تفصیلات نہیں ہیں، البتہ توراۃ میں شادی وغیرہ کا ذکر ملتا ہے، قرآن کریم کی سورۂ ہود، سوۂ مریم، سورۂ انبیاء اور سورۂ الصفت میں ان کا مختصر ذکر ملتا ہے۔

ذبیح اللہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں:

عیسائیوں کا دعوی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے جس بیٹے کی قربانی کی تھی وہ حضرت اسماعیل نہیں ہیں بلکہ حضرت اسحاق ہیں، اس سلسلے میں وہ بائبل کا حوالہ بھی دیتے ہیں، لیکن عیسائیوں کا یہ دعویٰ غلط ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ بائبل میں اتنی تحریفات ہو چکی ہیں کہ اب اس کتاب کو آسمانی کتاب کہنا ہی غلط ہے، پھر عیسائی بائبل کی جس عبارت میں لفظ اسحاق سے استدلال کرتے ہیں اس سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اسماعیل تھا، اسحاق نہیں تھا، کیوں کہ اس میں یہ کہا گیا ہے ''اپنے پیارے اکلوتے بیٹے کی قربانی دو'' اور یہ بات بائبل سے بھی معلوم ہوتی ہے کہ حضرت اسحاق اپنے بڑے بھائی کی پیدائش کے تیرہ برس بعد پیدا ہوئے، گویا تیرہ برس تک حضرت اسماعیل ہی اکلوتے بیٹے تھے، ویسے بھی قرآن کریم میں غور کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ذبیح اللہ حضرت اسماعیل ہی ہیں، کیوں کہ سورہ صفّٰت کی جن آیات میں واقعۂ ذبح مذکور ہے وہاں پورا واقعہ بیان کرنے کے بعد یہ بھی فرمایا گیا کہ ہم نے ابراہیم کو ایک اور بچے کی بشارت دی، گویا اس واقعے کے وقت دوسرا بچہ پیدا ہی نہیں ہوا تھا، دراصل عیسائیوں کا یہ دعوی محض اس لیے ہے کہ بنی اسرائیل کا سلسلہ حضرت اسحاق سے چلا ہے، اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ نسب حضرت اسماعیل سے، اس عصبیت اور حسد نے انھیں بائبل میں تحریف کرنے پر مجبور کیا ہے۔

حضرت یعقوب کی پیدائش:

قرآن کریم پہلے ہی یہ پیشین گوئی کر چکا تھا کہ اسحاق کے یہاں یعقوب پیدا ہوں گے، اگرچہ توراۃ کے مطابق ان کے یہاں دو بیٹے ہوئے ایک عیسو اور دوسرے یعقوب، مگر پیغمبری حضرت یعقوب علیہ السلام کو عطا کی گئی، اس لیے قرآن کریم نے انہی

کے ذکر پر اکتفا کیا ہے، عبرانی زبان میں حضرت یعقوب کا نام اسرائیل ہے یہ لفظ اسرا (عبد) اور ایل (اللہ) سے مل کر بنا ہے، جس کے معنی ہیں عبداللہ، حضرت یعقوب علیہ السلام سے اولاد کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے وہ بنی اسرائیل کہلاتا ہے، قرآن کریم میں بھی ان کی اولاد کے سلسلے کو بنی اسرائیل کے نام سے یاد کیا گیا ہے، قرآن کریم میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا تفصیلی ذکر نہیں ہے، البتہ ان کا نام دس جگہوں پر آیا ہے، سورۂ یوسف میں اس حیثیت سے ان کا ذکر کچھ زیادہ ہے کہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے والد بزرگوار ہیں، حضرت یعقوب بھی اللہ کے برگزیدہ پیغمبروں میں سے ایک ہیں، اہل کنعان کی طرف مبعوث کئے گئے، ان کے بارہ بیٹے تھے، لیکن قرآن کریم میں ان کے نام مذکور نہیں ہیں، سوائے حضرت یوسف علیہ السلام کے، کیوں کہ وہ بھی پیغمبر تھے، اس لیے قرآن کریم نے ان کے واقعات تفصیل سے ذکر کئے ہیں، بلکہ ایک پوری سورت نازل فرمائی ہے، آخیر عمر میں آپ اپنے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس مصر چلے گئے تھے، چوبیس برس تک وہیں رہے، ایک سو ستائیس سال کی عمر میں وفات پائی، فلسطین کی مسجد خلیل میں مدفون ہیں، وہیں ان کے والد حضرت اسحاق اور دادا حضرت ابراہیم علیہما السلام کے مزارات بھی ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام

قرآن کریم میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ:

حضرت یوسف علیہ السلام خود بھی پیغمبر ہیں، ان کے والد حضرت یعقوب علیہ السلام، دادا حضرت اسحاق علیہ السلام اور پردادا حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی پیغمبر تھے، قرآن کریم میں ان کا نام چھبیس مرتبہ لیا گیا ہے، بلکہ ایک پوری سورت ''یوسف'' نازل کی گئی ہے جس میں ان کا قصہ تفصیل کے ساتھ موجود ہے، قرآن کریم نے ان کے قصے کو احسن القصص (قصوں میں سب سے اچھا قصہ) کہا ہے، قرآن پاک میں حضرت یوسف علیہ السلام کے علاوہ کسی دوسرے پیغمبر کا قصہ ایک ہی جگہ تسلسل کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا، اس کی وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ یہودیوں نے بہ طور آزمائش سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم

سے یہ سوال کیا تھا کہ اگر آپ اللہ کے سچے نبی ہیں تو یہ بتلایئے کہ اولادِ یعقوب نے کنعان سے مصر کی طرف کیوں ہجرت کی تھی، اور یوسف کے ساتھ ان کے بھائیوں نے کیا سلوک کیا تھا، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی خبر دی گئی اور آپ نے پورا قصہ سنا دیا، یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کھلا معجزہ تھا اور آپ کی نبوت ورسالت کی کھلی نشانی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی محض تھے اور زندگی بھر آپ مکے میں رہے، نہ آپ نے کوئی کتاب پڑھی اور نہ کسی سے تعلیم حاصل کی، اس کے باوجود آپ نے تمام واقعات اس طرح بتلا دیئے گویا آپ کے سامنے پیش آئے ہوں، جس قدر تفصیل کے ساتھ یہ واقعہ قرآن کریم میں مذکور ہے اتنی تفصیل کے ساتھ انجیل اور تورات میں بھی نہیں ہے۔

قصے کا آغاز یہاں سے ہوتا ہے کہ ایک رات حضرت یوسف علیہ السلام نے جب کہ وہ کم عمر بچے تھے خواب میں دیکھا کہ گیارہ ستارے اور چاند سورج مجھے سجدہ کر رہے ہیں، صبح کو انھوں نے یہ خواب اپنے والد حضرت یعقوب کو سنایا، انھوں نے کہا بیٹے تم اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں کو مت بتلانا ورنہ وہ تمہارے خلاف ہو جائیں گے اور تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے، قرآن کریم نے صرف بھائیوں کا ذکر کیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کئی تھے، البتہ بائبل اور تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام سمیت بارہ بھائی تھے، حضرت یعقوب علیہ السلام کا پہلا نکاح حضرت لیّا بنت لیان سے ہوا، جن سے دس لڑکے پیدا ہوئے، حضرت لیّا کی وفات کے بعد انھوں نے دوسرا نکاح ان کی بہن حضرت راحیل سے کیا جن سے دو بیٹے حضرت یوسف اور بن یامین پیدا ہوئے، اس طرح حضرت یوسف کے حقیقی بھائی صرف بن یامین تھے، باقی علاتی یعنی باپ شریک بھائی تھے، بن یامین کی پیدائش کے وقت حضرت راحیل بھی وفات پا گئیں، ان بارہ میں سے ہر لڑکا صاحب اولاد ہوا، سب کی نسلیں پھیلیں، حضرت یعقوب کا دوسرا نام اسرائیل بھی ہے اس لیے ان بارہ لڑکوں کے خاندان بنی اسرائیل کہلائے۔

بیٹے کا خواب اور باپ کی ہدایت:

حضرت یوسف نے اپنے والد کی ہدایت پر عمل کیا اور اپنا یہ خواب کسی کو نہیں بتلایا،

لیکن بھائیوں میں سے کسی نے باپ بیٹے کی گفتگو سن لی، اس صورت میں یہ کیسے ممکن تھا کہ بات چھپی رہتی، کچھ ہی دیر میں سب بھائیوں کو پتہ چل گیا کہ یوسف نے ایسا خواب دیکھا ہے، بھائی تو پہلے ہی یوسف سے حسد میں مبتلا تھے ایک تو اس لیے کہ بذات خود یوسف علیہ السلام بہت سی خوبیوں کے مالک تھے، حسین وجمیل ہونے کے ساتھ ساتھ عادات واخلاق میں بھی ان کا کوئی ثانی نہیں تھا، دوسرے ان کو والد کی محبت اور شفقت بھی کچھ زیادہ ہی حاصل تھی، اس خواب کے بعد تو بھائیوں کو پورا یقین ہوگیا کہ یوسف میں کچھ خاص بات ضرور ہے، اب والد پہلے سے زیادہ ان پر توجہ دیں گے، سب بھائی سر جوڑ کر بیٹھے، ہر ایک کو یہ احساس تھا کہ ہمارے والد کو یوسف اور بن یامین سے زیادہ محبت ہے، حالانکہ ہم دس ہیں، گھر کا کام کاج بھی زیادہ کرتے ہیں اور والد کا ہاتھ بھی زیادہ بٹاتے ہیں جب کہ یہ دونوں کچھ بھی نہیں کرتے، پتہ نہیں ہمارے والد کو ان دونوں میں کیا خوبی نظر آتی ہے، ہمارے خیال سے تو وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہیں، ان میں سے کسی نے کہا کہ اس طرح ٹسوے بہانے سے کیا فائدہ، اگر تم والد کی توجہ اور ان کی محبت چاہتے ہو تو سب سے پہلے یوسف کو راستے سے ہٹاؤ، میری رائے میں تو یوسف کو قتل کردو تا کہ اس کا قصہ ہی پاک ہوجائے، نہ یوسف رہے گا اور نہ ابا اس سے محبت کریں گے، یہ مشورہ سن کر سب سے بڑے بھائی یہودا نے کہا قتل کرنا تو مناسب نہیں ہے ایسا کرو کہ اسے کسی کنویں میں ڈال دو، وہاں یہ زندہ رہے گا اور کوئی راہ رو مسافر اسے نکال کر اپنے ساتھ لے جائے گا، تمہارا مقصد اس کو راستے سے ہٹانا ہی تو ہے، وہ اس طرح بھی پورا ہوسکتا ہے، یوسف اس وقت زیادہ بڑے نہیں تھے، مفسرین نے لکھا ہے کہ وہ اس وقت نابالغ بچے تھے، اب ان بھائیوں کے سامنے یہ سوال پیدا ہوا کہ اس تدبیر پر کس طرح عمل کیا جائے، ظاہر ہے اس کے لیے ہمیں گھر سے باہر بلکہ شہر سے دور جا کر کنواں تلاش کرنا ہوگا اور اس میں یوسف کو ڈالنا ہوگا، ابا کو یوسف کی جدائی کہاں گوارا ہوگی اور وہ اسے ہمارے ساتھ کب جانے دیں گے؟ کوشش تو ان کو کرنی ہی تھی، چنانچہ وہ سب اکٹھے ہوکر حضرت یعقوب علیہ السلام کی خدمت میں پہنچے اور نہایت ادب سے عرض گزار ہوئے، ابا جان! آپ یوسف کے سلسلے میں ہم پر بھروسہ نہیں کرتے حالانکہ ہم اس کے بھائی ہونے کی حیثیت سے ہمدرد بھی ہیں اور خیر خواہ

بھی، ہم چاہتے ہیں کہ یوسف سیر وتفریح کے لیے ہمارے ساتھ جائے، کھیلے کودے، کھائے پیئے، آپ اطمینان رکھیں ہم اس کی پوری حفاظت کریں گے، درخواست کے اسلوب سے پتہ چلتا ہے کہ بھائیوں نے پہلے بھی اس طرح کی گزارش کی ہوگی اور والد نے ان کی گزارش رد کردی ہوگی، حضرت یعقوب علیہ السلام نے جواب میں فرمایا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے یوسف کی جدائی گوارا نہیں ہے چاہے وہ تھوڑی دیر کے لیے ہو، دوسری بات یہ ہے کہ تم تو سب کھیلنے کودنے اور بھاگنے دوڑنے میں مست رہو گے، یوسف بچہ ہے، ایسا نہ ہو کہ اسے کوئی بھیڑیا کھا جائے، کہتے ہیں کہ اس وقت کنعان کے اطراف میں بھیڑیوں کی کثرت تھی، بھائیوں نے عرض کیا ابا جان! یہ کیسے ہوسکتا ہے، ہم ہٹے کٹے جوان ہیں، بھلا ہمارے ہوتے ہوئے یوسف کو بھیڑیا کیسے کھا سکتا ہے۔

بھائیوں کا اصرار:

بھائیوں کے سامنے حضرت یعقوب کی ایک نہ چلی اور انھیں مجبوراً یوسف کو ساتھ لے جانے کی اجازت دینی پڑی، مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو پورا یقین تھا کہ ان کے یہ بیٹے یوسف سے جلتے ہیں اور حسد کرتے ہیں مگر وہ انکار کرکے ان کے جذبۂ حسد کو بڑھانا نہیں چاہتے تھے، انھوں نے اس وقت یہی بہتر سمجھا کہ یوسف کو ان کے ساتھ بھیج دیں شاید اس کے ساتھ گھوم پھر کر ان کے دل میں اس کے لیے کچھ محبت اور شفقت پیدا ہوجائے، انھوں نے بادل ناخواستہ ہی سہی بیٹوں کو اجازت دیدی، ساتھ ہی ان سے یہ عہد بھی لیا کہ تم سب اس کی پوری طرح حفاظت کروگے، بڑے بھائی یہودا کو خاص طور پر ہدایت فرمائی کہ اس کا ہر طرح خیال رکھنا اور جلدی واپس آجانا، اجازت ملتے ہی سارے بھائی خوش ہوگئے، ایک بھائی نے والد کے سامنے ہی یوسف کو اپنے کاندھوں پر اٹھالیا تاکہ انھیں یقین ہوجائے کہ وہ یوسف سے کتنی محبت کرتے ہیں۔

گھر سے روانگی کے بعد کیا واقعات پیش آئے، اس سلسلے میں قرآن کریم تو خاموش ہے، البتہ تفسیر قرطبی میں تاریخی روایات کے حوالے سے کچھ واقعات ذکر کیے گئے ہیں، مثلاً یہ کہ گھر سے نکلتے ہی اس بھائی نے جس نے یوسف کو اپنے کاندھوں پر بٹھایا

تھا انھیں زمین پر پٹخ دیا، یوسف بچے تھے، ان کے لیے پیدل چلنا مشکل تھا، انھوں نے ایک ایک کر کے تمام بھائیوں سے گزارش کی وہ انھیں گود میں اٹھالیں، مگر کسی کو رحم نہیں آیا، آخر میں انھوں نے بڑے بھائی یہودا سے کہا کہ آپ تو مجھ پر رحم کریں، آپ بڑے بھی ہیں اور آپ نے ابا جان سے وعدہ بھی کیا تھا، اس پر یہودا کو رحم آیا اور اس نے یوسف کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شفقت سے کہا کہ جب تک میں زندہ ہوں تمھیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی، اس کے بعد بھائیوں سے کہا کہ قتل ایک بڑا گناہ ہے، اور وہ بھی اپنے معصوم بھائی کا، بھائیو! اللہ سے ڈرو، اور یوسف کو والد کے پاس واپس لے کر چلو، البتہ اس سے یہ وعدہ لے لو کہ وہ گھر پہنچ کر تمھاری کوئی شکایت نہیں کرے گا، مگر ان کے سر پر خون سوار تھا، حسد نے ان کو اندھا کر دیا تھا، انھیں انجام کا بھی کوئی خوف نہیں تھا، سب بھائیوں نے ایک زبان ہو کر یہودا سے کہا: ایسا لگتا ہے تم باپ کے دل میں اپنے لیے کچھ زیادہ ہی جگہ بنانا چاہتے ہو، اگر تم نے ہمیں ہمارے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی تو ہم تمھیں بھی قتل کر دیں گے، یہودا نے دل میں سوچا کہ ان نو کے مقابلے میں تنہا میں کچھ نہیں کر سکتا، اور اس صورت میں جب کہ وہ مجھے بھی قتل کی دھمکی دے رہے ہیں، یہی بہتر ہے کہ میں ان کی ہاں میں ہاں ملاتا رہوں، اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں انھیں کرنے دوں، یہ سوچ کر اس نے بھائیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے، البتہ آخری کوشش کے طور پر اس نے یہ ضرور کہا کہ میرا مشورہ مانو تو اسے قتل کر کے گناہ سے اپنے ہاتھ آلودہ نہ کرو، قریب میں ایک پرانا کنواں ہے اسے وہاں لے جا کر ڈال دو، ہو سکتا ہے کوئی سانپ وغیرہ اسے ڈس لے، اس طرح تمھاری مراد بھی حاصل ہو جائے گی، اور تم اس کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کرنے سے بھی بچ جاؤ گے، یہ بھی ہو سکتا ہے یوسف زندہ رہے اور کوئی قافلہ اسے وہاں سے نکال کر اپنے ساتھ لے جائے اس صورت میں بھی تمھارا مقصد پورا ہوئے گا۔

بھائی دشمن بن گئے:

یہودا کی اس رائے پر تمام بھائی متفق ہو گئے اور انھیں کنویں کی طرف لے کر چلے، یوسف اپنے بھائیوں کے ارادے سے بے خبر نہ تھے، مگر وہ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے، ایک تو

یہ کہ وہ نہایت کمسن بچے تھے، دوسرے یہ کہ جوان بھی ہوتے تو دس کا مقابلہ کیسے کرتے، اس لیے بوجھل قدموں سے وہ بھائیوں کے پیچھے پیچھے اس غیر آباد کنویں کی طرف بڑھتے رہے، تصور کیا جاسکتا ہے اس وقت یوسف کے رنج وغم کی کیا کیفیت ہوگی اور ان کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی، ٹھیک اسی وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی کہ یوسف! ایک دن ایسا آئے گا کہ تم اپنے بھائیوں کو بتلاؤگے کہ کیا واقعہ پیش آیا تھا، اور انھوں نے تمہارے ساتھ کیا کیا تھا، اب تو وہ نادانی اور حماقت میں جو کچھ کررہے ہیں انھیں کرنے دو، جلدی ہی تم ان کو ان کی حرکتوں کی خبر دینے والے ہو، وحی کے ذریعے یوسف کو اتنا معلوم ہوگیا کہ وہ زندہ رہیں گے، اور بھائی جیسا چاہتے ہیں ویسا نہیں ہوگا، اس پیغام الٰہی نے حضرت یوسف کے دل میں امید بھی جگائی اور انھیں حوصلہ بھی دیا۔

بہرحال بھائیوں نے پوری سنگ دلی کا ثبوت دیا اور ایک معصوم بچّے کو محض اپنے جذبۂ حسد کی تسکین کی خاطر کنویں میں ڈال دیا، مفسّرین نے لکھا ہے کہ جب برادران یوسف ان کو کنویں میں ڈالنے لگے تو وہ کنویں کی من سے چمٹ گئے اور انھوں نے بھائیوں سے رحم کی درخواست بھی کی، مگر ان کو رحم نہ آیا، بلکہ ان کے ہاتھ باندھ دئے تاکہ وہ کنویں میں ڈالے جانے کے وقت مزاحمت نہ کرسکیں، اور کہنے لگے کہ اپنی مدد کے لیے انہی چاند سورج اور ستاروں کو پکارو جو تمھیں سجدہ کررہے تھے، یہ کہہ کر انھیں ڈول میں بٹھا کر رسّی کی مدد سے کنویں میں لٹکا دیا، جب ڈول پانی کے قریب پہنچ گیا تو اُن سنگ دل بھائیوں نے رسّی کاٹ دی، ڈول نیچے گر پڑا، یوسف پانی میں گرے تھے اس لیے چوٹ نہیں آئی، پانی سے نکل کر کسی طرح ایک چٹان پر بیٹھ گئے جو کنویں میں کسی جگہ ابھری ہوئی تھی، روایات میں یہ بھی ہے کہ جب یوسف علیہ السلام کنویں میں گرنے لگے تو جبرئیل علیہ السلام نے انھیں سنبھال لیا اور ایک چٹان پر بٹھادیا، اس کنویں میں حضرت یوسف تین دن تک رہے، اس دوران بڑے بھائی جن کے دل میں اپنے ننھے سوتیلے بھائی کے لیے کچھ ہمدردی تھی کھانا پانی لاتے رہے اور ڈول سے لٹکا کر ان کو پہنچاتے رہے، یوسف کو کنویں میں ڈال کر دس کے دسوں بھائی روتے پیٹتے گھر پہنچے، اور ابّا سے کہنے لگے کہ ابّا جان آپ ہمارا یقین نہیں کریں گے، ہم آپ کو کتنا بھی یقین دلادیں آپ یہی فرمائیں گے کہ ہم جھوٹ بول

رہے ہیں، سچی بات یہ ہے کہ ہم دوڑ لگا کر ایک دوسرے سے آگے نکلنے میں لگے ہوئے تھے اور یوسف ہمارے سامان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک بھیڑیا آیا اور ان کو اٹھا کر لے گیا، یہ مکار بھائی اپنے ساتھ یوسف کا کرتا بھی لے کر آئے تھے جس پر کسی جانور کا خون لگا ہوا تھا، وہ کرتا دکھا کر کہنے لگے یقین نہ آئے تو یوسف کا یہ کرتا دیکھ لیجیے اس پر ان کا خون لگا ہوا، خیال کیجیے حضرت یعقوب کا کیا حال ہوا ہوگا، وہی ہوا جس کا خدشہ تھا، مگر پیغمبرانہ شان کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اس حادثے پر صبر کرتے، سوانھوں نے یہی کیا اور کہا تم جھوٹ بول رہے ہو، واقعہ یہ ہوا ہی نہیں، مگر جو کچھ ہوا میں اس پر صبر کرتا ہوں اور جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس پر اللہ سے مدد کا طلب گار ہوں۔

اللہ کی نصرت:

دوسری طرف جب حضرت یوسف کو کنویں میں پڑے پڑے تین دن گزر گئے تو خوش قسمتی سے ایک قافلے کا ہراول دستہ کنویں کی طرف آنکلا، یہ قافلہ کچھ سامان تجارت لے کر شام سے مصر جا رہا تھا، ادھر سے گزرا تو قافلے کے ذمہ داروں نے اپنے کچھ لوگوں کو پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھیجا تو ان کی نظر اس غیر آباد کنویں پر پڑی، قریب پہنچے، پانی لینے کے لیے کنویں میں ڈول ڈالا تو واپسی میں ایک بچے کو ڈول میں بیٹھا ہوا دیکھ کر وہ جوش اور خوشی سے چیخ پڑے، قافلہ سالار کے پاس دوڑے ہوئے گئے اور کہنے لگے آپ کے لیے خوش خبری ہے، ہمیں ایک غلام ہاتھ لگا ہے، اس طرح اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو بہ حفاظت کنویں سے نکال لیا، قافلے والوں نے اس خیال سے کہ آس پاس کے علاقے کا کوئی شخص اس بچے کو دیکھ کر ہم سے اس کی واپسی کا مطالبہ نہ کرنے لگے یوسف کو ایک قیمتی سامان کی طرح چھپالیا، ارادہ یہی تھا کہ اسے مصر کے بازار میں لے جا کر فروخت کردیں گے اور کیوں کہ یوسف حسین وجمیل تھے، اور ہونہار بھی تھے اس لیے قافلے والوں کو پورا یقین تھا کہ مصر کے بازار میں اس غلام کی اچھی قیمت مل جائے گی، قافلے والوں نے یوسف کو بازار مصر میں مال تجارت کی طرح پیش کردیا، اتفاق سے مصر کے شاہی خاندان کا ایک فرد اور ملکی افواج کا سربراہ فوطیفار کسی ضرورت سے بازار میں آیا، اس کی نظر یوسف پر پڑی، بھاؤ تاؤ ہوا، قافلے والوں نے بہت تھوڑے پیسوں میں بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ

چالیس درہم سے بھی کم میں اس افسر کے ہاتھ یوسف کو فروخت کر دیا، مشہور مفسر حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ جس شخص نے یوسف علیہ السلام کو خرید اتھا وہ کوئی عام آدمی نہیں تھا بلکہ مصر کا وزیر خزانہ تھا، بادشاہ مصر اس زمانے میں قوم عمالقہ کا ایک فرد ایان ابن رسید تھا، مفسرین کہتے ہیں کہ چند دراہم میں یوسف بیچ دئے گئے، ایسا نہیں ہے جس وقت فروخت کے لیے ان کو بازار میں پیش کیا گیا تو دیکھنے اور خریدنے والوں کی بھیڑ لگ گئی، اتنا حسین اور خوب صورت چہرہ انھوں نے پہلی بار دیکھا تھا، حدیث شریف میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک نقل کیا گیا ہے کہ معراج کی شب میں یوسف سے ملا تو دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے پورے عالم کے حسن و جمال میں سے آدھا حسن ان کو عطا فرمایا ہے اور باقی آدھا ساری دنیا کے لوگوں کو ملا ہے، ایسی صورت میں یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ ان کی قیمت اس قدر کم لگتی اور انھیں کوڑیوں کے مول فروخت کیا جاتا، قرآن کریم میں جو معدودے چند دراہم میں فروخت کرنے کا ذکر ہے یا تو اس کا تعلق برادران یوسف سے ہے کہ انھیں جب قافلے کی اطلاع ملی تو انھوں نے آکر یوسف کو چند درہم میں فروخت کر دیا یا یہ مطلب ہے کہ بازار مصر میں ان کی جو قیمت لگی اور جس قیمت پر ان کو خریدا یا بیچا گیا وہ کتنی بھی بڑی قیمت تھی لیکن یوسف کے حسن و جمال اور کمالات کے مقابلے میں وہ قیمت نہایت حقیر تھی، بہ ہر حال مفسرین نے لکھا ہے کہ خریدار اُن کو دیکھ کر ٹوٹ پڑے، ہر شخص نے اپنی ہمت اور وسعت کے بہ قدر ان کی قیمت لگائی، یہاں تک کہ ان کے وزن کے برابر سونے، مشک اور ریشمی کپڑوں کی قیمت بھی لگی لیکن مصر کے رئیس، فوجی سربراہ اور وزیر خزانہ نے یہ سب چیزیں بلکہ ان سے بھی زائد ادا کر کے یوسف کو خرید لیا، اس طرح اللہ تعالیٰ نے مصر کے سب سے زیادہ عزت دار شخص کو یہ سعادت عطا کی وہ یوسف کو اپنے گھر لے جائے، قرآن کریم نے اس شخص کے لیے عزیز مصر کا لفظ استعمال کیا ہے جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ خریدار کوئی معمولی شخص نہیں تھا۔

کنویں سے محل تک:

عزیز مصر یوسف کو خرید کر اپنے گھر لے گئے اور اپنی بیوی راعیل سے بعض لوگوں

نے اُس کا نام زلیخا بھی بتلایا ہے کہا کہ اس لڑکے کو اچھی طرح رکھنا، یہ عام غلام نہیں ہے، اس کے ساتھ عزت واحترام والا معاملہ ہونا چاہئے، ہوسکتا ہے اس کی ذات سے ہمیں فائدہ پہنچے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہم اسے اپنا بیٹا بنالیں، اس طرح یوسف کو ایک اچھا گھرانہ مل گیا، جہاں انھوں نے گھر کے ایک بچے کی طرح پرورش پائی، لیکن عزیز مصر کی بیوی کے ارادے تو کچھ اور ہی تھے، کنویں میں ڈالے جانے اور والد سے جدا ہوکر مصر میں آجانے کے بعد اب حضرت یوسف علیہ السلام کی آزمائش کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے، جیسا کہ بتلایا جاچکا ہے کہ حسن وجمال میں یوسف کا کوئی ہمسر نہ تھا، جوانی کی دہلیز پر پہنچے تو یہ حسن اور نکھر گیا، عزیز مصر کی بیوی ان کی جوانی اور خوب صورتی دیکھ کر اپنے دل پر قابو نہ رکھ سکی، وہ چاہتی تھی کہ ان سے اپنا مطلب نکالے اس ارادے سے اس نے یوسف کو اپنے کمرے میں بلایا اور باہر کے تمام دروازے بند کردئے، اور کہنے لگی آؤ میرے پاس آؤ، یوسف علیہ السلام نے اس پیش کش پر پہلے تو اللہ کی پناہ مانگی، دراصل اللہ ہی کی مدد اور توفیق سے آدمی گناہوں سے محفوظ رہتا ہے، اس کے بعد اس خاتون سے کہا کہ عزیز مصر نے مجھے پناہ دی، اچھا ٹھکانہ دیا، اس نے میری بہترین پرورش کی اور میں اس کی بیوی کے ساتھ ایسا غلط کام کروں، یہ تو بڑے ظلم کی بات ہوگی اور ظلم کرنے والے فلاح نہیں پاتے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے یہ کہا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنا اچھا ٹھکانہ دیا، میں اس کی نافرمانی کرکے ایسے گناہ میں کیسے مبتلا ہوسکتا ہوں یہ تو سراسر ظلم ہوگا، یوسف علیہ السلام کی مراد کچھ بھی رہی ہو مگر انھوں نے خود کو بچائے رکھا، زلیخا نے بہت چاہا، منت خوشامد بھی کی، ڈرایا دھمکایا بھی، لالچ بھی دیا لیکن وہ اپنی جگہ ثابت قدم رہے، جب زلیخا کا اصرار بڑھا اور یوسف علیہ السلام کے سامنے کوئی راستہ باقی نہ بچا تو وہ خلوت گاہ سے دروازے کی طرف بھاگے، عزیز مصر کی بیوی ان کے پیچھے دوڑی، یہاں تک کہ پیچھے سے ان کا کرتا پکڑ لیا جو پھٹ کر اس کے ہاتھ میں بھی آگیا لیکن حضرت یوسف دوڑ کر دروازے پر پہنچ گئے، حالانکہ اس پر تالا تھا جو یوسف علیہ السلام کے پہنچتے ہی خود بہ خود کھل گیا، بعض روایات میں سات دروازوں کا ذکر ہے جو سب کے سب کھلتے چلے گئے، آخری دروازے سے باہر نکلے تو عزیز مصر وہاں موجود تھا۔

عزیزِ مصر کی ملکہ:

دروازے کے باہر اپنے شوہر کو کھڑا دیکھ کر عورت سٹپٹا گئی، اس سے پہلے یوسف کچھ کہتے اس نے کہنا شروع کر دیا کہ اس شخص کی کیا سزا ہے جو تمہاری بیوی کے ساتھ برائی کا ارادہ رکھتا ہے، ایسے شخص کو یا تو قید کر دیا جائے یا کسی دردناک عذاب میں مبتلا کیا جائے، یوسف نے اپنی صفائی میں کہا میری کوئی خطا نہیں، اسی نے مجھے ورغلانے کی کوشش کی تھی، جب دونوں اپنی اپنی صفائی پیش کرنے لگے تو اسی عورت کے گھر کے ایک شیر خوار بچے نے فیصلہ کر دیا کہ یہ دیکھ لو یوسف کی قمیص کدھر سے پھٹی ہوئی ہے، اگر وہ سامنے سے پھٹی ہے تو عورت سچی ہے اور یوسف جھوٹ بول رہے ہیں اور اگر یوسف کے پیچھے سے پھٹی ہے تو یوسف سچے ہیں، عورت جھوٹ بول رہی ہے قمیص دیکھی گئی تو وہ پیچھے سے چاک تھی اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت اقدام کر رہی تھی، اور یوسف مدافعت کرتے ہوئے بھاگ رہے تھے، یوسف کی صداقت کا ثبوت تو مل گیا، اور عزیزِ مصر نے اپنی بیوی کو ڈانٹا ڈپٹا بھی بہت، یہاں تک کہا کہ تم عورتیں ہوتی ہی مکار ہو، تمہارا مکر و فریب بڑھا ہوا ہے، عزیزِ مصر سمجھ گیا تھا کہ غلطی سراسر اس کی بیوی کی ہے، یوسف بالکل بے قصور ہیں، مگر کیوں کہ عزیزِ مصر کو اپنے گھرانے کی عزت زیادہ عزیز تھی وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ بات باہر جائے اور اس کی عزت سر بازار نیلام ہو، اس لیے اس نے یوسف سے گزارش کی کہ میری بیوی کی غلطی سے درگزر کرو، اور اس بات کو یہیں ختم کر دو، بیوی سے کہا کہ وہ اس غلطی کی معافی مانگے، اس طرح عزیزِ مصر نے اپنی دانست میں یہ سمجھ لیا کہ اب بات ختم ہو چکی ہے، لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں لوگوں کو اس واقعے کی بھنک لگ ہی گئی، ہوتے ہوتے بات شہر کی خواتین تک پہنچ گئی، اور وہ کہنے لگیں کہ عزیزِ مصر کی بیوی اپنے ہی غلام پر ڈورے ڈال رہی ہے، وہ تو اس کے عشق میں پاگل ہو گئی ہے، ہمارا خیال تو یہ ہے کہ وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہے، عزیزِ مصر کی بیوی تک شہر کی خواتین کے یہ تبصرے پہنچے تو اس نے کوئی جواب دینے کے بجائے انھیں اپنے محل میں بلا بھیجا، ان کے لیے دعوت کا خصوصی اہتمام کیا گیا، میزیں لگائی گئیں، اور پھلوں کے ساتھ چھری کانٹے بھی رکھے گئے، جب تمام انتظامات

مکمل ہوگئے اور تمام مدعو خواتین اپنی نشستوں پر آکر بیٹھ گئیں تو ان سے کہا گیا کہ تمام خواتین اپنی اپنی چھری لیں اور پھل تراشیں، دوسری طرف یوسف سے جو ابھی محل ہی میں تھے کہا گیا کہ ذرا اپنے کمرے سے نکلیں اور ان عورتوں کے سامنے سے گزر جائیں، مہمان خواتین چاقو اٹھا کر پھل تراش ہی رہی تھیں کہ یوسف سامنے سے نکل آئے، ان کے دیدار نے خواتین کو کچھ ایسا بے خود اور محو حیرت کیا کہ انھوں نے بجائے پھل تراشنے کے اپنی انگلیاں کاٹ لیں، اور کہنے لگیں خدا کی قسم! یہ انسان نہیں ہیں، اتنا حسین و جمیل انسان ہو ہی نہیں سکتا، یہ تو کوئی فرشتہ ہے، مفسرین نے لکھا ہے کہ عورتوں نے یوسف کے حسن و جمال کی تعریف بھی کی ہے اور فرشتہ کہہ کر ان کی پاک دامنی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، جب عورتیں بے خودی کے عالم میں اپنے ہاتھ زخمی کر بیٹھیں تب عزیز مصر کی بیوی نے کہا یہ ہے وہ شخص جس کے حوالے سے تم مجھ پر لعنت ملامت کر رہی ہو، یقیناً میں نے اسے گناہ پر آمادہ کرنا چاہا تھا لیکن وہ پاک دامن رہا، مگر میں اب بھی اس سے وہی چاہتی ہوں، اگر اس نے میرا حکم نہ مانا تو اسے جیل میں ڈلوادوں گی یا وہ ذلیل ورسوا ہوگا۔

بیگماتِ مصر بھی فریفتہ:

ابھی تک عزیز مصر کی بیوی ہی حسن یوسف پر فریفتہ تھی اور انھیں دعوت گناہ دے رہی تھی، اس ضیافت سے شہر کی دوسری معزز خواتین بھی اس صف میں آکر کھڑی ہوگئیں، لیکن اللہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ثابت قدم رکھا، نہ ان پر دھمکی کا کوئی اثر ہوا، نہ وہ لالچ کا شکار ہوئے نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا تھا اور جس کی دھمکی عزیز مصر کی بیوی نے دی تھی کہ اگر یوسف نے میری بات نہ مانی تو میں اسے جیل میں ڈلوادوں گی، یوسف نے بھی اپنے رب کی بارگاہ میں یہ دُعا کیا کہ اے میرے رب! جس چیز کی طرف یہ عورتیں مجھے بلا رہی ہیں اس کے مقابلے میں قید خانہ مجھے زیادہ پسند ہے، اللہ نے یوسف کی دُعا اس طرح قبول کی کہ عزیز مصر کے دل میں ڈال دیا کہ وہ یوسف کو قید خانے میں ڈلوادے، حالاں کہ وہ جانتا تھا کہ یوسف بے قصور ہیں، بے گناہ ہیں، ساری غلطی اس کی بیوی کی ہے، لیکن معاشرے میں اپنی جھوٹی شان برقرار رکھنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ یوسف کو سزا ملے،

تا کہ جو لوگ اس کی بیوی پر انگلی اٹھا رہے ہیں ان کی زبانوں پر تالے لگ جائیں اور ان تک یہ پیغام پہنچ جائے کہ غلطی دراصل یوسف کی ہے، انھوں نے ہی دست درازی کی کوشش کی تھی، ویسے بھی شہر میں اس حوالے سے جو کچھ باتیں ہو رہی ہیں ان کا سلسلہ بھی اس سزا سے رک سکتا ہے، کچھ دن لوگ بولیں گے، پھر چپ ہو جائیں گے، آہستہ آہستہ یہ واقعہ لوگوں کے ذہنوں سے محو ہو جائے گا۔

قید خانے کی سرگزشت:

حضرت یوسف علیہ السلام داخل زنداں کر دئے گئے، مگر کیوں کہ وہ پیغمبر تھے اور ہر پیغمبر کا پہلا کام دعوتِ دین ہے قید خانے میں پہنچتے ہی انھوں نے اپنا فرضِ منصبی ادا کرنا شروع کر دیا، ایک دن جیل میں بند لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اے جیل کے ساتھیو! یہ بتلاؤ کہ الگ الگ خدا بہتر ہیں یا ایک خدا کا ہونا بہتر ہے جو سب پر غالب ہے، اللہ کو چھوڑ کر تم جس کی عبادت کرتے ہو وہ فرضی نام ہیں، ان کی کوئی حقیقت نہیں، نہ ان کا کہیں وجود ہے، یہ نام بھی تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ چھوڑے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس پر کوئی دلیل نہیں بھیجی ہے، سچ بات تو یہ ہے کہ حکومت اور بادشاہت تو اللہ ہی کی ہے، تم صرف اس کی عبادت کرو، اصل دین یہی ہے اکثر لوگ اس حقیقت سے ناواقف ہیں، جیل خانے میں داخل ہونے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام سے دو ایسے لوگوں نے ملاقات کی جنھوں نے خواب دیکھا تھا، اور اب وہ اس کی تعبیر معلوم کرنا چاہتے تھے، ان میں سے ایک شاہی ساقی تھا اور دوسرا شاہی باورچی خانے کا نگراں اور منتظم، حضرت یوسف علیہ السلام کا آغاز خواب ہی سے ہوا تھا، بعد میں جب حضرت یوسف علیہ السلام کو نبوت کے منصب پر فائز کیا گیا تو انھیں خوابوں کے علم سے بھی نوازا گیا، اور اب قید خانے میں اس علم سے کام لینے کا وقت آ گیا تھا۔

بادشاہ کا خواب:

یہ دونوں قیدی اس الزام میں قید کئے گئے تھے کہ ان دونوں نے بادشاہ کے کھانے میں زہر ملانے کی کوشش کی تھی، ابھی ان کا معاملہ تفتیش وتحقیق کے مرحلے میں تھا اس لیے

ان کو جیل میں رکھا گیا تھا، ایک دن یہ دونوں حضرت یوسف علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے، ایک نے عرض کیا کہ میں نے یہ خواب دیکھا ہے کہ میں شراب بنانے کے لیے انگور نچوڑ رہا ہوں، دوسرے نے عرض کیا کہ میں نے یہ دیکھا ہے کہ میرے سر پہ روٹیوں کا خوان رکھا ہوا ہے اوراس میں سے پرندے نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں، یہ دونوں قیدی اپنے اپنے خواب کی تعبیر معلوم کرنا چاہتے تھے، جواب میں پہلے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے تبلیغ ودعوت کا پیغمبرانہ کام شروع کیا، اس کے بعد فرمایا کہ اس سے پہلے کہ تمہارا کھانا آئے میں تمہیں خوابوں کی تعبیر بتلا دوں گا، اس لیے نہیں کہ میں کوئی کاہن یا نجومی ہوں بلکہ میرا رب مجھے اس کا علم دیتا ہے اور میں تمہیں بتلا دیتا ہوں، قیدی ساتھیو! تم میں سے ایک تو رہا ہو جائے گا اور وہ اپنے آقا کو شراب پلائے گا گویا رہا ہو کر اپنی ملازمت پر بحال ہو جائے گا اور دوسرے کو سزائے موت دی جائے گی، پرندے اس کا گوشت نوچ نوچ کر کھائیں گے، حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا کہ میں نے جو کچھ تم کو بتایا ہے وہ کوئی ظن وتخمین کی بات نہیں ہے، بلکہ یہ خدائی فیصلہ ہے جو نافذ ہو کر رہے گا، اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے اس شخص سے جس کے متعلق رہائی کی خبر دی تھی فرمایا کہ جب تم رہا ہو کر دربار شاہی میں پہنچو اور اپنی ملازمت پر بحال ہو جاؤ تو اپنے بادشاہ سے میرا ذکر کر دینا کہ فلاں شخص کو بلا قصور ہی جیل میں ڈال دیا گیا ہے، جب وہ شخص رہا ہو کر چلا گیا تو اسے رہائی کی خوشی اور کام کے جھمیلوں میں یہ یاد ہی نہیں رہا کہ یوسف علیہ السلام نے اس سے کیا کہا تھا، اسی طرح چند سال گزر گئے، حضرت یوسف قید خانے ہی میں رہے، ایک دن بادشاہ مصر نے خواب دیکھا کہ سات موٹی گائیں ہیں اور سات دبلی اور کمزور، دبلی گایوں نے موٹی گایوں کو نگل لیا ہے نیز گندم کے سات سبز وشاداب خوشے ہیں اور سات خشک ہیں، خشک خوشوں نے شاداب خوشوں کو کھا لیا ہے، صبح کو بادشاہ نے نجومیوں اور کاہنوں کو دربار میں بلا کر اپنا خواب سنایا اوران سے تعبیر بتلانے کو کہا، کسی کے کچھ سمجھ میں نہ آیا، عاجز آکر سب نے کہا کہ یہ خواب نہیں، منتشر خیالات کا مجموعہ ہے اور ہم حقیقی خواب کی تعبیر بیان کرتے ہیں، اس طرح کے منتشر خیالات ہمارے دائرۂ علم میں نہیں آتے، اس قیدی نے جو رہا ہو کر دربار شاہی میں ساقی کے فرائض انجام دے رہا تھا بادشاہ کا خواب سنا

تو اسے حضرت یوسف علیہ السلام یاد آ گئے، اس نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں اس کی تعبیر معلوم کر کے بتلا سکتا ہوں، فلاں قید خانے میں ایک بے گناہ شخص قید ہے وہ خوابوں کی تعبیر کا فن جانتا ہے، اگر اجازت ہو تو میں اس سے جا کر معلوم کروں، بادشاہ نے اجازت دے دی، چنانچہ وہ شخص حضرت یوسف علیہ السلام کی خدمت میں پہنچا اور ان کو خواب سنا کر تعبیر پوچھی، حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ سات موٹی گایوں اور سات سرسبز و شاداب خوشوں سے مراد وہ سات سال ہیں جن میں خوب پیداوار ہوگی، سات دبلی گایوں اور سات خشک خوشوں سے یہ مراد ہے کہ اس کے بعد سات سال تک سخت قحط سالی ہوگی، موٹی گائیں دبلی گایوں کو کھا رہی ہیں اور ہرے بھرے خوشے خشک خوشوں کو کھا رہے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ جو گندم وغیرہ تم نے خوش حالی کے سات سالوں میں جمع کیا تھا قحط سالی کے سات سالوں میں وہ سب ختم ہو جائے گا، اس کے بعد تم دوبارہ خوش حالی دیکھو گے، اس سال بارشیں ہوں گی اور تم لوگ رس نچوڑو گے، یعنی غلّے اور پھلوں کی پیداوار خوب ہوگی۔

قید سے رہائی:

بادشاہ نے خواب کی یہ تعبیر سن کر اپنے نوکر سے کہا کہ اس شخص کو تو دربار میں میرے پاس لے کر آؤ، حضرت یوسف علیہ السلام تک جب رہائی اور دربار میں رسائی کا یہ پیغام پہنچا تو انھوں نے بڑا حکیمانہ فیصلہ کیا، بہ جائے اس کے کہ وہ اس بلاوے پر فوراً چل پڑتے انھوں نے پہلے اپنی بے گناہی اور براءت کے اظہار کا معاملہ اٹھایا، اگر وہ قید خانے سے رہا ہو کر دربار میں پہنچ جاتے تو معاملہ اپنی جگہ باقی رہتا، لوگ سمجھتے کہ بادشاہ کی عنایت سے رہا ہو کر آئے ہیں، بری ہو کر نہیں آئے، اس لیے انھوں نے قاصد سے کہا کہ پہلے تم اپنے مالک کے پاس جاؤ اور اس سے یہ معلوم کرو کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے، میرا رب تو ان کے مکر و فریب سے اچھی طرح واقف ہے، تم بھی اس واقعے کو ان کا مکر گردانتے ہو یا مجھے قصوروار سمجھتے ہو، بہ ہر حال یہ حضرت یوسف کا بے مثال صبر و تحمل تھا کہ اتنے سال جیل میں رہنے کے باوجود انھوں نے پہلے اپنا معاملہ صاف کرنا چاہا، اس سے پہلے جیل سے باہر آنے سے انکار کر دیا، صحیح بخاری میں ہے کہ ایک مرتبہ

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت یوسف علیہ السلام کی قید و بند کے واقعے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ”اگر میں اتنی مدت جیل میں رہتا جتنی مدت یوسف علیہ السلام رہے ہیں اور پھر مجھے رہائی کا حکم نامہ ملتا تو میں فوراً قبول کر لیتا“ بادشاہ نے تحقیق کا حکم دیا، ان عورتوں سے پوچھ گچھ ہوئی جنھوں نے اپنی انگلیاں کاٹ لیں تھی، سب بہ یک زبان ہو کر کہنے لگیں کہ حاشا اللہ! ہمیں تو یوسف میں کوئی خرابی کوئی برائی نظر نہیں آئی یعنی وہ پاک دامن ہیں، ہماری ہی نیت میں کھوٹ تھا، ہم ہی انھیں ورغلا رہے تھے اور گناہ پر آمادہ کر رہے تھے، عزیز مصر کی بیوی بھی کہنے لگی اب حق بات ظاہر ہوگئی ہے، میں نے ہی ان پر ڈورے ڈالے تھے، میں ہی ان سے اپنا مطلب پورا کرنا چاہتی تھی، بلا شبہ وہ سچے ہیں، جب ساری دنیا پر حقیقت ظاہر ہوگئی تب حضرت یوسف علیہ السلام نے قید خانے سے باہر آنے اور اس معاملے کی تحقیقات کرنے کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ سب کچھ میں نے اس لیے کیا تا کہ بادشاہ مصر کو معلوم ہو جائے کہ میں نے کسی خیانت کا ارتکاب نہیں کیا تھا، میں بے قصور ہوں، مجھے بلا وجہ قید خانے میں ڈال دیا گیا ہے اب حقیقت سب کے سامنے آگئی ہے، اللہ مکاروں کی مکاری کو چھپاتا نہیں ہے، جلد یا بہ دیر ظاہر کر دیتا ہے میں خود کو پاکباز نہیں کہتا، آدمی کا نفس تو اس کو برائی کی طرف لے جانا چاہتا ہے، بس وہی شخص برائی سے محفوظ رہتا ہے جس پر میرا رب رحم کرے، بلا شبہ میرا رب گناہوں کو بخشنے والا بھی ہے، اور اپنے بندوں پر رحم کرنے والا بھی ہے۔

مصر میں قحط سالی اور حضرت یوسف علیہ السلام کی تدبیر:

جب حضرت یوسف علیہ السلام کی بے گناہی عالم آشکارا ہوگئی تو اب ان کے قید میں رہنے کا کوئی جواز نہیں رہا، چنانچہ بادشاہ نے کہا کہ ایسے شخص کو تو میرے پاس لے کر آؤ، میں اسے اپنا خاص مشیر بناؤں گا، بادشاہ کے حکم کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام رہا کر دئے گئے اور انھیں پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ دربار میں لایا گیا اور انھیں مشیر خاص یا وزیر خاص کے منصب پر فائز کیا گیا، تفسیر ”معارف القرآن“ میں بادشاہ مصر سے ملاقات کی تفصیلات ہیں، جن میں یہ ہے کہ بادشاہ نے حضرت یوسف علیہ السلام سے مختلف زبانوں میں گفتگو کی، حضرت یوسف نے ہر زبان میں اس کی بات کا جواب دیا، بلکہ

دو زبانیں اور بھی بولیں عربی اور عبرانی جن سے بادشاہ واقف نہیں تھا، اس کے بعد اس نے اپنے خواب کا قصہ چھیڑ دیا، تب حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کے خواب سے متعلق وہ باتیں بتلائیں جن کو بادشاہ نے کسی سے نہیں بتلایا تھا، یہ باتیں سن کر بادشاہ حیران رہ گیا اور کہنے لگا کہ یہ سب کچھ آپ کو کیسے معلوم ہوا، اس کے بعد اس نے حضرت یوسف علیہ السلام سے دریافت کیا کہ قحط سالی سے نمٹنے کے لیے ہمیں کیا اقدامات کرنے ہوں گے، حضرت یوسف علیہ السلام نے جواب دیا کہ جن سالوں میں خوش حالی ہو، اور خوب بارشیں ہوں تو کاشت کاروں کو چاہئے کہ وہ اپنی زمینوں میں زیادہ سے زیادہ کاشت کریں، اور زیادہ سے زیادہ غلّہ اگائیں، اور جتنا غلّہ پیدا ہو اس میں سے پانچواں حصہ پس انداز کرتے رہیں، جس وقت قحط سالی ہوگی یہ پس انداز کیا ہوا غلّہ اس وقت کام آئے گا اور آپ کے ملک میں غلّے کی کمی واقع نہیں ہوگی، کیوں کہ کاشت کار اپنی زرعی آراضی پر کاشت کیا ہوا غلہ محفوظ رکھیں گے اس لیے وہ خود بھی کھائیں گے اور دوسرے شہریوں کو بھی فروخت کریں گے، البتہ جو غلّہ زرعی محصول کے طور پر آپ کو ملے یا جو غلّہ سرکاری زمینوں سے پیدا ہو اس کو آپ اپنے کولڈ اسٹوروں میں محفوظ رکھیں، کیوں کہ قحط سالی کے اثرات دور دور تک پھیلیں گے اور خلق خدا کافی پریشانی اٹھائے گی، آپ کے پاس بھی لوگ امداد کے لیے حاضر ہوں گے، سرکاری خزانوں میں محفوظ غلّے سے آپ ان کی مدد کریں یا معمولی قیمت پر فروخت کریں، اس صورت میں سرکاری خزانے کو کافی آمدنی بھی ہو جائے گی اور لوگ بھی بھوک سے نہیں مریں گے، بادشاہ یہ تدبیر سن کر بہت خوش ہوا اور کہنے لگا کہ منصوبہ تو بہت اچھا ہے مگر یہ بہت بڑا اور طویل مدتی منصوبہ ہے اس کی تکمیل کیسے ہوگی، حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے کہ آپ اپنے خزانے میرے سپرد کر دیں، میں پوری دیانت داری کے ساتھ ان خزانوں کی حفاظت کروں گا، میں یہ جانتا ہوں کہ کہاں کیا خرچ کرنا ہے اور کب خرچ کرنا ہے، اس طرح بادشاہ مصر نے ان کو ملک کا وزیر خزانہ بنا دیا، ایک سال کے اندر ہی حضرت یوسف علیہ السلام کی پوشیدہ صلاحیتیں کھل کر سامنے آگئیں، ملک میں امن وامان قائم ہو گیا، خوش حالی آگئی، شاہ و گدا تک سب اپنی اپنی جگہ مطمئن نظر آنے لگے تب امور مملکت کی تمام ذمہ داریاں ان کے سپرد کر دی گئیں، بعض

مفسرین نے لکھا ہے کہ اس دوران عزیز مصر فیطفار کا انتقال ہوگیا، بادشاہ مصر نے عزیز مصر کی بیوہ سے جو اس قصے کا بنیادی کردار ہے حضرت یوسف کا نکاح کردیا، تب حضرت یوسف نے ان سے پوچھا کہ یہ صورت زیادہ بہتر ہے یا وہ صورت بہتر تھی جو تم نے پہلے اختیار کی تھی، انھوں نے کہا بلاشبہ یہ صورت زیادہ اچھی ہے، میں غلطی پر تھی، یہاں قرآن کریم نے اپنے خاص اسلوب میں یہ کہا کہ اس طرح ہم نے یوسف کو پورے ملک کا مختار کل بنادیا، جو چاہیں وہ حکم جاری کریں، ہم جس کو چاہتے ہیں اپنی رحمت سے اسی طرح نوازتے ہیں اور ہم اچھے عمل کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔

مصر میں برادران یوسف کی آمد:

اب ہم کنعان چلتے ہیں جہاں حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے گیارہ بیٹوں کے ساتھ فروکش ہیں، اور رات دن اپنے بارہویں بیٹے کی یاد میں روتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ رورو کر ان کی آنکھیں بھی خراب ہوگئی ہیں، مگر وہ انسانوں سے شکوہ نہیں کرتے بلکہ اللہ کے حضور رو کر اپنا دل ہلکا کرلیتے ہیں، مصر میں قحط سالی کا دور شروع ہوا تو قرب و جوار کے علاقے بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے، کنعان کا علاقہ بھی خشک سالی سے متأثر ہوا، ایک روز حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے فرمایا: میں نے سنا ہے کہ مصر میں کوئی رحم دل بادشاہ تخت نشین ہے، وہاں کافی غلّہ موجود ہے اور وہ بہت کم قیمت پر ضرورت مندوں کو دے رہا ہے، تم لوگ بھی جاؤ اور غلّہ لے کر آؤ، کیوں کہ ہر شخص کو اس کی سواری کے بوجھ کے برابر غلّہ دیا جارہا تھا اس لیے حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے یہ فیصلہ کیا کہ سب بھائی جائیں اور غلّہ خرید کرلے آئیں، ان میں بن یامین بھی تھے، حضرت یوسف علیہ السلام کے چھوٹے اور حقیقی بھائی، اب حضرت یوسف کی گم شدگی کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام کی دلبستگی اور تسلّی و تشفی کے لیے بن یامین ہی رہ گئے تھے سو انھیں سفر کی اجازت نہیں دی گئی، سب بھائی مصر پہنچے، دربار میں حاضر ہوئے حضرت یوسف علیہ السلام تخت شاہی پر شاہی لباس زیب تن کیے ہوئے جلوہ افروز تھے، اتنے عرصے میں شکل اور حلیہ کافی تبدیل ہوجاتا ہے، برادران یوسف تو انھیں پہچان نہ

سکے، البتہ یوسف علیہ السلام پہچان گئے، اب سوال وجواب کا سلسلہ شروع ہوا تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو، والد کا نام کیا ہے، کتنے بھائی ہو وغیرہ وغیرہ، حضرت یوسف علیہ السلام نے ان لوگوں کا کافی اعزاز کیا اور سب کو غلّہ بھی دیدیا، اور جو قیمت ان سے وصول کی تھی وہ بھی ان کے سامان میں چھپا کر رکھدی، وقت رخصت یہ بھی کہا کہ دوبارہ جب آؤ تو اپنے چھوٹے بھائی کو بھی ساتھ لے کر آنا، اگر نہ لائے تو میں تم کو غلّہ نہیں دوں گا، جب غلّہ ختم ہوگیا اور سفر درپیش ہوا تو بھائیوں نے باپ سے عرض کیا کہ ہمارے ساتھ بن یامین کو جانا ہوگا کیوں کہ بادشاہ نے اس کو ساتھ لے کر آنے کی شرط لگائی ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا میں ایک دفعہ تو تم پر اطمینان کر کے یوسف کو کھو چکا ہوں اب اس سے بھی ہاتھ دھولوں، مگر جب خاندان میں غلّے کی ضرورت کا احساس ہوا تو حضرت یعقوب علیہ السلام کو اجازت دینی ہی پڑی، اس طرح گیارہ بھائیوں کا یہ قافلہ دوبارہ مصر پہنچا، اس بار بن یامین بھی ساتھ تھے، حسب دستور دربار میں حاضر ہوئے، غلّہ حاصل کیا، اگلی صبح واپسی کا سفر تھا کہ شاہ مصر کے سونے کے کٹورے کی گم شدگی کا اعلان ہونے لگا، اور یہ بھی اعلان ہوا کہ جس کے سامان سے یہ کٹورا برآمد ہوگا اس کو بہ حکم سرکار گرفتار کرلیا جائے گا، تلاشی لی گئی تو وہ کٹورا بن یامین کے سامان میں نکل آیا جسے حضرت یوسف کے کارندوں نے چھپا کر رکھدیا تھا، بھائیوں پر تو جیسے بجلی گر پڑی، سب رونے لگے کہ اب ابّا کو کیا منھ دکھائیں گے وہ تو پہلے ہی ہم سے نالاں ہیں، مگر کیا کرتے پہلے تو شاہ مصر کی خوب منت سماجت کی، پھر کہنے لگے اس نے چوری کی ہے، اسے پہلے اس کے بھائی (یوسف) نے بھی چوری کی تھی، حضرت یوسف نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا مگر دل میں سوچا کہ یہ لوگ اب بھی مجھ سے نفرت کرتے ہیں، غرضیکہ یہ ناکام ونامراد واپس ہوئے، واپس جاکر حضرت یعقوب کو صورت حال بتلائی، انھوں نے کہا بات یہ نہیں ہے جو تم کہہ رہے ہو، حقیقت کچھ اور ہے، جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو، یہ لوگ پھر مصر گئے، اور بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر نہایت عاجزی اور مسکنت ظاہر کی اور اپنی خانگی ضرورتوں کا اور سرمائے کی کمی کا ذکر کیا، حضرت یوسف علیہ السلام نے جب ان کی یہ بے چارگی اور

عاجزی دیکھی تو خود کو ان پر ظاہر کر دیا اور کہا میں یوسف ہوں، اور یہ میرا بھائی بن یامین ہے، بھائیوں کو یقین ہی نہیں آیا، حیرت سے کہنے لگے کیا واقعی تم یوسف ہو، اس پر انھوں نے جو کچھ ان پر گزرا تھا وہ سب بتلایا، پھر کہا میں تم سب کو معاف کرتا ہوں، اب جاؤ اور والد بزرگوار کی خدمت میں میری یہ قمیص لے کر جاؤ، ان کے چہرے پر ڈالو ان شاء اللہ ان کی بینائی واپس آجائے گی اور تم سب اپنے اہل وعیال کے ساتھ یہاں آجاؤ، اس طرح حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے تمام افراد خاندان کے ساتھ مصر تشریف لائے، حضرت یوسف علیہ السلام نے والدین کو اپنے پاس تخت شاہی پر بٹھایا اور نیچے تمام بھائی سرنگوں کھڑے ہو گئے، تب یوسف علیہ السلام نے عرض کیا ابا جان یہ ہے میرے خواب کی تعبیر!

حضرت شعیب علیہ السلام

خطیب الانبیاء حضرت شعیب علیہ السلام:

قرآن کریم میں حضرت شعیب علیہ السلام کا ذکر سورۂ اعراف، سورۂ ہود اور سورۂ شعراء میں کسی قدر تفصیل سے اور سورۂ حجر اور سورۂ عنکبوت میں کچھ اختصار کے ساتھ ہے، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت شعیب علیہ السلام کو خطیب الانبیاء فرمایا کرتے تھے، کیوں کہ ان کا وعظ بہت جامع اور مدلّل ہوتا تھا اور ان کا اسلوب بیان بھی نہایت عمدہ ہوا کرتا تھا، ان کے جد امجد کا نام مدین تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے ہیں، انھی کے نام سے ان کا قبیلہ اور بعد میں شہر معروف ہوا، اس قبیلے کو اصحاب الأیکہ بھی کہتے ہیں، عربی میں ایکہ سرسبز وشاداب جھاڑیوں کو کہا جاتا ہے کیوں کہ یہ علاقہ نہایت زرخیز اور سرسبز وشاداب تھا اس لیے یہاں رہنے والوں کو اصحاب الایکہ بھی کہا جاتا ہے، بعض لوگوں نے اس کو الگ قبیلہ بتلایا ہے اور حضرت شعیب علیہ السلام کی یہ خصوصیت قرار دی ہے کہ انھیں دو قبیلوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا گیا، قرآن کریم نے قبیلۂ مدین اور قوم لوط کا محل وقوع امام مبین کو قرار دیا ہے، مفسرین نے امام مبین کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ

دونوں قبیلے شاہ راہِ عام پر واقع تھے کہتے ہیں کہ جو شاہ راہ حجاز کو شام، فلسطین یمن اور مصر سے جوڑتی ہے اسی شاہ راہ پر یہ دونوں قبیلے بود و باش اختیار کیے ہوئے تھے، اب مدین کا علاقہ شام کا حصہ ہے اور موجودہ دور میں اس کو معان کہا جاتا ہے۔

اہل مدین کی اخلاقی برائیاں:

اللہ تعالیٰ نے اہل مدین یا اولاد مدین کی اصلاح کے لیے ان ہی میں سے ایک رجل صالح کو اپنا پیغمبر بنا کر مبعوث فرمایا، ان کی قوم کفر و شرک کے علاوہ بہت سی اخلاقی برائیوں میں بھی مبتلا تھی، جن میں سے ایک برائی یہ تھی کہ وہ لوگ ناپ تول میں کمی کیا کرتے تھے، قوم مدین کے زیادہ تر لوگ تجارت اور زراعت پیشہ تھے، ان کی یہ عادت بن گئی تھی کہ وہ خریدار سے اپنے سامان کی قیمت تو پوری وصول کرتے لیکن جب اس کو سامان دیتے تو کم تولتے، ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ کم تولنے کی اس عادت بد پر شرم سار تھے بلکہ اسے اپنا حق سمجھتے تھے اور اس کام کو اپنے آباء و اجداد کی میراث اور اپنا ذاتی ہنر سمجھ کر انجام دیتے تھے، حضرت شعیب علیہ السلام نے انھیں اوّل تو توحید کی دعوت دی جو تمام انبیاء کا مشترکہ مشن اور بنیادی پیغام ہے، ان کو بتلایا کہ ایک اللہ کی عبادت کرو، بتوں کی پرستش چھوڑو، تمام گناہوں کی جڑ اور بنیاد غیر اللہ کی پوجا اور خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک کرنا ہے، حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو اس بات سے بھی آگاہ کیا کہ یہ جو تم کم تولنے کی بیماری میں مبتلا ہو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں رکھتے جو تمام دنیا کا مالک اور رازق ہے اور تمام خزانے اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں، دعوت توحید کے ساتھ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم میں پھیلی ہوئی اس بڑی برائی کی بیخ کنی کی بھی کوشش کی، فرمایا: تم ناپ تول میں کمی مت کیا کرو، تمہیں اس طرح کی حرکتیں کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے تمہیں بہت کچھ دے رکھا ہے، میں تمہیں اچھی حالت میں دیکھ رہا ہوں، سب کچھ ہے تمہارے پاس، پھر کیوں دوسروں کا حق مارتے ہو، مجھے ڈر ہے کہ تم پر عذاب سے گھیرنے والا دن نہ آجائے، پہلے تو پیغمبر نے اپنی قوم کو ناپ تول میں کمی کرنے سے منع کیا، پھر یہ بھی فرمایا کہ تم پورا تولو اور پوری پیمائش کرو، تولنے والی چیز ہو تو اسے پوری تول

کردواور ناپنے والی چیز ہو تو اس کو صحیح طریقے پر ناپو، لوگوں کو ان کا سامان گھٹا کر نہ دو، ناپ تول میں کمی کرنا زمین میں فساد پھیلانے کے برابر ہے اس لیے اے میری قوم کے لوگو! تم زمین میں فساد نہ پھیلاؤ، اللہ تعالیٰ کا عطا کیا ہوا جو مال تمہارے پاس ہے وہ تمہارے لیے اس سے زیادہ بہتر ہے جو تم لوگوں کا حق مار کر اپنے پاس رکھتے ہو، اور یہ کام تم کو خود ہی کرنا ہے میں تم پر چوکیدار تو ہوں نہیں کہ ہر وقت تمہاری نگرانی کرتا پھروں گا کہ تم کم تول رہے ہو یا نہیں؟

جیسا کہ سرکش قوموں کا وطیرہ رہا ہے، اہل مدین کا بھی وہی حال تھا، اس پند و نصیحت کا ان پر اثر تو کیا ہوتا اور وہ اپنی خراب عادتوں پر پشیمان ہو کر توبہ تو کیا کرتے الٹا اپنے پیغمبر کا ہی مذاق اڑانے لگے، روایات میں ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کثرت سے نوافل وغیرہ پڑھا کرتے تھے، قوم کے لوگ انہیں نماز میں مشغول دیکھتے اور مذاق اڑاتے، چنانچہ اس نصیحت کے جواب میں بھی انھوں نے یہ کہا کہ اے شعیب! کیا تمہیں تمہاری نماز نے یہ بتلایا ہے کہ جو طریقۂ عبادت ہمارے پُرکھوں کا تھا وہ طریقہ چھوڑ کر ہم تمہاری بات مان لیں، یا ہم اپنے مال و متاع میں وہ کرنے لگیں جو تم چاہتے ہو گویا تم ہی نیک اور عزت دار آدمی ہو، ہم تو کچھ ہیں ہی نہیں، حضرت شعیب علیہ السلام نے ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے تو تمہاری اصلاحِ عقائد اور اصلاحِ اعمال مقصود ہے، جو میں اللہ کی توفیق اور اس کی مدد سے کر رہا ہوں، تم میری بات نہیں مانو گے تو خود بھگتو گے، مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم پر بھی وہی عذاب نہ آجائے جو تم سے پہلی قوموں پر یعنی قوم نوح، قوم ہود، قوم لوط، قوم صالح پر آچکا ہے اور قوم لوط تو تم سے کچھ زیادہ دوری پر نہیں ہے، جا کر دیکھ کر آؤ کہ ان کا کیا حشر ہوا اور وہ کس انجام سے دوچار ہوئے، آج ان کی سرسبز و شاداب بستیاں اجڑ کر بے نام و نشان ہو چکی ہیں، میں تو کہتا ہوں کہ تم اپنے رب سے مغفرت کی دُعا مانگ لو اور اس کی طرف رجوع کرلو، وہ بڑا مہربان اور محبت والا ہے۔

اہل مدین پر اللہ کا عذاب:

قوم نے روز روز کی ان تقریروں سے جھنجلا کر کہا کہ تمہاری باتیں ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں، اور قوم میں تمہاری کوئی حیثیت بھی نہیں ہے، اس لیے بہتر یہی ہے کہ چپ رہو،

اگر تمہارے کچھ بھائی بند تمہارے ساتھ نہ ہوتے تو ہم پتھر مار مار کر تمہیں ہلاک کر دیتے، اس قوم کا انجام بھی وہی ہوا جو ہونا تھا اور جو قانون الٰہی کا ابدی فیصلہ ہے کہ جب باطل زیادہ سرکشی اختیار کرنے لگتا ہے اور حق وصداقت کا کھلم کھلا مذاق اڑایا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا عذاب آکر باطل پرستوں کا خاتمہ کر دیتا ہے، حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم پر دو طرح کے عذاب نازل ہوئے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے، ایک عذاب تو زلزلے کی شکل میں آیا کہ اچانک زمین تھرانے لگی اور وہ لوگ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے، دوسرے یہ کہ ان پر آسمان سے آگ کی بارش ہوئی جس نے قوم مدین کو خس وخاشاک کر دیا، ان کی کھیتیاں، ان کے باغات، ان کے مکانات سب کچھ جل کر خاک ہو گئے اور وہ خود بھی اس آگ میں جل کر راکھ بن گئے، حضرت شعیب علیہ السلام کی قبر مبارک حضر موت میں ہے، مدین کی تباہی کے وقت حضرت شعیب علیہ السلام اپنے اہل خاندان اور متبعین کے ساتھ نکل کر آگئے تھے اور اس جگہ آکر بس گئے تھے یہیں آپ کی وفات ہوئی، حضرت شعیب علیہ السلام نابینا تھے، انھوں نے لمبی عمر پائی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں آپ پڑھیں گے کہ ایک قبطی کو قتل کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین آگئے، یہاں ان کی ملاقات حضرت شعیب علیہ السلام سے ہوئی، اور ان کی ایک بیٹی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نکاح میں آئیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام

بنی اسرائیل میں پیغمبروں کی بعثت:

قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام، ان کی قوم بنی اسرائیل اور فرعون کا ذکر دوسرے پیغمبروں کے قصوں کی بہ نسبت زیادہ تفصیل کے ساتھ آیا ہے، تیس سورتوں کی تقریباً سو آیتوں میں یہ ذکر ملتا ہے، ہم حضرت یعقوب علیہ السلام کے حالات میں بتلا چکے ہیں کہ ان کے بارہ بیٹے تھے جن میں سے ایک حضرت یوسف علیہ السلام بھی تھے، ان بارہ

بیٹوں کی اولاد دراولاد کا سلسلہ دراز ہوا، قرآن کریم اور دوسری آسمانی کتابوں میں ان کو بنی اسرائیل کہا گیا ہے، آپ نے یہ بھی پڑھا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا ایک نام اسرائیل بھی تھا جس کے معنی ہیں عبداللہ یعنی اللہ کا بندہ، گویا بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں کی اولاد ہیں، ان کو یہودی بھی کہتے ہیں، ویسے تو یہودی وہ ہے جو یہودیت کو مانتا ہو، لیکن حقیقت میں یہ بھی بنی اسرائیل ہی ہیں، حضرت یعقوب علیہ السلام کے ایک بیٹے کا نام یہودا بھی تھا، یہودی سے اسی کی طرف نسبت ہے، بنی اسرائیل یہودیوں سے زیادہ سرکش قوم روئے زمین پر دوسری نہیں گزری، محض اس قوم کی ہدایت کے لیے کئی پیغمبر مبعوث کیے گئے، جیسے حضرت موسیٰ، حضرت ہارون، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت دانیال، حضرت عزیر، حضرت یحییٰ اور حضرت زکریا علیہم السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی بنی اسرائیل ہی میں سے تھے، مگر یہودی انھیں نبی نہیں مانتے، بلکہ حضرت زکریا علیہم السلام تک جو پیغمبر آئے ہیں ان کو نبی مانتے ہیں، آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تسلیم نہیں کرتے، حالاں کہ ان کی کتاب تورات میں اس کی پیشین گوئی موجود ہے کہ ایک پیغمبر مبعوث ہوں گے جن پر نبوت کا سلسلہ ختم ہو جائے گا، یہودیوں کا خیال ہے کہ ابھی تک یہ آخری پیغمبر مبعوث نہیں ہوئے، ہم نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے قصے میں یہ بھی بیان کیا تھا کہ حضرت یوسف کو ان کے سوتیلے بھائیوں نے کنویں میں ڈال دیا تھا جہاں سے ایک تجارتی قافلے کے لوگ انھیں مصر لے گئے تھے، حضرت یوسف علیہ السلام کا پورا قصہ بھی آپ پڑھ چکے ہیں، اللہ تعالیٰ نے انھیں مصر کی حکمرانی عطا کردی تھی، اوران کے والدین اور سب بھائی ان کے پاس آکر رہنے لگے تھے، اس زمانے مین مصر پر جو فرعون حکمراں تھا حضرت یوسف علیہ السلام نے اس سے اپنے اہل خاندان کے لیے ارض جاشان مانگ لی تھی جو انھیں بہ خوشی دیدی گئی تھی، اس وقت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت تک حضرت یوسف علیہ السلام اوران کے بھائی کی اولاد مصر میں ہی رہی، جس وقت حضرت یوسف علیہ السلام مصر کے حاکم بنے اس وقت وہاں فراعنہ کی سولہویں پشت کا ایک فرد جس کا نام اباپی الاول بتلایا جاتا ہے بادشاہ تھا اور جو

فرعون حضرت موسیٰ کے بچپن میں ان کی نوجوانی تک بادشاہ رہا اس کا نام رعمیسیس دوم تھا اور یہ اٹھیسواں حکمراں تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام بعثت کے بعد جب مصر واپس تشریف لائے تو اس وقت یہ بادشاہ مرچکا تھا اور اس کا بیٹا مرنفتاح تخت نشین تھا، گویا حضرت یوسف علیہ السلام سے حضرت موسیٰ تک جو وقت گزرا اس میں تیرہ چودہ فرعونوں نے حکومت کی، اس عرصے میں بنی اسرائیل جو حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں چند نفوس پر مشتمل ایک چھوٹا سا قبیلہ تھا بڑھتا رہا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش تک ان کی تعداد چھ لاکھ ہوچکی تھی، دوسری طرف فراعنہ مصر کے خاندان آباد تھے جن کو قبطی کہا جاتا تھا، اب ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کی طرف آتے ہیں، یہ چند سطور اس لیے لکھی گئی ہیں تاکہ ان کے واقعات اور حالات مربوط انداز میں سامنے آجائیں۔

فرعون کا خواب:

بنی اسرائیل اور مصر کے اصل باشندے ایک دوسرے کے ساتھ رہ رہے تھے کہ اچانک ایک رات فرعونِ مصر نے کوئی بُرا خواب دیکھا جس کی تعبیر دربار کے کاہنوں اور نجومیوں نے یہ دی کہ بادشاہ کی حکومت کے زوال کا سبب کوئی اسرائیلی بچہ ہوگا، بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ کاہنوں اور نجومیوں نے ازخود یہ پیشین گوئی کی کوئی اسرائیلی بچہ بادشاہ کے زوال کا سبب ہوگا، یہ سنتے ہی فرعون مصر نے اسرائیل کے تمام نومولود اور نوعمر لڑکوں کو قتل کرادیا، اور پورے ملک میں یہ ہدایت جاری کردی کہ کسی بھی اسرائیلی خاندان میں کوئی لڑکا پیدا ہو تو اس کی خبر حکومت کو دی جائے، اتفاق سے انہی دنوں حضرت موسیٰ کی پیدائش ہوئی ان کے والد کا نام عمران اور والدہ کا نام یوکابد تھا، بچے کی پیدائش کے بعد ماں باپ کو یہ تشویش لاحق ہوئی کہ اگر فرعون کے ہرکاروں کو اس بچے کی خبر ہوگئی تو وہ اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے اور قتل کردیں گے، تین مہینے تک تو انھوں نے بچے کو گھر میں چھپا کر رکھا، تین مہینے کے بعد حضرت موسیٰ کی والدہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوش خبری دی گئی کہ تمہارے بچے کو کچھ نہیں ہوگا، ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں، بڑا ہوکر یہ ہمارا پیغمبر بنے گا، خواب میں انھیں یہ بھی ہدایت دی گئی کہ اس بچے کو دریائے نیل کے سپرد کردو، اس

کے بعد دیکھو ہم اس کی پرورش کا کیا انتظام کرتے ہیں، والدہ نے لکڑی کا ایک صندوق بنایا اور اس پر اس طرح رنگ و روغن کیا کہ پانی صندوق کے اندر نہ جائے، اور موسیٰ کو جو اس وقت تین مہینے کے بچے تھے، اس کے اندر لٹا دیا اور اس کو بند کر کے دریائے نیل میں اس رخ کے حوالے کر دیا جدھر پانی کا بہاؤ تھا اور اپنی بیٹی سے کہا کہ وہ دریا کے کنارے کنارے جائے اور یہ دیکھے کہ صندوق کہاں جا رہا ہے اور اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے، ہمیں بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ نے بچے کی حفاظت کا جو وعدہ کیا ہے وہ اُسے کس طرح پورا کرنے والا ہے، چنانچہ حضرت موسیٰ کی بہن دریائے نیل کے کنارے کنارے چلتی رہیں، صندوق دریا میں بہتا رہا، یہاں تک کہ وہ شاہی محل کے کنارے جا کر ٹھہر گیا جہاں محل کی کنیزیں غسل کر رہی تھیں، ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس وقت فرعون کی ملکہ آسیہ بھی وہاں موجود تھیں، کنیزوں نے ان کو خبر دی کہ ایک صندوق دریا میں بہہ کر آیا ہے، ملکہ نے اسے دریا سے باہر نکال کر لانے کا حکم دیا، کنیزوں نے صندوق نکال کر کھولا تو اس میں ایک خوب صورت بچہ لیٹا ہوا تھا، آسیہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئیں، بچے کو محل کے اندر لے گئیں اور بادشاہ سے کہنے لگیں کہ بچہ بہت پیارا ہے، ہونہار بھی لگتا ہے، ہم اسے اپنا بیٹا بنائیں گے، حضرت موسیٰ کی بہن بھی کسی طرح محل کے اندر جا پہنچیں، انھوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ان کے ننھے بھائی کو ملکہ نے کس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا ہے اور اپنے کانوں سے یہ بھی سن لیا کہ وہ اس بچے کو اپنا بیٹا بنانا چاہتی ہیں، اب مسئلہ یہ پیش آیا کہ ننھے موسیٰ کسی کا دودھ پینے پر آمادہ نہیں تھے، تمام کوششیں کر لی گئیں، ملکہ سمیت تمام خادمائیں اور کنیزیں پریشان ہو گئیں، اس وقت بہن نے ملکہ سے کہا کہ میں ایک عورت کو جانتی ہوں، بچے اس سے جلدی مانوس ہو جاتے ہیں اگر آپ لوگوں کی رائے ہو تو اسے بلا کر دیکھ لیں، ہو سکتا ہے بچہ اس عورت کا دودھ پکڑ لے، لڑکی کی تجویز پر عورت کو طلب کیا گیا جو موسیٰ کی والدہ تھیں اس طرح موسیٰ کو ان کی والدہ محل میں آ کر دودھ پلانے لگیں اور انھیں دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرنے لگیں۔

دشمن کے محل میں:

اس طرح حضرت موسیٰ اپنے دشمن فرعون کے محل میں ناز ونعم کے ساتھ پرورش پانے لگے اور وہ بھی اس طرح کہ خود ان کی والدہ انھیں دودھ پلا رہی تھیں، شاہی محل میں پرورش پا کر جب حضرت موسیٰ نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو وہ ایک خوب صورت، تندرست وتوانا، اور طاقت ور نوجوان کی صورت میں سامنے آئے، نہایت بارعب اور پُروقار نوجوان، لوگ انھیں دیکھتے تو دیکھتے رہ جاتے، ایک مرتبہ وہ محل سے باہر کہیں جارہے تھے، دیکھا کہ ایک اسرائیلی اور ایک مصری جسے قبطی بھی کہہ سکتے ہیں آپس میں دست وگریباں ہیں، قبطی طاقت ور تھا جو اپنے کمزور حریف اسرائیلی پر غالب آرہا تھا، حضرت موسیٰ نے حالاں کہ محل میں پرورش پائی تھی لیکن انھیں معلوم ہو چکا تھا کہ وہ فرعون اور آسیہ کے حقیقی بیٹے نہیں ہیں، بلکہ ان کا تعلق بنی اسرائیل سے ہے، انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ قبطی قوم کے لوگ اقتدار کے نشے میں چور ہو کر ان کی قوم کے کمزور اور بے بس لوگوں کو ظلم وستم کا نشانہ بناتے رہتے ہیں، نیز انھوں نے اسرائیل کے ہزاروں معصوم بچوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کرادیا ہے، اس لیے حضرت موسیٰ کے دل میں قبطیوں سے انتہائی درجے کی نفرت تھی، اب جوان دونوں کو لڑتے ہوئے دیکھا تو فطری طور پر ان کا جھکاؤ اسرائیلی کی طرف ہوا، یوں بھی اسرائیلی کمزور تھا اور وہ قبطی کے مقابلے میں مغلوب ہوا جارہا تھا، آگے بڑھ کر انھوں نے قبطی کے ایک طمانچہ رسید کیا، قبطی وہ طمانچہ برداشت نہ کرسکا، اور اسی وقت مرگیا، اسرائیلی نے اپنی راہ لی، حضرت موسیٰ بھی توبہ واستغفار کرتے ہوئے جہاں انھیں جانا تھا چلے گئے، انھوں نے قتل کے ارادے سے اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا بلکہ وہ تو قبطی کو اس کے ظلم سے روکنا چاہتے تھے، اب جو اس کو مرا ہوا دیکھا تو اس غیر ارادی قتل پر سخت نادم ہوئے اور اللہ سے معافی کے خواست گار ہوئے، اللہ تعالیٰ نے بھی ان کی غلطی معاف کردی، جس جگہ یہ واقعہ پیش آیا اس وقت وہاں کوئی چوتھا آدمی موجود نہیں تھا، قبطی کی لاش دیکھ کر اس کی قوم میں اشتعال پھیل گیا، لوگوں نے دربار میں جا کر اس کی خبر دی اور یہ بھی بتلایا کہ اس میں یقینی طور پر کسی اسرائیلی شخص کا ہاتھ ہے، مگر کیوں کہ کوئی اسرائیلی متعین نہیں

تھا اس لیے کسی کی گرفتاری عمل میں نہ آسکی، اگلے روز پھر یہی منظر تھا، وہی اسرائیلی کسی دوسرے قبطی سے لڑ جھگڑ رہا تھا اور حضرت موسیٰ ادھر سے گزر رہے تھے، آج بھی قبطی غالب تھا اور اسرائیلی مغلوب ہوا جا رہا تھا، اس نے حضرت موسیٰ کو جو دیکھا تو مدد کے خیال سے ان کو آواز دی، حضرت موسیٰ کو غصہ تو بہت آیا ایک تو اس بات پر کہ قبطی اپنے سے کمزور اسرائیلی کو تشدد کا نشانہ بنا رہا تھا، دوسرے اس بات پر کہ وہ ہی کل والا اسرائیلی آج بھی قبطی سے پٹ رہا تھا، انھوں نے پہلے تو اسرائیلی کو ڈانٹا کہ تم اس طرح کی حرکتیں کرتے پھرتے ہو، مجھے تو تم ہی گمراہ لگتے ہو، اس کے بعد اس خیال سے آگے بڑھے کہ اس اسرائیلی کو قبطی سے چھڑائیں کہ قبطی چلّا اٹھا اے موسیٰ! تمہارے کیا ارادے ہیں، وہ یہ سمجھا کہ موسیٰ آج اسے ماریں گے، کل تو انھوں نے میری مدد کی تھی اور اس ظالم کو کیفر کردار تک پہنچا دیا تھا، لیکن آج وہ مجھے قصوروار سمجھ رہے ہیں، اس لیے وہ مجھے ماریں گے، یہ سوچ کر وہ چلا اٹھا اور کہنے لگا کہ کل تو آپ نے ایک قبطی کی جان لے لی تھی، کیا آج مجھے مارنا چاہتے ہیں، یہ سن کر قبطی اپنی قوم کی طرف بھاگا اور انھیں بتلایا کہ کل جو ہمارا آدمی قتل ہوا ہے اس کو موسیٰ نے قتل کیا ہے، لوگ فریاد لے کر دربار میں پہنچے، کیوں کہ موسیٰ نے شاہی محل میں پرورش پائی تھی اس لیے فرعون سے ان کی براہ راست ہی شکایت کی جاسکتی تھی، فرعون نے جب یہ سنا کہ کل کے واقعے میں موسیٰ کا ہاتھ ہے تو اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ موسیٰ کو پکڑ کر دربار میں لائیں، جس وقت فرعون نے موسیٰ کی گرفتاری کا حکم سنایا اس وقت وہاں ایک مصری شخص بھی موجود تھا جو حضرت موسیٰ سے محبت رکھتا تھا اور اسرائیلیوں سے بھی اسے ان کی مظلومیت کی وجہ سے ہمدردی تھی، یہ حکم سن کر وہ دربار سے اٹھا اور اس سے پہلے کہ فرعون کے آدمی موسیٰ تک پہنچیں وہ ان کے پاس پہنچ گیا اور کہنے لگا کہ اے موسیٰ دربار میں آپ کے قتل کی سازشیں ہو رہی ہیں، گرفتاری کا حکم ہو چکا ہے، چند لمحوں میں بادشاہ کے آدمی آپ کے پاس پہنچنے والے ہیں، آپ اسی وقت یہاں سے نکل جائیں اور کسی ایسی جگہ جا کر رہنے لگیں جہاں فرعون کے آدمی نہ پہنچ سکیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ مخلصانہ مشورہ سنا اور اسی وقت مصر سے نکل گئے، ان کا رخ مدین کی طرف تھا جہاں اللہ کے

پیغمبر حضرت شعیب علیہ السلام رہتے تھے۔

مصر سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہجرت:

مصر سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی روانگی بالکل اچانک ہی ہوئی، نہ ساتھ کوئی رفیق سفر تھا، نہ پاس کچھ زاد راہ تھا، بالکل تنہا اور کس مپرسی کی حالت میں نکل کھڑے ہوئے، مصر سے مدین کا فاصلہ اچھا خاصا تھا، کئی روز کے بعد وہاں پہنچے، ایک طرف بیٹھ کر سوچنے لگے کہ اب کہاں جائیں، کس کے دروازے پر دستک دیں، اجنبی ہیں کوئی پناہ بھی نہیں دے گا، ایک درخت کے سائے میں بیٹھے یہ سب باتیں سوچ رہے تھے، قریب میں ایک کنواں تھا جس سے لوگ پانی بھر رہے تھے، اور اپنے جانوروں کو پلا رہے تھے، اتنے میں دو لڑکیاں آئیں اور اپنی باری کے انتظار میں ایک طرف کھڑی ہوگئیں، ان کے ساتھ بھی جانور تھے، جب ان لڑکیوں کو کافی وقت گزر گیا تو حضرت موسیٰ نے آگے بڑھ کر ان سے پوچھا کہ تم کس بات کا انتظار کر رہی ہو، تم بھی کنویں سے پانی لو اور اپنے جانوروں کو پانی پلاؤ، لڑکیوں نے کہا کہ یہ لوگ ہمیں آگے نہیں بڑھنے دیں گے، جب یہ لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا کر فارغ ہوجائیں گے تب ہمارا نمبر آئے گا، اصل میں ہم کمزور ہیں، ہمارے والد بھی نہایت ضعیف ہیں، وہ بصارت سے بھی محروم ہیں، ہم اور ہمارے والد ان طاقت ور لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو غصہ بہت آتا تھا، یہ سن کر وہ کنویں کی طرف بڑھے اور بھیڑ کو چیرتے ہوئے کنویں پر پہنچے، ڈول اٹھایا اور پانی کھینچ کھینچ کر لڑکیوں کے جانوروں کو پلانے لگے، حضرت موسیٰ کا جلال اور ان کا ڈیل ڈول دیکھ کر کسی کو یہ ہمت نہ ہوئی کہ وہ ان کو روکتا، لڑکیاں اپنے جانوروں کو پانی پلا کر گھر چلی گئیں، حضرت موسیٰ اسی جگہ بیٹھے رہ گئے، دونوں لڑکیاں خلاف معمول وقت سے پہلے گھر پہنچیں تو ان کے والد نے تعجب سے پوچھا کہ آج تم اتنی جلدی کیسے آگئیں، لڑکیوں نے پنے والد سے اس اجنبی نوجوان کا ذکر کیا جس نے ان کی مدد کی تھی، اس کی طاقت وقوت کا کر بھی کیا، اور یہ بھی بتلایا کہ بستی کے لوگ کس طرح اس کے سامنے بے بس نظر آئے اور ں نے تنہا اتنا بڑا ڈول کنویں سے کھینچا اور ہماری بکریوں کو پانی پلایا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین میں:

حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی بیٹیوں سے جب نو وارد اجنبی مسافر کے متعلق یہ باتیں سنیں تو انھیں اس سے ملنے کا بڑا اشتیاق ہوا، انھوں نے اپنی ایک بیٹی کو بھیجا کہ جاؤ دیکھو وہ اجنبی مسافر وہاں ہے یا کہیں چلا گیا ہے، اگر ہو تو اسے میرے پاس بلا کر لاؤ، ادھر لڑکیوں کے جانے کے بعد حضرت موسیٰ پھر ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئے، اجنبی جگہ، گھر سے دور، زادراہ ختم ہو چکا ہے، کھانا بھی چاہئے اور ٹھکانہ بھی چاہئے، بے قرار دل سے بارگاہ خداوندی میں یہ دعا نکلی: رَبِّ إِنِّي بِمَا أَنْزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ. ''اے اللہ! میرے لیے اپنی قدرت سے جو بھی تو نازل کرے میں اس کا محتاج ہوں'' حضرت موسیٰ وہاں بیٹھے ہوئے تھے کہ ان دونوں میں سے ایک لڑکی آئی، اور شرم وحیاء کے ساتھ نظریں جھکا کر کہنے لگی کہ آپ کو ہمارے والد صاحب نے یاد کیا ہے، آپ نے ہم پر جو احسان کیا ہے ہمارے والد آپ کو اس کا بدلہ دینا چاہتے ہیں، یہ سن کر حضرت موسیٰ اپنی جگہ سے اٹھے اور لڑکی کے ساتھ اس کے والد سے ملنے کے لیے چلے، پہلے بتلایا جا چکا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام ضعیف بھی تھے، اور نابینا بھی تھے، قرآن کریم نے ان کے لیے شیخ کبیر (بڑے بوڑھے) کا لفظ استعمال کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کافی سن رسیدہ تھے، بہ ہر حال حضرت موسیٰ حاضر خدمت ہوئے، ملاقات ہوئی، حضرت شعیب علیہ السلام نے پہلے تو نوجوان مسافر کو کھانا کھلایا پھر اس کے متعلق دریافت فرمایا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے میزبان کو اپنی پوری آپ بیتی سنادی، یہ بھی بتلا دیا کہ ظالم فرعون ان کی قوم پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑتا ہے، قبطی کے قتل کا واقعہ بھی ان کے گوش گزار کر دیا اور عرض کیا کہ اس قبطی کے قتل کی پاداش میں میرے قتل کی سازش ہو رہی تھی، میری گرفتاری کا حکم آچکا تھا، میں اپنی جان بچا کر یہاں پہنچا ہوں۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے نوجوان کا پورا قصہ سنا، اس کو تسلی دی اور اطمینان دلایا کہ یہاں تم محفوظ ہو، ڈرنے اور گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے تمہیں سلامتی کے ساتھ یہاں تک پہنچا دیا ہے اس پر اللہ کا شکر ادا کرو، ان دونوں حضرات کی گفتگو

جاری تھی کہ اس لڑکی نے جو حضرت موسیٰ کو کنویں کے پاس سے بلا کر لائی تھی کہنے لگی ''ابا جان! اس مسافر کو آپ نوکری پر رکھ لیجئے، نوکر وہی بہتر ہے جو طاقت ور بھی ہو اور ایمان دار بھی''، مفسرین نے لکھا ہے کہ والد نے بیٹی سے پوچھا کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا ہے کہ اس مسافر کے اندر یہ دونوں وصف موجود ہیں، بیٹی نے جواب دیا کہ اس نے کنویں کا وہ پتھر جو دس آدمی مل کر اٹھاتے ہیں تنہا اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا تھا، دوسرے یہ کہ جب میں اسے بلانے گئی تو اس نے مجھ سے کہا کہ میں آگے چلوں گا تم میرے پیچھے پیچھے آؤ، اور اگر میں راستہ بھٹکوں تو پیچھے سے ڈھیلا پھینک کر راستے کی نشان دہی کرنا، یہ اس کی امانت داری ہی تو ہے کہ وہ کسی لڑکی کے پیچھے یا برابر میں نہیں چلنا چاہتا اور وہ راستہ بتلانے کے لیے بھی یہ نہیں چاہتا کہ اسے آواز دی جائے بلکہ کنکر پھینک کر راستے کی نشاندہی کر دی جائے، والد نے جب بیٹی سے یہ باتیں سنیں تو بہت خوش ہوئے اور حضرت موسیٰ سے کہا کہ میں تمہارے ساتھ اس لڑکی کا نکاح کرنے کے لیے تیار ہوں بہ شرطیکہ تم آٹھ سال تک میرے پاس رہ کر میری بکریاں چراؤ اور اگر تم ... ل کی مدت اپنی طرف سے بڑھا دو تو اور بھی اچھا ہوگا اس طرح دس سال تم میری خدمت کرو گے، یہی تمہاری بیوی کا حق مہر ہوگا، حضرت موسیٰ نے کہا مجھے منظور ہے، اب رہی مدت کی بات تو آپ اس کا فیصلہ میری مرضی پر چھوڑ دیجئے کہ میں آٹھ سال پورے کرتا ہوں یا دس سال، غرض یہ کہ نکاح ہو گیا اور حضرت موسیٰ مدین میں حضرت شعیب علیہ السلام کی خدمت میں رہنے لگے، مفسرین نے لکھا ہے کہ ایک اچھے فرض شناس اور قدرداں انسان کی طرح حضرت موسیٰ نے دس سال کی مدت پوری کی، اس کے بعد ایک دن عرض کیا کہ اب مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ اپنی قوم میں جا کر رہوں، حضرت شعیب علیہ السلام نے بہت کچھ مال ومنال دے کر انھیں رخصت کیا، ''قصص القرآن'' کے مصنف حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کی رائے یہ ہے کہ مدین میں حضرت موسیٰ جس بزرگ کے مہمان ہوئے تھے وہ حضرت شعیب علیہ السلام نہیں ہیں بلکہ کوئی دوسری شخصیت ہیں، ان کی تحقیق کے مطابق حضرت شعیب علیہ السلام اور حضرت موسیٰ کے زمانے میں کئی سو سال کا فاصلہ ہے، بہ ہر حال

یہ بزرگ حضرت شعیب علیہ السلام تھے، یا کوئی اور تھے لیکن باقی واقعات بالکل درست ہیں اوران کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔

مصر کی طرف روانگی:

تفسیر کی کتابوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی اہلیہ کو لے کر مصر کی طرف چلے اس وقت وہ حمل سے تھیں، راستے میں ایک جگہ قیام کیا، قرآن کریم میں اس جگہ کو وادیٔ ایمن کہا گیا ہے، بہ ہر حال یہ وادیِ سینا کا ایک گوشہ تھا اور یہاں بحر قلزم دو شاخ ہوا تھا اور ان دونوں شاخوں کے درمیان سے ایک راستہ مصر کی طرف جارہا تھا، زبردست سردی تھی، آگ جلانے کے لیے حضرت موسیٰ نے چقماق کا استعمال کیا مگر آگ روشن نہیں ہوئی، ادھر اُدھر نظریں دوڑا کر دیکھا، دور ایک پہاڑی پر ایک شعلہ چمکتا ہوا نظر آیا، خیال ہوا کہ شاید وہاں کچھ لوگ پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں اور ان کے خیموں میں آگ روشن ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اہلیہ محترمہ سے فرمایا: امْكُثُوا إِنِّي آنَسْتُ نَارًا لَعَلِّي آتِيكُم مِّنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ.(۱) ''تم یہاں ٹھہرو میں نے آگ دیکھی ہے شاید میں وہاں سے کوئی چنگاری تمہارے لیے لاسکوں یا شاید وہاں مجھے کوئی مدد کرنے والا مل جائے'' بہ ہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام اس پہاڑ کی طرف چلے، مفسرین نے اسے کوہ طور لکھا ہے، کوہ طور وادیِ سینا میں آج بھی موجود ہے، یہاں سیاحوں کا ہجوم لگا رہتا ہے، یہ وادی اور کوہ دونوں آج بھی مصر کی عملداری میں ہیں پہاڑی پر پہنچے تو دیکھا کہ ایک درخت میں آگ کی سی روشنی ہے، مگر اس آگ سے درخت کے پتے اور اس کی شاخیں بالکل محفوظ ہیں، حضرت موسیٰ اور آگے بڑھے، مگر جس قدر آگے بڑھتے ہیں، اسی قدر وہ درخت دور ہوتا چلا جاتا ہے، یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ کے دل میں کچھ خوف سا پیدا ہوا کہ یہ کیسی آگ ہے، ابھی وہ واپسی کے لیے قدم اٹھانے ہی والے تھے کہ آگ قریب آگئی اور اس میں سے یہ آواز نکلی: إِنِّي أَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى. وَأَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحَىٰ.(۲) ''اے موسیٰ میں ہی تیرا رب ہوں،

(۱) القصص:۲۹۔ (۲) طٰہٰ:۱۲-۱۳۔

اپنے جوتے اتار دو تم اس وقت وادی مقدس میں کھڑے ہوئے ہو، میں نے تمھیں اپنی رسالت کے لیے منتخب کرلیا ہے، اس لیے جو کچھ تم سے بذریعہ وحی کہا جائے اس کو کان لگا کر سنو۔

کوہ طور پر اللہ سے شرف ہم کلامی:

اردو زبان میں یہ مثل بہت مشہور ہے، آگ لینے گئے تھے پیغمبری مل گئی، اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصّے ہی کی طرف اشارہ ہے کہ وہ کوہ طور پر آگ لینے پہنچے تھے لیکن اللہ نے انھیں نبوت ورسالت کی دولت سے سرفراز کردیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ بیش بہا دولت پاکر خوش بھی ہوئے اور حیران بھی کہ وہ سلسلۂ نبوت جو صدیوں سے بنی اسرائیل میں چلا آرہا تھا ابھی باقی ہے اور اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ان کا نام بھی نبی اور رسول کی حیثیت سے لیا جائے گا، یہ سب باتیں کھڑے سوچ رہے تھے کہ پھر آواز آئی کہ اے موسیٰ تمھارے ہاتھ میں یہ کیا چیز ہے؟ سوال مختصر تھا، جواب بھی مختصر ہونا چاہیے تھا، یعنی حضرت موسیٰ صرف اتنا عرض کردیتے کہ میرے ہاتھ میں عصا (لاٹھی) ہے اس کے بجائے انھوں نے مفصل جواب دیا، دراصل جب انسان اپنی کسی محبوب ہستی سے ہم کلام ہوتا ہے تو وہ بات کو لمبی کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ دیر تک بات چیت چلتی رہے، یہاں تو محبوب حقیقی سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا تھا، بات تو لمبی ہونی ہی تھی، عرض کیا! یہ میرا عصا ہے میں اس سے بکریاں چراتے وقت اس پر ٹیک لگالیتا ہوں، اور اپنی بکریوں کے لیے اس سے پتے جھاڑ لیتا ہوں اور کچھ دوسرے کاموں میں بھی اس سے مدد لیا کرتا ہوں، آواز آئی! اے موسیٰ اس لاٹھی کو زمین پر ڈال دو، حضرت موسیٰ نے لاٹھی زمین پر ڈال دی، اچانک ہی اس بے جان لاٹھی نے اژدہے کی شکل اختیار کرلی اور اژدھا بھی ایسا جو ادھر اُدھر دوڑنے لگا، حضرت موسیٰ یہ منظر دیکھ کر ڈر گئے، اور پیٹھ موڑ کر بھاگنے لگے، تھے تو انسان ہی، ایسے حالات میں ڈر تو لگتا ہی ہے، آواز آئی: اے موسیٰ! لاٹھی اٹھالو، ڈرو مت، جیسے ہی تم اسے اٹھاؤ گے ہم اس اژدھے کو پھر سے لاٹھی بنادیں گے، حضرت موسیٰ واپس پلٹے، اژدھے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اسے اٹھالیا، ہاتھ میں آتے ہی لاٹھی

اپنی اصلی شکل وصورت میں آگئی، دوبارہ حکم ہوا کہ اپنا ہاتھ اپنی بغل میں ڈالو جب اسے باہر نکالوگے تو وہ چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس حکم کی بھی تعمیل کی۔

جب یہ دونوں کام ہوگئے تب حق تعالیٰ کی آواز آئی کہ یہ تمہارے لیے دوسری نشانی ہے، پہلی نشانی تو وہ تھی کہ لاٹھی زمین پر گرتے ہی اژدھا بن جاتی ہے، اور دوسری نشانی یہ ہے کہ ہاتھ کو بغل کے اندر ڈالنے کے بعد نکالنے سے چمکتا ہوا نکلتا ہے، گویا یہ دو معجزے تھے جو حق تعالیٰ نے اپنے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہلی ہی ملاقات میں عطا فرمادئے تھے، تاکہ وہ ان دونوں معجزوں کے ساتھ فرعون کے دربار میں جائیں اور اسے راہ ہدایت پر لانے کی کوشش کریں کیوں کہ اس نے بڑی سرکشی اختیار کررکھی ہے اور وہ انتہائی نافرمان ہے، وہ ظالم بھی ہے کہ اس نے بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا رکھا ہے، اب تم فرعون کے پاس جاؤ اور اپنی قوم بنی اسرائیل کو اس کی غلامی سے نجات دلاؤ۔

بارگاہِ الٰہی میں درخواست:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارہ گاہِ رب العزت میں عرض کیا کہ اے پروردگار! میرے سینے کو کھول دیجئے، اور جو کام آپ نے میرے سپرد فرمایا ہے اس کو آسان فرمادیجئے، میری زبان میں کچھ لکنت ہے، میری یہ لکنت دور فرمادیجئے اور میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر مشیر بنا کر اسے بھی خلعت نبوت سے سرفراز کردیجئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے باری تعالیٰ سے یہ بھی عرض کیا کہ اے پروردگار میں نے فرعون کی قوم کے ایک شخص کو قتل کردیا تھا، ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ مجھے نقصان پہنچائیں، اپنے بھائی حضرت ہارون کے سلسلے میں انھوں نے عرض کیا تھا کہ میری زبان میں تو لکنت ہے میں اٹک اٹک کر بولتا ہوں جب کہ میرا بھائی بڑا فصیح اللسان ہے، حق تعالیٰ کی طرف سے آواز آئی کہ اے موسیٰ! جو سوال تم نے ہم سے کیا ہے ہم نے وہ پورا کردیا ہے، یعنی ہم نے تمہارا سینہ بھی کھول دیا ہے، اور جو کام تمہارے سپرد کیا ہے اس کو بھی آسان کردیا ہے اور تمہارے بھائی ہارون کو نبوت دے کر اسے تمہارا شریک کار بھی بنا دیا ہے اور یہ احسان جو ہم نے تم پر کیا ہے وہ پہلی

بار نہیں کیا، یاد کرو جب تم چھوٹے بچے تھے اور فرعون بنی اسرائیل کے نومولود بچوں کو قتل کرا رہا تھا اس وقت ہم نے تمہاری والدہ کو حکم دیا تھا کہ وہ تم کو ایک تابوت میں رکھ کر دریا میں ڈال دیں، پانی کی لہریں اس تابوت کو ساحل پر پہنچا دیں گی اور میرا اور اس کا (موسیٰ کا) دشمن اس تابوت کو حاصل کرلے گا اور ایسا ہی ہوا، یاد کرو تمہاری بہن نے دودھ پلانے والی کی نشان دہی کی اس طرح ہم نے تمہیں تمہاری والدہ کے پاس واپس پہنچا دیا، تاکہ وہ اُداس نہ ہوں اور ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں پھر تم ایک شخص کو قتل کر بیٹھے ہم نے تمہیں سلامتی کے ساتھ وہاں سے نکالا، پھر تم نے مدین میں چند برس گزارے، اے موسیٰ اب تم ایک خاص وقت پر یہاں آئے ہو اور میں نے تمہیں اپنے لیے منتخب کرلیا ہے۔

باری تعالیٰ کے ان ارشادات سے حضرت موسیٰ کو بڑی تقویت ملی، ان کے سارے اندیشے جاتے رہے، بلاشبہ جس ذات نے نومولود بچے کو پانی میں ڈوبنے سے محفوظ رکھا، اور جس نے دشمن کو دشمن کے گھر میں اس کے ہاتھوں پروان چڑھایا اور جس ذات نے قتل کے بعد دشمنوں کے نرغے سے بہ حفاظت نکال کر مدین میں بہترین ٹھکانا عطا کیا وہ ذات آئندہ بھی حفاظت کرے گی، اس بات چیت کے بعد حضرت موسیٰ اپنے وطن کی طرف روانہ ہوگئے، جس وقت گھر پہنچے رات کا وقت تھا، انھوں نے یہ ظاہر نہیں کیا کہ میں موسیٰ ہوں، بلکہ ایک اجنبی کی طرح اپنے اہل وعیال کے ساتھ خود اپنے گھر میں ٹھہرے، گھر والوں کی مہمان نوازی سے لطف اٹھایا، حضرت ہارون کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور کیوں کہ وہ بھی نبوت سے سرفراز ہوچکے تھے اس لیے انھیں بذریعہ وحی معلوم ہوچکا تھا کہ بھائی گھر تشریف لا چکے ہیں، واپس آئے تو بھائی موسیٰ گھر پر موجود تھے، گلے ملے، والدہ کو بھی جا کر بتلایا کہ موسیٰ دس سال کے بعد واپس آچکے ہیں، والدہ بھی بڑی خوش ہوئیں۔

فرعون کی طرف جانے کا حکم:

حکم ہوا اے موسیٰ تم اور تمہارے بھائی ہارون ہماری یہ دونوں نشانیاں لے کر فرعون کے پاس جاؤ، اس نے سرکشی اختیار کر رکھی ہے، اور دیکھو تم اس کے ساتھ نرم لہجے میں بات

کرنا، ہوسکتا ہے وہ تمہاری نصیحت قبول کرلے اور اس کے دل میں کچھ خوف پیدا ہو، دونوں نے عرض کیا یا اللہ! ہمیں ڈر ہے کہ وہ ہم پر زیادتی نہ کر بیٹھے، اللہ نے فرمایا ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، میں تمہارے ساتھ ہوں، تمہاری بات سن بھی رہا ہوں اور تمہیں دیکھ بھی رہا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کرتے ہوئے دونوں بھائی حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام فرعون کے دربار میں پہنچے، حضرت موسیٰ علیہ السلام براہ راست فرعون سے مخاطب ہوئے کہ اے فرعون! مجھے تمام جہانوں کے پروردگار نے اپنا قاصد بنا کر بھیجا ہے، میرے لیے یہ بات کسی بھی طرح مناسب نہیں کہ حق کے علاوہ کچھ کہوں، میں تم لوگوں کے رب کی طرف سے کھلی نشانی لے کر تمہارے پاس آیا ہوں، اور میرا مطالبہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دو، فرعون نے پہلے تو حضرت موسیٰ کو ان کا ماضی یاد دلایا کہ کیا ہم نے تمہیں پال پوس کر بڑا نہیں کیا تھا اور کیا تم نے ہمارے ساتھ اپنی زندگی کے چند سال نہیں گزارے تھے، اور کیا تم نے ہمارے ایک آدمی کو قتل نہیں کیا تھا، حضرت موسیٰ نے فرمایا ہاں میں نے قتل کیا تھا، مگر نادانستگی میں، پھر میں تم لوگوں سے ڈر کر یہاں سے چلا گیا اور اب اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی نبوت عطا فرمادی ہے، اور تو نے جو اپنے احسانات جتائے ہیں کیا وہ ایسے ہیں کہ تو ان کے بدلے میں بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنالے، فرعون نے پوچھا اے موسیٰ تم دونوں کا رب کون ہے، حضرت موسیٰ نے بڑی تفصیل سے جواب دیا کہ رب العالمین وہ ہستی ہے جس نے تجھ کو پیدا کیا، تیرے آباو اجداد کو پیدا کیا، مشرق اور مغرب کے درمیان جو یہ کائنات ہے وہ سب اسی کی ربوبیت میں ہے اور اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے، ہمارا رب وہ ہے جس نے دنیا کی ہر چیز پیدا کی ہے، اس نے زمین بنائی، اس میں راستے ہموار کیئے، آسمان سے پانی برسایا، اس سے طرح طرح کی سبزیاں اگائیں کہ تم خود بھی کھاؤ اور اپنے جانوروں کو بھی کھلاؤ، مفسرین نے لکھا ہے کہ فرعون کے جواب میں پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کچھ فرمایا، پھر حضرت ہارون علیہ السلام نے ان ارشادات کو پوری وضاحت کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے بیان کیا، لیکن ان دونوں حضرات کے مفصل اور مدلّل بیان کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا، مجلس کے آخر میں فرعون نے یہ کہہ کر بات ختم

کردی کہ اے درباریو! مجھے تو تمہارے لیے اپنے سوا کوئی خدا نظر نہیں آتا، اس کے بعد اس نے اپنے وزیر ہامان کو حکم دیا کہ وہ میرے لیے ایک بلند و بالا عمارت بنوائے تاکہ میں اس پر چڑھ کر آسمان تک پہنچ سکوں اور موسی کے خدا کو دیکھ سکوں، ویسے تو میں اس کو جھوٹا سمجھتا ہوں، فرعون نے حضرت موسیٰ سے یہ بھی کہا کہ تم تو اے موسی! ہمیں ہماری سرزمین سے نکالنے کے لیے یہاں آئے ہو، اور یہ جو تم نے دربار میں اپنے "معجزے" دکھلائے ہیں یہ تو جادو کے کرتب ہیں، ہم بھی تمہیں اس طرح کا جادو دکھلا سکتے ہیں، ایسا کرو، ایک دن مقرر کر لیتے ہیں، تم بھی اپنے معجزے لے کر آجاؤ اور ہم بھی اپنی سلطنت کے جادو گروں کو بلا لیتے ہیں، لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ تم ہمارے جادوگروں پر غالب آتے ہو یا ہمارے جادوگر تم پر غالب آتے ہیں، حضرت موسیٰ نے فرمایا تمہارا ناس ہو، اللہ کی ان نشانیوں کو جادو نہ کہو، تم پر خدا کا عذاب نازل ہوگا، جہاں تک خلق خدا کو جمع کرنے کی بات ہے تو کسی دن سب کو جمع کرلو اور اپنے جادوگروں کو بھی بلالو۔

جادوگروں سے مقابلہ:

غرض یہ کہ ایک دن مقرر ہوگیا، فرعون نے اپنی حدود سلطنت میں ہر جگہ اعلان کرادیا کہ تمام جادوگر اپنے اپنے فن کے مظاہرے کے لیے حاضر ہوں، قرآن کریم نے اس دن کو "یوم زینت" فرمایا ہے، یہ دن اہل مصر کے یہاں عید کا دن سمجھا جاتا تھا، اس دن سب لوگ اچھے اچھے کپڑے پہنتے اور کھیل کود میں وقت گزارتے، بہر حال وہ وقت بھی آپہنچا جب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو مجمع عام میں خدا کی بخشی ہوئی نشانیوں کا مظاہرہ کرنا تھا اور فرعون کے جادوگروں کو بھی اپنے کرتب دکھلانے تھے، ایک بڑے میدان میں فرعون کے لیے اسٹیج لگایا گیا تمام وزراء، مشیر اور حکام حسب مراتب تخت شاہی کے اردگرد بیٹھے، حد نظر تک دیکھنے والوں کا ہجوم تھا، سامنے ایک جانب حضرت موسیٰ اپنے بھائی کے ساتھ جلوہ افروز تھے، دوسری جانب جادوگر کھڑے ہوئے تھے، جادوگروں نے مقابلے اور مظاہرے کے آغاز سے پہلے فرعون کے پاس آکر کہا کہ اگر ہم موسیٰ پر غالب آگئے تو کیا ہم انعام کے حق دار ہوں گے، فرعون نے انھیں یقین دلایا کہ تمہیں انعام بھی دیا جائے گا اور تم میرے مقرب بھی بن کر رہو گے، جادوگروں کو جب یہ اطمینان

ہو گیا کہ ہماری محنت رائگاں نہیں جائے گی اور ہمیں انعام واکرام سے نوازا جائے گا تب وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے کہ اے موسیٰ پہلے تم اپنی لاٹھی پھینکو گے، یا پہلے ہم پھینکیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا پہلے تم ہی پھینکو! چنانچہ جادو گروں نے میدان میں اپنی لاٹھیاں اور رسیاں ڈال دیں جنھوں نے سانپوں اور اژدہوں کی صورت اختیار کر لی، لوگ یہ منظر دیکھ کر ڈر گئے، تب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ اب تم بھی اپنی لاٹھی ڈال دو، چنانچہ جیسے ہی انھوں نے اپنی لاٹھی پھینکی تو اس نے ایک بڑے اژدھے کی شکل اختیار کر لی اور جو کچھ جادوگروں کی چیزیں زمین پر پڑی ہوئیں تھیں وہ سب اس اژدھے نے نگل لیں، حق قائم ہو گیا، باطل رسوا ہو کر رہ گیا، جادوگر جنھیں غالب آنے کا یقین تھا مغلوب ہو کر رہ گئے، تمام جادوگر سجدہ میں گر پڑے اور کہنے لگے کہ ہم اس پروردگار پر ایمان لے آئے ہیں جو موسیٰ اور ہارون کا پروردگار ہے۔

یہ صورت حال دیکھ کر فرعون کا غصہ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا، اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ جادوگروں کو کچا چبا ڈالے، غصے میں جھنجلا کر کہنے لگا کہ تم میرے حکم اور میری مرضی کے بغیر ہی موسیٰ پر ایمان لے آئے، مجھے تو یہ تمہارا سردار معلوم ہوتا ہے، اسی نے تمھیں جادو سکھلایا ہے، اب دیکھو میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کرتا ہوں، میں تمہارے ہاتھ پاؤں کٹواؤں گا اور تمھیں کھجور کے تنوں پر لٹکا کر سولی دوں گا، جادوگروں کو کیوں کہ ہدایت نصیب ہو چکی تھی، اور انھیں یہ یقین ہو گیا تھا کہ موسیٰ حق پر ہیں، اور موسیٰ کا رب ہی سب کا رب ہے اس لیے انھوں نے بے خوف ہو کر کہا کہ ان روشن دلائل کے بعد ہم حق سے روگردانی نہیں کر سکتے، اور نہ تیرا حکم مان سکتے ہیں، تجھے جو کرنا ہے وہ کر، زیادہ سے زیادہ تو یہ کر سکتا ہے کہ ہماری جان لے لے، اور ہمیں سولی پر لٹکا دے، آخرت کی زندگی تیرے اختیار میں نہیں ہے، ہمارے لیے اللہ ہی بہتر ہے اور وہی باقی رہنے والا ہے۔

فرعون کو منہ کی کھانی پڑی:

فرعون نے دعوی کیا تھا کہ اس کے جادوگر موسیٰ علیہ السلام کے جادو پر غلبہ حاصل کر لیں گے، لیکن واقعہ اس کے برعکس ہوا، مصر کے تمام نامی گرامی جادوگر جو بڑے بڑے

دعووں کے ساتھ میدان میں آئے تھے اور جن میں انعامات کے لالچ کی وجہ سے جوش بھرا ہوا تھا اپنی کوششوں میں ناکام ہوگئے، یہ ناکامی جادوگروں کی نہیں تھی کیوں کہ وہ تو جان گئے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام جادوگر نہیں ہیں، اسی لئے انھوں نے اسی وقت قبول اسلام کا اعلان کر دیا تھا، اور وہ اس معاملے میں اس قدر مضبوط اور پُر یقین تھے کہ فرعون کی دھمکیوں کا بھی ان پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا، اس لئے یہ کہا جائے گا کہ یہ شکست جادوگروں کی نہیں تھی بلکہ فرعون کی تھی، وہ اپنی اس ذلت آمیز شکست پر غصے سے بھنا اٹھا اور کہنے لگا کہ اب موسیٰ کی قوم بنی اسرائیل سے اس شکست کا بدلہ لیا جائے گا، چناں چہ اس نے اعلان کرا دیا کہ آج سے بنی اسرائیل میں پیدا ہونے والے ہر لڑکے کو قتل کر دیا جائے صرف لڑکیوں کو زندہ رکھا جائے، یہ اعلان سن کر بنی اسرائیل میں سراسیمگی پھیل گئی، وہ پہلے ہی فرعون کی غلامی سے سخت پریشان تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی واپسی سے کچھ امید بندھی تھی کہ ان کو اس ذلت آمیز زندگی سے نجات مل جائے گی اور وہ بھی قوم فرعون کی طرح اس ملک میں باعزت طریقے پر زندگی گزارنے کا حق حاصل کرلیں گے، مگر یہ تو معاملہ ہی دوسرا ہوگیا، مصیبتیں کم ہونے کے بجائے اور بڑھ گئیں، اس سے پہلے بھی وہ موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت لڑکوں کے قتل کا دکھ جھیل چکے تھے، اب دوبارہ فرعون ان کے بچوں کو قتل کرانا چاہتا تھا، پریشانی کے اس عالم میں بنی اسرائیل کے سربرآوردہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں اپنی حالت زار کی روداد سنائی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں دو باتوں کی نصیحت کی، ایک تو یہ کہ وہ صرف اللہ سے مدد مانگیں، دوسرے یہ کہ جو مصیبتیں اور تکلیفیں وہ اٹھا رہے ہیں یا اٹھانے والے ہیں ان پر صبر کریں، حقیقت یہ ہے کہ قوموں کی زندگی میں ابتلاؤں اور آزمائشوں کا دور بھی ہوتا ہے، اگر حالات مقابلے کی اجازت نہ دیں تو دو ہی چیزیں کام آتی ہیں، ایک تو اللہ کی طرف متوجہ ہونا اور اس سے مدد چاہنا، دوسرے ہر طرح کی مصیبتوں میں صبر کرنا، بل کہ صبر کو اپنا شیوہ بنالینا، ایک پیغمبر کی حیثیت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام یہی دو نصیحتیں کر سکتے تھے جو انھوں نے اپنی قوم کو کیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو یہ بھی یقین دلایا کہ اگر تم نے ان دونوں باتوں پر عمل کیا تو تم ہی اس سرزمین کے وارث بنو گے، تم ہی غالب آؤ گے، یہ زمین

اللہ کی ہے، اللہ جس کو چاہتا ہے اُسے اپنی زمین کا وارث بنا دیتا ہے، بہت ممکن ہے اللہ تعالیٰ تمہارے دشمن کو تباہ و برباد کردے اور تمہیں اس کا جانشین بنادے۔

فرعون کی نافرمانی اور اللہ کا عذاب:

تاریخی واقعات میں ہے کہ جادوگروں کے مظاہرے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام بیس سال تک مصر میں رہے اور فرعون اور اس کی قوم کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرتے رہے، مگر اس طویل عرصے میں صرف مٹھی بھر قبطی ہی دولتِ ایمان سے مالا مال ہوئے، باقی قوم نشۂ اقتدار میں مست ہوکر گمراہی میں مبتلا رہی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے کئی ایسے معجزات عطا کئے تھے جن کو دیکھ کر وہ تائب ہو سکتے تھے اور حق قبول کرسکتے تھے، ان میں سے دو معجزوں کا ذکر پہلے آچکا ہے یعنی وہ عصا جو زمین پر گرتے ہی اژدھے کی شکل اختیار کرلیتا تھا اور دوسرا ہاتھ کا معجزہ کہ بغل میں داخل کرکے نکالنے کے بعد وہ ہاتھ سورج کی طرح روشن ہوجاتا تھا، ان دو معجزوں کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سات اور معجزات عطا کئے تھے جو وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتے رہے، لیکن فرعونیوں پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوا، جب فرعون اور قوم فرعون کی سرکشی حد سے تجاوز کرگئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بددعا کی کے اے اللہ ان پر کوئی عذاب نازل فرما تاکہ وہ اس سے گھبرا کر تیری بڑائی اور کبرائی کا اعتراف کرلیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ دعا قبول ہوئی اور ان پر قحط سالی مسلط کردی گئی، زمینوں نے غلہ اگانا بند کردیا، باغات پھلوں اور میووں سے محروم ہوگئے، قوم فرعون اس عذاب سے سخت پریشان ہوئی، لوگ روتے پیٹتے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ اے موسیٰ! اپنے رب سے کہہ کر ہمیں اس مصیبت سے نجات دلاؤ ہم تمہارے کہنے پر چلیں گے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دُعا کی، قحط سالی ختم ہوگئی اور حالات پہلے جیسے ہوگئے، اس کے ساتھ ہی فرعون کی قوم بھی اپنے وعدے سے مکر گئی، کہنے لگی کہ ہم پر قحط سالی کا عذاب بنی اسرائیل کی نحوست سے آیا تھا، اس کے بعد وقفے وقفے سے ان پر چھ طرح کے دوسرے عذاب آئے، ہر عذاب میں مبتلا ہونے کے بعد یہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی

خدمت میں حاضر ہوتے دُعا کی درخواست کرتے اور اس وعدے کے ساتھ رخصت ہوجاتے کہ ہم آپ کی اطاعت کریں گے، آپ کے رب پر اور آپ پر ایمان لائیں گے، مگر جب عذاب ختم ہوجاتا پھر ان کا حال پہلے ہی جیسا ہوجاتا۔

قرآن کریم میں ان تمام عذابوں کا ذکر موجود ہے چناں چہ قحط سالی کے بعد ان پر پانی کا طوفان آیا، قوم فرعون کے تمام گھروں اور ان کی تمام زمینوں کو پانی نے گھیر لیا، جب کہ بنی اسرائیل کے گھر اور زمینیں پوری طرح محفوظ رہیں، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا سے اس طوفان کا خاتمہ ہوا تو فرعون کی قوم پھر اپنی حالت پر آگئی، اس کے ایک مہینے کے بعد ان پر ٹڈیوں کا عذاب مسلط کیا گیا، جنھوں نے قوم فرعون کی تمام کھیتیاں برباد کردیں، تمام باغات اجاڑ دئے، یہاں تک کہ وہ ٹڈیاں گھروں کے دروازے اور دوسرے سامان بھی چٹ کر گئیں، اس کے بعد جوؤں کا عذاب آیا، ہر شخص کے بدن میں جوئیں پیدا ہوگئیں جنھوں نے ان کا خون چوس لیا، ان کی پلکیں بھنویں بل کہ سر کے بال تک کھالئے، دوسری طرف غلّوں میں گھن لگ گیا، جس سے گھروں میں رکھا ہوا تمام غلہ برباد ہوگیا، اس کے بعد مینڈکوں کا عذاب نازل ہوا، گھر میں، سامان میں، برتنوں میں، یہاں تک کہ چولہے پر چڑھی ہوئی ہانڈیوں تک میں مینڈک پھدکتے پھرتے تھے، اس کے بعد خون کا عذاب آیا، ان کے کھانے پینے کی چیزوں میں، کنویں کے پانی میں ہر جگہ خون ہی خون نظر آتا، یہاں تک کہ دریائے نیل کا پانی تک خون بن گیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزے کا ایک خاص پہلو یہ تھا کہ ان عذابوں میں فرعون کی قوم مبتلا ہوتی اور بنی اسرائیل کے تمام لوگ محفوظ رہتے۔

مصر سے بنی اسرائیل کی ہجرت:

فرعون کی قوم کو طرح طرح کے عذاب دئے گئے، وہ جب بھی کسی عذاب میں مبتلا ہوتے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے روتے، گڑگڑاتے اور ان سے یہ درخواست کرتے کہ وہ انہیں اپنے معبود سے معافی دلا دیں، آئندہ وہ اس کی نافرمانی نہیں کریں گے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا سے جب وہ عذاب ان لوگوں سے اٹھا لیا جاتا وہ پھر

اسی حالت پر آجاتے جس پر تھے، جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ کوئی عذاب ان کو متاثر نہ کرسکا اور وہ اسی طرح نافرمانی اور گمراہی میں مبتلا رہے اور بنی اسرائیل کو اسی طرح اپنی زیادتیوں کا نشانہ بناتے رہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنی قوم کو لے کر اس ملک سے نکل جائیں، اب وقت آگیا ہے کہ فرعون اور اس کی قوم کو تباہ و برباد کردیا جائے، چناں چہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام اور اپنی قوم کے تمام افراد کو لے کر راتوں رات مصر سے نکل گئے، ان کا ارادہ ارض فلسطین کی طرف جانے کا تھا، اور اسی طرف جانے کا ان کو حکم دیا گیا تھا، مصر سے نکلے تو سامنے بحر قلزم تھا جس کو عبور کرنا ضروری تھا، بنی اسرائیل ڈرے سہمے ہوئے تھے کہ کہیں فرعون کا لشکر آکر انہیں پکڑ نہ لے، سامنے ٹھاٹھیں مارتا سمندر دیکھ کر ان کی حالت مزید خراب ہوگئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں تسلی دی کہ ڈرو مت، ہر طرح کا خوف اپنے دلوں سے نکال دو، اس نے تمہیں بہ حفاظت باہر نکالنے کا وعدہ کیا ہے، وہ بہ ہر صورت تمہاری حفاظت کرے گا اور تمہیں فرعون کے ظلم وستم سے بچائے گا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اے موسیٰ اپنی لاٹھی پانی پر مارو تاکہ پانی پھٹ جائے اور سمندر میں راستہ بن جائے اور تم اور تمہاری قوم اس راستے پر چل کر سمندر عبور کرسکے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تعمیل حکم میں اپنی لاٹھی پانی پر ماری، پانی پھٹ کر دونوں جانب دو پہاڑوں کی طرح کھڑا ہوگیا، درمیان میں راستہ نکل آیا، بنی اسرائیل اس راستے پر اتر گئے اور بہ حفاظت دوسری جانب پہنچ گئے، صبح جب فرعون کی قوم بیدار ہوئی تو دیکھا کہ موسیٰ اور ان کی قوم غائب ہے، ان کے مکانات خالی پڑے ہیں، جانور تک موجود نہیں ہیں، فرعون کو اطلاع دی گئی، اس نے حکم دیا کہ بنی اسرائیل کا پیچھا کرو اور انہیں پکڑو، ان لوگوں کے ساتھ وہ خود بھی چلا، بحر قلزم تک پہنچا تو پانی کے بیچ میں راستہ بنا ہوا تھا، دیکھ کر کہنے لگا کہ اے میری قوم کے لوگو! یہ میری کرشمہ سازی ہے، میں نے تمہارے لئے سمندر میں خشک راستہ بنادیا ہے، تم بے خوف وخطر کود پڑو اور تیزی سے آگے بڑھو، چناں چہ فرعون اور اس کی قوم دریا کے اندر بنے اس راستے پر اتر گئے، لیکن جب وہ لوگ دریا کے بیچ میں

پہنچے تو پانی اصل حالت پر واپس آ گیا، فرعون اور اس کے ساتھ جو لوگ آئے تھے پانی میں ڈوبنے لگے، اس وقت انہیں موسیٰ علیہ السلام کے خدا کی یاد آئی، موت کے فرشتے اُن کی آنکھوں کے سامنے تھے فرعون ڈوب رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ میں اس ذات وحدہ لاشریک پر ایمان لاتا ہوں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں، میں اس ہستی کے فرماں برداروں میں سے ہوں، مگر اس وقت اس کا یہ ایمان قبول نہیں ہوا، بل کہ فرشتوں کے ذریعے اس سے کہا گیا کہ تو اب یہ بات کہہ رہا ہے حالاں کہ اس سے پہلے تو اس کا منکر تھا، درحقیقت تو مفسدین میں سے ہے اس وقت فرعون سے یہ بھی کہا گیا کہ آج کے دن ہم تیرے بدن کو ان لوگوں کے لئے جو تیرے بعد آنے والے ہیں محفوظ رکھیں گے اور تجھے نشانِ عبرت بنادیں گے۔

فرعون مصر کی لاش یا نشان عبرت:

قرآن کا یہ دعوی کس قدر سچا ہے فرعون مصر کا ممی شدہ جسم ۱۸۹۸ء میں دریائے نیل کے قریب تبسیہ کے مقام پر شاہوں کی وادی سے اوریت نامی ایک شخص نے دریافت کیا تھا، جہاں سے اس کو قاہرہ منتقل کر دیا گیا، ابلیٹ اسمتھ نامی ایک شخص نے ۸/ جولائی ۱۹۰۷ء کو اس کے جسم کا معائنہ کیا تو اس پر نمک کی جمی ہوئی تہہ دیکھی جو اس بات کی علامت تھی کہ یہ لاش سمندر کے کھارے پانی میں رہی ہے، محمد احمد عدوی ''دعوۃ الرسل الی اللہ'' میں لکھتے ہیں کہ اس لاش کی ناک ندارد ہے، ایسا لگتا ہے جیسے سمندری مچھلی نے اسے کھالیا ہو، بہ ہر حال ہے فرعون کی لاش پانی میں پڑی رہی، پھر اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور اس کے اعلان کے مطابق سمندری لہروں نے اس کو کنارے پر لا کر ڈال دیا جہاں سے اس وقت کے لوگوں نے اٹھا کر اس کو حنوط کر کے محفوظ کر لیا، ہزاروں سال تک یہ لاش اپنی حالت پر کہیں موجود رہی جس کو انیسویں صدی کے سائنس دانوں نے دریافت کر لیا، آج بھی یہ لاش مصر کے عجائب گھر میں موجود ہے اور لوگ اُسے دیکھنے آتے ہیں، یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جو فرعون تھا اس کا نام اعمس دوم تھا فرعون مصر کے بادشاہوں کا لقب تھا۔

قرآن کریم میں یہ واقعات متعدد سورتوں میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، بہ ہر حال دریائے قلزم سے بنی اسرائیل کا سلامتی کے ساتھ گزر جانا اور فرعون اور اس کے لشکر کا ڈوب جانا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک بہت بڑا معجزہ ہے، قرآن کریم میں ہے کہ: وَأَنْجَيْنَا مُوسَىٰ وَمَنْ مَعَهُ أَجْمَعِينَ ثُمَّ أَغْرَقْنَا الْآخَرِينَ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ.(۱)
''ہم نے موسیٰ اور اس کے تمام ساتھیوں کو نجات دی پھر ان کے دشمنوں کو غرق کردیا، بلاشبہ اس واقعے میں اللہ کا زبردست معجزہ ہے اور اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے اور اقرار نہیں کرتے بلاشبہ آپ کا رب ہی سب پر غالب آنے والا اور رحمت والا ہے''۔

بنی اسرائیل کی نافرمانیوں کا آغاز:

بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کی مدد اور نصرت سے دریائے قلزم کے پار اتر گئے، ان کا رخ وادیٔ سینا کی طرف تھا وہاں پہنچ کر انھوں نے اپنے خیمے ایستادہ کئے اور وہاں فروکش ہوگئے، وہاں پہلے سے ایک قوم آباد تھی جو بتوں کی پرستش میں مبتلا تھی، بنی اسرائیل نے اُن کو بتوں کی پوجا کرتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگے کہ اے موسیٰ ہمارے لئے بھی ایسے ہی کچھ معبود بنا دیجئے، ہم بھی ان کو پوجیں گے اور ان کی پرستش کریں گے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنی قوم کی زبانی یہ مطالبہ سنا تو بہت ناراض ہوئے اور کہنے لگے اے میری قوم کے لوگو! تمہیں شرم آنی چاہئے تم اللہ کی پرستش چھوڑ کر بتوں کو پوجنا چاہتے ہو، اللہ تعالیٰ نے تمہیں فرعون سے نجات دی ہے، اور دریا سے بہ حفاظت پار لگا کر یہاں تک پہنچا دیا ہے، تم اللہ کی اس نعمت کی ناقدری کرنا چاہتے ہو، تم کو اللہ کی اور بھی نعمتیں حاصل ہیں، کیا تم کو ان نعمتوں کی بھی قدر نہیں۔

وادیٔ سینا میں بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی بہت سی نعمتوں سے نوازا، وہ ان نعمتوں پر شکر گزار تو کیا ہوتے الٹے نافرمانی اور ناشکری پر کمر بستہ ہوگئے، اس وادی کا موسم بے حد گرم تھا، دور دور تک نہ درخت تھے، نہ سبزہ تھا، اس بے آب و گیاہ اور موسم کے

(۱) سورۃ الشعراء ۶۵-۶۷۔

لحاظ سے گرم ترین وادی میں پہنچ کر بنی اسرائیل کی حالت دگرگوں ہوگئی، انھوں نے اپنے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوکر گرمی کی شکایت کی اور یہ بھی عرض کیا کہ یہاں پانی نہیں ہے، سایہ دار درخت نہیں ہیں، رہنے کے لئے مکانات نہیں ہیں، اوپر آگ برساتا ہوا سورج ہے اور نیچے تپتی ہوئی زمین ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دُعا فرمائی، وحی آئی کہ اے موسیٰ تم اپنی لاٹھی زمین پر مارو، حضرت موسیٰ نے تعمیل حکم میں زمین پر لاٹھی ماری تو پانی کے بارہ چشمے ابل پڑے، بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے، ہر قبیلے کے لئے الگ چشمہ جاری ہوگیا، پانی کی اس بہتات سے وادی کا موسم بھی تبدیل ہوگیا اور بے آب وگیاہ زمین سبزہ زار میں بدل گئی، اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے بادلوں کو یہ حکم دیا کہ وہ ہر وقت بنی اسرائیل پر سایہ فگن رہیں، چناں چہ آسمان بادلوں سے بھر گیا، بنی اسرائیل جدھر بھی جاتے، بادل ان کے ساتھ ساتھ چلتے اور ان پر سایہ کئے رہتے۔

من وسلویٰ:

ایک مرتبہ ان لوگوں نے بھوک کی شکایت کی کہ اس وادی میں کھانے کو کچھ خاص نہیں ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر دُعا کی اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی یہ دُعا اس طرح قبول فرمائی کہ ایک صبح جب بنی اسرائیل سو کر اٹھے تو دیکھا کہ درختوں پر، زمین پر، پہاڑیوں پر، ہر جگہ شبنم کی بوندوں کی طرح سفید سفید چیز بکھری ہوئی ہے، حکم ہوا انہیں اٹھا کر کھاؤ، کھایا تو وہ انتہائی لذیذ حلوی تھا، قرآن کریم میں اس کو مَنّ کہا گیا ہے، ایک مرتبہ ہوا چلی تو بٹیروں کے غول کے غول زمین پر اتر آئے، بنی اسرائیل نے ان کو پکڑ لیا اور ان کا گوشت بھون کر کھایا، اس کو سلویٰ کہا گیا ہے، من اور سلویٰ دو نعمتیں ان کو دی گئیں، دونوں انتہائی لذیذ تھیں، مگر ان کی تسلّی نہیں ہوئی، جلدی ہی وہ ان نعمتوں سے اکتا گئے اور دوسری چیزوں کا مطالبہ کرنے لگے، کہنے لگے کہ ہم یہ حلوی اور یہ گوشت کب تک کھائیں گے آپ ہمارے لئے اپنے رب سے کہہ کر کھیرا، ککڑی، مسور، لہسن اور پیاز جیسی چیزیں منگوائیں تاکہ ہم خوب شکم سیر ہوکر کھاسکیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ: أَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ

أَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ اهْبِطُوْا مِصْرًا فَإِنَّ لَكُمْ مَّا سَأَلْتُمْ.(۱) ''کیا تم اچھی چیزوں کو معمولی اور گھٹیا چیزوں سے بدلنا چاہتے ہو، (اگر ایسا ہے تو) کسی شہر میں جا کر قیام کرو وہاں تمہیں یہ سب چیزیں مل جائیں گی جن کا تم مطالبہ کر رہے ہو'' لیکن یہ بدبخت لوگ اپنے مطالبوں سے باز نہیں آئے اور یہیں سے ان کی ذلت اور نکبت کا دور شروع ہوا۔

مصر میں شاندار واپسی:

کچھ ماہ وسال بنی اسرائیل کے وادیِ سینا میں گزرے جہاں ان کو چشموں کا شیریں اور ٹھنڈا پانی، بادلوں کا گھنا سایہ اور کھانے کے لئے من وسلویٰ میسر تھا، لیکن ان کو یہ عیش وآرام راس نہیں آیا، جلدی ہی ان کی طبیعتیں اوب گئیں اور کچھ نئی چیزوں کو تقاضا کرنے لگیں، حکم ہوا تم مصر واپس جاؤ اور وہاں جا کر قیام کرو، یہ لوگ مصر واپس پہنچے، اس طرح ایک بار پھر وہ زمین اُن سے آباد ہوگئی جہاں سے نکالے گئے تھے، جو شہر انھوں نے فرعون اور اس کی قوم کے لئے تعمیر کئے تھے وہ ان کے مالک بن گئے، جب کچھ وقت مصر میں رہتے گزر گیا تو انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ اب ہم اطمینان وسکون سے ہیں، پریشانی کے دن گزر چکے ہیں، اب ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے لئے کوئی شریعت لے کر آئیں، جو ہماری زندگی کے لئے دستور العمل ہو، ہم اس پر عمل کریں اور اللہ کے یہاں سرخ رو ہوں، اللہ تعالیٰ نے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ چالیس راتیں کوہ طور پر آ کر گزاریں تو ان کو شریعت عطا کی جائے گی، چناں چہ حکمِ الٰہی کی تعمیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کی عبادت کے لئے کوہ طور پر تشریف لے گئے اور اپنے پیچھے اپنے پیغمبر بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو متعین کر گئے کہ وہ ان کی قائم مقامی کریں، قوم کی اصلاح کرتے رہیں اور مفسدین کی راہ پر نہ چلیں، چالیس روز وشب کی طویل عبادت اور چلہ کشی کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تجلّی سے سرفراز کیا گیا، لیکن وہ اس کی تاب نہ لا سکے اور بے ہوش ہو کر گر پڑے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ رب العزت میں عرض کیا تھا کہ یا اللہ مجھے اپنے جمال کا مشاہدہ کرا دیجئے، فرمایا کہ اے موسی! تم مجھے دیکھنے اور میری طرف دیکھنے کی تاب وطاقت نہیں

(۱) البقرہ: ۶۱۔

رکھتے، پہلے تم اس پہاڑ کی طرف دیکھو، میری تجلّی اس پر ہوگی، اگر وہ پہاڑ اس کی تاب لے آیا تو تم بھی مجھے دیکھ سکو گے، چناں چہ حق تعالیٰ نے پہاڑ پر تجلّی فرمائی اور وہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہوگیا، یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ بے ہوش ہوکر گر پڑے، جب ہوش میں آئے تو کہنے لگے کہ میں توبہ کرتا ہوں اور میں سب سے پہلے یقین کرنے والوں میں سے ہوں، اس کے بعد ان کو آسمانی کتاب تورات عطا کی گئی، یہ کتاب تختیوں کی شکل میں تھی، حکم ہوا کہ ان تختیوں کو مضبوطی کے ساتھ پکڑو، اور ان کو لے کر اپنی قوم کی طرف واپس جاؤ، ان تختیوں میں ہم نے نصیحت، احکام اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی ہے۔

سامری کا قصہ:

ادھر حضرت موسیٰ علیہ السلام چالیس دن کی عبادت وریاضت میں مشغول تھے دوسری طرف ان کی قوم جس کو وہ اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کی نگرانی میں چھوڑ کر گئے تھے گوسالہ پرستی میں مبتلا ہوگئی، اس کا قصہ یوں ہوا کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص تھا جس کا نام سامری تھا، اس نے لوگوں سے کہا کہ اگر تم وہ تمام زیورات جو تم نے فرعون کی قوم سے مستعار لئے تھے اور جن کو تم واپس نہ کر سکے تھے میرے پاس لے کر آئے تو میں تم کو تمہارے فائدے کی ایک بات بتلاؤں گا، وہ لوگ زیورات لے کر آئے، سامری نے ان کو گلا کر ایک بچھڑا تیار کیا اور اس میں ایک مٹھی خاک ڈال دی جس سے اس بچھڑے میں زندگی کے آثار پیدا ہوگئے، سامری نے کہا کہ موسیٰ نے تمہارے لئے جس معبود کی نشان دہی کی ہے وہ حقیقی معبود نہیں ہے، حقیقی معبود تو یہ ہے جو میں نے تمہارے لئے تیار کیا ہے، تم اس کی پرستش کرو، بنی اسرائیل سامری کے کہنے میں آکر بچھڑے کی پوجا کرنے لگے، یہ دیکھ کر حضرت ہارون علیہ السلام نے انہیں کافی سمجھایا، بہت لعنت ملامت کی کہ یہ گمراہی ہے، تمہارا حقیقی معبود صرف اللہ ہے، یہ شعبدہ بازی اور سحر ہے، مگر بنی اسرائیل نے حضرت ہارون علیہ السلام کی ایک نہ سنی، یہاں تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور سے شریعت اور تورات کی تختیاں لے کر واپس آگئے۔

حضرت موسیٰ کوہِ طور پر:

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے مطالبے پر کوہِ طور کی طرف روانہ ہو گئے، وہاں انہیں حق تعالیٰ کے حکم کے مطابق چالیس روز وشب عبادت الٰہی میں گزارنے تھے، فرعون کے خاتمے کے بعد مصر میں بنی اسرائیل کی حکومت نئی نئی بنی تھی، ابھی ان لوگوں کو ایک ایسے مربی کی سخت ضرورت تھی جو ان کے ذہن وفکر کی تربیت کرتا اور ان کو راہِ حق پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہنے کی تلقین کرتا رہتا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودگی سے ان کی پرانی فطرت لوٹ کر آ گئی اور وہ سامری کے کہنے میں آ گئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس کی خبر بھی دی گئی اور ان سے یہ سوال بھی کیا گیا کہ اے موسیٰ! اتنی جلدی کیا تھی کہ تم اپنی قوم کو چھوڑ کر ہمارے پاس چلے آئے، حضرت موسیٰ نے عرض کیا: یا اللہ! میں اس لئے جلدی کر رہا تھا کہ اپنی قوم کے لئے دستور العمل اور شریعت لے کر واپس جاؤں، فرمایا تم تو ان کے لئے ہدایت اور شریعت لینے کے لئے یہاں آئے ہو اور وہاں وہ لوگ غیر اللہ کی عبادت میں مصروف ہو گئے ہیں، یہ سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو انتہائی رنج ہوا اور غصہ بھی آیا، اسی حالت میں مصر واپس آئے تو دیکھا کہ واقعی ایک بچھڑا بنا ہوا ہے اور ان کی قوم اس کی پوجا کر رہی ہے، یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام غصے سے کانپنے لگے یہاں تک کہ وہ تختیاں جن پر تورات لکھی ہوئی تھی ان کے ہاتھوں سے گر گئیں۔

حضرت موسیٰ کی وطن واپسی:

سب سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے پوچھا کہ آخر ان پر کیا مصیبت آئی تھی کہ وہ شرک وکفر کی اس دلدل میں غرق ہو گئے، میں تو تم کو اچھی حالت میں چھوڑ کر رخصت ہوا تھا، تم نے یہ کیا حرکت کی کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شرمندہ ہونا پڑا، میں تو تمہاری خواہش پر اور تمہاری درخواست پر کتاب ہدایت لینے کے لئے وہاں گیا تھا، تم نے میرے پیچھے یہ غلیظ حرکت کر کے مجھے بھی رنج وغم میں مبتلا کیا اور اپنے اس معبود حقیقی کے غیض وغضب کو بھی دعوت دی جس نے تمہیں فرعون سے نجات دے کر یہ عزت بخشی کہ آج تم اس کی سرزمین کے وارث اور مالک بن گئے ہو، اظہار تشکر کے طور پر تم اس کی

عبادت تو کیا کرتے تم نے تو اس سے روگردانی کر کے اپنے لئے ایک ایسا معبود بنالیا ہے جس کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے، بنی اسرائیل جواب میں کہنے لگے اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے، ہم سامری کے کہنے میں آگئے، اس نے ہمیں گمراہی کے راستے پر ڈال دیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام سامری کی طرف مڑے اور اس سے پوچھا کہ آخر اس نے ایسا کیوں کیا، بجائے اس کے کہ وہ اپنی حرکت پر نادم اور منفعل ہوتا اس نے ڈھٹائی سے کہا کہ میں اپنی آنکھوں سے وہ چیزیں دیکھتا ہوں جو یہ سب لوگ نہیں دیکھ پاتے، میں نے دیکھا کہ جب اللہ کے فرشتے حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ کے پاس آتے ہیں یا جب وہ فرعون کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے زمین پر اترے تو جہاں جہاں ان کے گھوڑے کے قدم پڑتے تھے وہاں وہاں سبزہ اُگ آتا تھا، گویا ان کے گھوڑے کے قدموں میں زندگی پیدا کرنے والے اثرات تھے، چناں چہ میں نے وہاں سے ایک مٹھی خاک لی اور اس بچھڑے کے جسم میں ڈال دی تو یہ بول اٹھا اور اس میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سامری کی اس ہٹ دھرمی پر سخت غصہ آیا، فرمایا اے سامری! آخرت میں تجھے جو سزا تیرا پروردگار دے گا وہ اسے معلوم ہے جو ظاہر ہے انتہائی دردناک ہوگی، دنیا میں تیری سزا یہ ہے کہ تو پاگلوں کی طرح مارا مارا پھرے گا، لوگوں سے دور بھاگے گا، جو بھی تیرے قریب آنا چاہے گا تو اس سے کہے گا دیکھو میرے قریب مت آنا، مجھے ہاتھ مت لگانا، یہ کہہ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری کا بنایا ہوا بچھڑا توڑ تاڑ کر آگ کے حوالے کر دیا اور اس کی راکھ دریا میں بہا دی، اس کے بعد انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ اگر یہ معبود ہوتا یا اس میں کچھ طاقت ہوتی تو کیا میں اس کا یہ حشر کر سکتا تھا۔

حضرت ہارون علیہ السلام کی صفائی:

طور پر جانے سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو اپنے چھوٹے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کے حوالے کیا تھا کہ وہ ان کی عدم موجودگی میں قوم کی نگرانی کرتے رہیں، حضرت ہارون علیہ السلام صرف بھائی ہی نہیں تھے بل کہ ان کے دست و بازو بھی تھے اور امور پیغمبری میں ان کے مددگار بھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے بھائی

پر بھی غصہ تھا کہ انہوں نے قوم کو گمراہ کیسے ہونے دیا، وہ اپنے بھائی سے اس قدر ناراض تھے کہ آتے ہی ان کی طرف بڑھے یہاں تک کہ ان کے سر کے بال اور داڑھی پکڑ لی اور پوچھنے لگے کہ میں نے تمہیں قوم کا نگراں بنایا تھا، تم نے اپنی ذمہ داری کیوں نہیں نبھائی، حضرت ہارون علیہ السلام نے کمال ضبط کے ساتھ عرض کیا کہ اے میری ماں کے بیٹے (میرے بھائی) میری داڑھی نہ پکڑو اور نہ سر کے بال پکڑو، میں نے قوم کو بہت سمجھایا، ان کی منت خوشامد تک کی لیکن انھوں نے میری ایک نہ سنی، الٹا مجھ پر ناراض ہونے لگے، میں نے سختی اس لئے نہیں کی کہ مجھے یہ خوف تھا کہ کہیں یہ بغاوت پر آمادہ نہ ہو جائیں اور آپ واپس آکر مجھ سے یہ نہ کہیں کہ تم نے حکمت وتدبر سے کام نہیں لیا، قوم میں تفریق پیدا کردی، حضرت ہارون علیہ السلام کی بات سن کر حضرت موسیٰ کا غصہ کچھ کم ہوا اور احساس ہوا کہ قوم خطا کار ہے، ان کے بھائی بے قصور ہیں۔

بنی اسرائیل کو نافرمانی کی سزا دی گئی:

جب یہ سب کچھ ہو گیا تو اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خیال آیا کہ قوم بڑے گناہ میں مبتلا ہو چکی ہے، کیوں کہ شرک سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں ہے، اور جب گناہ بڑا ہے تو اس کا عذاب بھی بڑا ہوگا، یہ سوچ کر مالک حقیقی کی طرف متوجہ ہوئے اور عرض کیا کہ میری قوم سے شرک کا گناہ سرزد ہو چکا ہے اب اس گناہ کی معافی کی کیا صورت ہوگی، وحی آئی کہ اے موسیٰ یہ شرک ناقابل معافی جرم ہے، جن لوگوں نے یہ گناہ کیا ہے ان کو قتل کر دیا جائے اور قتل بھی اس طرح کہ ہر شخص اپنے قریبی عزیز کو قتل کرے یعنی باپ بیٹے کو قتل کرے اور بیٹا باپ کو، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کے فیصلے سے آگاہ کر دیا، چناں چہ قتل کا سلسلہ شروع ہوا، لوگ اپنے قریبی عزیزوں کی گردن اڑانے لگے، جب ایک بڑی تعداد قتل ہو چکی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام بے چین و بے قرار ہو کر بارگاہِ حق میں سجدہ ریز ہوئے اور عرض کرنے لگے، الٰہی ان کی خطا معاف فرما، ان کو اپنی رحمت سے بخش دے، اس طرح تو یہ سب قتل ہو جائیں گے اور کوئی باقی نہ بچے گا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ دُعا قبول ہوئی اور سب کی خطائیں معاف کر دی گئیں۔

معافی کا عام اعلان:

معافی کے اعلانِ عام کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ میں تمہارے لئے کتاب ہدایت (تورات) لے کر آیا ہوں، اب تمہیں اس کے مطابق زندگی گزارنی ہے اور اس کے بتلائے ہوئے راستے پر چلنا ہے، یہ کتاب ہی تمہاری ہدایت کا ذریعہ ہے یہ سن کر قوم کہنے لگی کہ اے موسیٰ! ہم کیسے یقین کریں کہ یہ کتاب جسے تم کتاب ہدایت کہہ رہے ہو اللہ کی کتاب ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب تم پر ہماری ہدایت کے لئے نازل کی ہے، پہلے تم اس پر یقین دلانے کا کوئی طریقہ ڈھونڈو، اور اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ جس ذات نے یہ کتاب تم پر اتاری ہے وہ خود ہم سے بلا واسطہ یہ کہے کہ ہاں یہ میری کتاب ہے، اس کے بعد ہی ہم تمہاری بات کا یقین کریں گے اور اس کتاب پر عمل کریں گے، قوم کا یہ مطالبہ سن کر حضرت موسیٰ سخت پریشان ہوئے، ان کو کافی کچھ سمجھایا بھی، یقین دلانے کی کوشش بھی کی، لیکن وہ لوگ اپنی ضد پر اڑے رہے، بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہار ماننی پڑی مگر انھوں نے یہ بات صاف کردی کہ تم سب لوگ تو میرے ساتھ چل کر حق تعالیٰ سے براہ راست بات چیت نہیں کر سکتے، ایسا کرو کہ اپنے میں سے چند لوگ منتخب کر کے مجھے دو میں ان کو اپنے ساتھ لے کر طور پر جاؤں گا اور حق تعالیٰ سے ان کی بات کرادوں گا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تجویز پر بنی اسرائیل نے ستّر لوگوں کا انتخاب کیا جو اپنے اپنے قبیلوں کے سردار تھے اور معاشرے میں نمایاں حیثیت کے حامل تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام ان ستّر لوگوں کو لے کر کوہ طور کی طرف روانہ ہوئے تاکہ وہ براہ راست حق تعالیٰ سے یہ بات سن سکیں کہ تورات اس کی نازل کردہ کتاب ہے اور پھر یہ لوگ واپس آکر باقی لوگوں کو اس کی خبر دے دیں۔

کوہ طور اور ستّر سرداران بنی اسرائیل:

چناں چہ ستّر سرداران بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ کوہ طور کی طرف روانہ ہوئے تاکہ وہاں جاکر حق تعالیٰ سے براہ راست اس کی تصدیق کرسکیں کہ جو کتاب آپ نے اپنے پیغمبر موسیٰ پر نازل کی ہے وہ واقعی آپ ہی کی نازل کردہ ہے یا موسیٰ

(نعوذ باللہ) جھوٹ بول رہے ہیں، کوہ طور پر پہنچنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا یا اللہ! یہ میری قوم کے ستّر لوگ تورات کی تصدیق کے لئے یہاں آئے ہیں، آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں اپنی مرضی سے یہاں نہیں آیا بل کہ اپنی قوم کی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ان کو لے کر حاضر ہوا ہوں، یہ لوگ چاہتے ہیں کہ میری اور آپ کی بات چیت اپنے کانوں سے سنیں اور واپس جا کر تصدیق کریں، چناں چہ حق تعالیٰ اور پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان جو بات چیت ہوئی وہ ان ستّر آدمیوں نے اپنے کانوں سے سنی، لیکن انھوں نے حق تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا، سرداروں کا اصرار تھا کہ وہ اللہ کی ذات کو بے حجاب دیکھنا چاہتے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو سمجھایا کہ تم مشاہدۂ حق کا تحمل نہیں کر پاؤ گے مگر وہ نہیں مانے، ان کی یہ ضد اُن کے لئے تباہی و بربادی کا سامان بن گئی، دفعۃً ایک ہیبت ناک گرج پیدا ہوئی اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی بجلی چمکی جس نے ان ستّر کے ستّر سرداروں کو چشم زدن میں راکھ کا ڈھیر کر دیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ دیکھ کر پریشان ہوگئے، عاجزی وانکساری سے دست بدعا ہوئے کہ اے اللہ! یہ اپنی نادانی اور بے وقوفی سے بے جا اصرار کر رہے تھے، تو ان کو اتنی بڑی سزا نہ دے اور انہیں معاف فرمادے، باری تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ دُعا قبول فرمائی اور ان کو راکھ کے ڈھیر سے زندہ انسانوں میں تبدیل کر دیا، تب جا کر انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت کا اور تورات کے آسمانی کتاب ہونے کا یقین آیا، واپس آنے کے بعد ان سرداروں نے اپنی قوم سے کہا کہ بے شک موسیٰ اللہ کے پیغمبر ہیں، وہ جو کچھ کہتے ہیں اللہ کے حکم سے کہتے ہیں۔

یقین اور بے یقینی کی کیفیت:

سرداروں نے تو واپس آکر تصدیق کر دی، مگر جو لوگ مصر میں رہ گئے تھے وہ اب بھی یقین اور بے یقینی کی کیفیت سے دوچار رہے، کبھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کوئی حکم مان لیتے اور کبھی ماننے سے انکار کر دیتے، ان کے اس طرز عمل سے حضرت موسیٰ علیہ السلام سخت تکلیف میں تھے، زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ سرداروں کو طور پر لے جا کر تصدیق بھی

کرادی تب بھی ان بدبختوں کو یقین نہیں آتا، چاہیے تو یہ تھا کہ وہ اپنے درمیان ایک جلیل القدر پیغمبر کے وجود، کتاب ہدایت کے نزول، اور فرعون وقت سے نجات کے ساتھ ساتھ ان نعمتوں پر بھی اللہ کا شکرادا کرتے جو ان کو دی جارہی تھیں اور شکرادا کرنے کا بہتر طریقہ یہ تھا کہ اس کے پیغمبر کے کہنے پر چلتے، اس کی اطاعت وفرماں برداری کرتے، اس کے بجائے وہ تمرّد اور سرکشی پر آمادہ ہیں، اور مسلسل انکار اور نافرمانی کی روش پر قائم ہیں، ان حالات سے کبیدہ خاطر ہوکر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا کہ یا اللہ! میری قوم کو میری رسالت کا یقین دلادے، وحی آئی کہ اے موسیٰ! ہم کوہ طور کو حکم دیتے ہیں کہ وہ آکر تمہاری قوم کے سروں پر سایہ فگن ہو اور اپنی زبان سے کہے کہ تم اللہ کے رسول اور اس کے فرستادہ ہو اور جو کتاب تم ان کے پاس لے کر آئے ہو وہ اللہ کی نازل کردہ کتاب ہے، چناں چہ فوراً ہی کوہِ طور وادئ سینا سے اٹھ کر بنی اسرائیل کی بستیوں پر سائبان کی طرح تن گیا اور اس میں سے آواز آنے لگی، یہ عظیم الشان معجزہ دیکھ کر بنی اسرائیل کے دلوں پر ہیبت طاری ہوگئی اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے لگے، اور کہنے لگے کہ ہم موسیٰ پر ایمان لاتے ہیں، جو حکم وہ ہمیں دیں گے ہم اس کی تعمیل کریں گے، اس وقت تو یہ وعدہ انھوں نے کرلیا مگر وہ لوگ اپنے وعدے پر زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکے، دراصل اس قوم کی سرشت میں انا پرستی داخل تھی جو انہیں قبول حق سے باز رکھتی تھی، حالاں کہ وہ اپنی آنکھوں سے اللہ کی نشانیوں کا مشاہدہ کررہے تھے مگر ان کے دلوں پر کسی طرح کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا، اس کو ایک موقع پر اللہ تعالیٰ کچھ اس طرح بیان فرمایا ہے: ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ. (۱) ''پھر تمہارے دل سخت ہوگئے جیسے پتھر بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت'' قرآن کریم نے بنی اسرائیل کی عہد شکنی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے: وَإِذْ أَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ خُذُوْا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخَاسِرِيْنَ. (۲) ''اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تمہارے سروں پر کوہ طور کو اونچا کیا اور

(۱) البقرة: ۷۴۔ (۲) البقرة: ۶۳، ۶۴۔

(تم سے کہا کہ) جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اسے مضبوطی کے ساتھ پکڑو، اور جو کچھ اس میں (احکام وغیرہ) ہے اس کو یاد کرلو تاکہ پرہیزگار بندے بن جاؤ، اس کے بعد تم نے (اس کتاب سے) پیٹھ پھیر لی، اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوتے"۔

بنی اسرائیل کی معاندانہ روش اور اللہ کا فضل وکرم:

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل کی اس معاندانہ روش اور اُن کی مسلسل حکم عدولیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے فضل وکرم کا سلسلہ جاری رکھا اور ان کو موقع ملتا رہا کہ وہ اپنی روش سے باز آئیں اور اللہ کے حکم پر چلیں، لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا کہ یہ قوم ہی بدفطرت ہے، اس کو نہ بدلنا تھا نہ بدلی اور نہ اس نے خود کو بدلنے کی کوشش کی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی کوششوں میں کمی نہیں کی، حق تعالیٰ کی نوازشیں لگاتار جاری رہیں لیکن ان کی سرکشی کا سلسلہ بھی اسی طرح آگے بڑھتا رہا۔

ارضِ مقدس کی وراثت:

قرآن کریم کی سورۂ المائدہ میں ارضِ مقدس کا ذکر ہے، اس سے وہ علاقہ مراد ہے جو آج کل شام اور فلسطین کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے، پہلے یہ ارض کنعان کہلاتا تھا، یہ وہ علاقہ ہے جس میں حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب وغیرہ علیہم السلام پیغمبر پیدا ہوئے، یہ حضرات بنی اسرائیل کے اجداد ہیں، ان سے اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا تھا کہ ہم تمہاری اولاد کو پھر اس سرزمین کا مالک اور وارث بنائیں گے، اس وعدے پر عمل کی فطری صورت یہی تھی کہ بنی اسرائیل جوان اولوالعزم پیغمبروں کی اولاد ہیں، ارضِ کنعان کی طرف کوچ کریں اور جو قومیں وہاں آباد ہیں ان سے دو دو ہاتھ ہوں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے ان تک یہ پیغام پہنچایا گیا کہ وہ جائیں اور ارض مقدس میں داخل ہوں، اور جو قوم وہاں آباد ہے اس کو نکال کر زمام اقتدار سنبھالیں اور عدل وانصاف کے ساتھ زندگی گزاریں، ان سے یہ وعدہ بھی کیا گیا تھا کہ اس معرکے میں اللہ کی نصرت اور مدد تمہارے شامل حال رہے گی، اور فتح وکامرانی تمہارے قدم چومے گی، ارض کنعان کی وہ بستی جہاں

بنی اسرائیل کو جانا تھا اریحاء کہلاتی تھی، طے پایا کہ پہلے بارہ آدمی وہاں جائیں اور اریحاء کی صورت حال کا جائزہ لے کر واپس آئیں، چناں چہ قوم میں سے بارہ آدمی اس مقصد کے لئے منتخب کئے گئے، یہ لوگ اریحاء گئے، واپسی پر انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتلایا کہ جو لوگ وہاں آباد ہیں وہ بہت مضبوط وتندرست وتوانا اور بڑے تن وتوش والے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ یہ باتیں تم میری قوم کو مت بتلانا، ایسا نہ ہو کہ وہ ڈر جائیں اور مقابلے کی ہمت نہ کریں، مگر ان لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نصیحت پر عمل نہیں کیا، دو کے علاوہ تمام لوگوں نے قوم کو آگاہ کر دیا کہ وہ لوگ جن سے تم مقابلہ کرنے جارہے ہو بہت زیادہ قوی الجثہ اور طاقت ور ہیں، یہ سن کر بنی اسرائیل جو پہلے ہی پست ہمتی کا شکار تھے مزید بزدل بن گئے، اُن سے صاف کہہ دیا گیا تھا کہ اگر تم بھلائی چاہتے ہو تو اس سرزمین میں داخل ہو جاؤ، ورنہ تمہارے لئے تباہی وبربادی ہے۔

بنی اسرائیل کی بزدلی:

بنی اسرائیل نے جواب میں کہا کہ اے موسیٰ! جس بستی میں تم ہمیں بھیجنا چاہتے ہو وہاں تو بڑے سخت جان، قدآور، مضبوط جسم والے اور ظالم وجابر قسم کے لوگ رہتے ہیں، ہم کمزور لوگ ہیں، ان کا مقابلہ کیسے کریں گے، جب تک وہ لوگ بستی میں ہیں ہم وہاں نہیں جاسکتے، آپ اپنے اللہ سے کہہ کر پہلے ان سے بستی خالی کرالیں پھر بے شک ہم وہاں جا کر بس جائیں گے، جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے قوم کے بارہ سمجھ دار اور تجربہ کار لوگ صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لئے اریحاء بستی کا دورہ کر چکے تھے اور انھوں نے واپس آکر مفصل رپورٹ پیش کردی تھی، وہاں اس وقت قوم عمالقہ آباد تھی، ان بارہ میں سے دس لوگ وہ تھے جنھوں نے اریحاء کے باشندوں کے متعلق مبالغہ آمیزی سے کام لیا اور ان کی طاقت وشجاعت کے قصے بڑھا چڑھا کر قوم کو سنائے، حالاں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اُن سے فرما چکے تھے کہ تم لوگ قوم سے کچھ مت کہنا اپنی زبانیں بند رکھنا، ایسا نہ ہو وہ لوگ ڈر جائیں اور جانے سے انکار کردیں، بارہ میں سے دو شخص ایسے تھے جنھوں نے اپنی زبان بند رکھی، ان میں سے ایک کا نام یوشع اور دوسرے کا کالب تھا، یہ دونوں حضرت موسیٰ

علیہ السلام کے سچے پیروکار تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ اللہ کے حکم کی تعمیل میں بنی اسرائیل اریحاء کی طرف کوچ کریں اور ان سے طاقت کے بل پر بستی خالی کرائیں، ان دونوں نے اپنی قوم کو سمجھانے کی بڑی کوشش کی، انھوں نے یہاں تک کہا کہ تم ان ظالموں کی بستی میں دروازے کی طرف سے داخل ہونا، اگر تمہارے دلوں میں ایمان ہے تو ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں کہ فتح تمہاری ہوگی، تم ان پر غالب آجاؤ گے، بس اللہ پر بھروسہ رکھو اور ہمت کر کے آگے بڑھو، مگر ان بدبختوں نے صاف انکار کر دیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام بار بار اصرار کرتے، ہمت دلاتے، خوش آئند مستقبل کی منظر کشی فرماتے، مگر ان پر کسی بات کا کوئی اثر نہ ہوتا، ایک روز جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کچھ زیادہ زور ڈالا تو یہ کم بخت انتہائی کبر و نخوت سے کہنے لگے کہ اے موسیٰ! ہم اس شہر میں اس وقت تک داخل نہیں ہوں گے جب تک وہ لوگ اس میں موجود ہیں تم اور تمہارا رب دونوں چلے جاؤ اور ان سے مقابلہ کرو ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔

اللہ کے نبی کی ناراضگی اور قوم کے لئے بد دعا:

بنی اسرائیل کا یہ جواب انتہائی گھٹیا تھا، اللہ اور اس کے مقتدر پیغمبر کی شان میں جو گستاخانہ الفاظ اور جو بے ہودہ لب ولہجہ انھوں نے اختیار کیا تھا اس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام انتہائی افسردہ ہو گئے، اسی افسردگی کے عالم میں انہوں نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ اے اللہ! میں اپنی قوم کو سمجھانے کی پوری کوشش کر چکا ہوں، اس پر کوئی اثر ہونے والا نہیں ہے، بس میں ہوں اور میرا بھائی ہارون ہے، ہم دونوں کے علاوہ کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو تیرے حکم کی تعمیل کرنا چاہتا ہو، کیوں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کی مسلسل نافرمانیوں سے عاجز آچکے تھے اس لئے انھوں نے یہ بھی درخواست کی کہ اب میرے اور میری قوم کے درمیان جدائی پیدا کر دیجئے، اب میں ان کے ساتھ رہنا نہیں چاہتا، وحی آئی کہ اے موسیٰ! تم آزردہ خاطر نہ ہو، ان کی نافرمانی کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے، اس نافرمانی کے بعد اب ان پر انعامات اور نوازشات کے دروازے بند ہو چکے ہیں، ان کو میدان تیہ میں چالیس سال تک بھٹکنے کی سزا دی جارہی ہے، اس وادی میں یہ لوگ منزل کی تلاش میں

بھٹکتے پھریں گے، مگر انہیں منزل نہ ملے گی اور نہ سکون واطمینان حاصل ہوگا، جس ارض مقدس کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا وہ ان پر حرام کردی گئی ہے کہ اب یہ لوگ وہاں نہیں پہنچ پائیں گے، ایسا ہی ہوا، بنی اسرائیل چالیس سال تک وادی سینا میں بھٹکتے پھرتے رہے، اسی لئے اس وادی کو میدان تیہ بھی کہتے ہیں، عربی زبان میں تاہ کے معنی بھٹکنے کے ہیں، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام دونوں کیوں کہ اس قوم میں مبعوث ہوئے تھے اس لئے یہ دونوں حضرات بھی اس دوران اپنی قوم کے ساتھ ہی رہے، اور وہ بھی ارض مقدس میں داخل نہ ہوسکے۔

حضرت ہارون اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کی وفات:

بنی اسرائیل کے عروج وزوال کی داستان اسی قصے پر ختم ہوجاتی ہے، چالیس سال کی اس طویل مدت میں پہلا بڑا اہم واقعہ حضرت ہارون علیہ السلام کی وفات کا پیش آیا، روایات میں ہے کہ اس وادی میں بھٹکتے بھٹکتے بنی اسرائیل ایک پہاڑ کے قریب پہنچ گئے جو مہور کے نام سے مشہور تھی، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام دونوں اس پہاڑ پر چلے گئے اور وہاں اللہ کی عبادت میں مشغول ہوگئے، اسی دوران حضرت ہارون علیہ السلام کی وفات ہوگئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی جگہ ان کی تجہیز وتکفین کی اور پہاڑ سے اتر کر قوم کے پاس تشریف لائے اور انہیں اپنے بھائی کے حادثۂ وفات کی خبر دی، اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا وقت آپہنچا، ایک حدیث میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا وقت قریب آیا تو فرشتۂ اجل ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور کچھ گفتگو کی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے موت کے فرشتے سے فرمایا کہ اگر طویل سے طویل زندگی کا انجام موت ہے تو آج ہی اور ابھی کیوں نہ موت آجائے، موت سے کچھ پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی کہ اے اللہ! اس آخری وقت میں مجھے ارض مقدس کے قریب کردے، چناں چہ ان کو اریحاء بستی کے قریب واقع کثیب احمر (سرخ ٹیلے) تک پہنچا دیا گیا، جہاں ان کی وفات ہوگئی، اسی ٹیلے پر آپ کی قبر ہے جو نبی موسیٰ کے نام سے مشہور ہے، کہتے ہیں کہ یہ جگہ دریائے اردن سے قریب یروشلم سے پچاس کلومیٹر کے

فاصلے پر واقع ہے، آج کل اریحاء کو جیریکو کہا جاتا ہے، یہ فلسطین کا مشہور شہر ہے، اگرچہ یہ شہر اسرائیل کی حدود میں ہے مگر اس کا کنٹرول فلسطینی اتھارٹی کے ہاتھوں میں ہے، فتح بیت المقدس کے موقع پر جب سلطان صلاح الدین ایوبی اس شہر سے گزرے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر پر بھی حاضر ہوئے، اور یہاں ایک مسجد بھی تعمیر کرائی جو آج تک آباد ہے اور یہ مزار بھی مرجع خلائق بنا ہوا ہے، اریحاء یا جیریکو اگرچہ چاروں طرف سے خشک پہاڑیوں اور ریگستانی علاقوں سے گھرا ہوا ہے لیکن اندر سے پورا شہر انتہائی سرسبز وشاداب ہے، کئی طرح کے پھل یہاں پیدا ہوتے ہیں، یہاں کے تربوز اور کھجور بہت مشہور ہے، بخاری شریف میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا قصہ تفصیل کے ساتھ مذکور ہے اس میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا وقت قریب آیا تو حضرت عزرائیل علیہ السلام حاضر خدمت ہوئے اور پیغام اجل پہنچایا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ سن کر فرشتۂ اجل کو ایک طمانچہ مارا جس سے ان کی ایک آنکھ پھوٹ گئی، فرشتہ واپس بارگاہ الٰہی میں پہنچا اور عرض کیا کہ پروردگار آپ نے مجھے ایک ایسے بندے کی روح قبض کرنے کے لئے بھیجا ہے جو موت نہیں چاہتا، اس نے میری آنکھ بھی پھوڑ دی، اللہ تعالیٰ نے فرشتے کی آنکھ درست کر دی اور حکم دیا کہ تم دوبارہ میرے بندے کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ اگر تم طویل زندگی چاہتے ہو تو وہ تمہیں مل جائے گی ایسا کرو کہ تم اپنے دونوں ہاتھ کسی بیل کی کمر پر رکھ دو تمہارے ہاتھوں کے نیچے جس قدر بال آئیں گے ان میں ہر بال کے عوض تمہیں ایک سال کی زندگی مل جائے گی، اس پیغام کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اگر اس طویل زندگی کے بعد بھی موت ہی ہے تو وہ آج ہی کیوں نہ آجائے، میں موت کے لئے تیار ہوں، لیکن میری یہ دُعا ضرور ہے کہ رب کریم مجھے (تدفین کے لئے) ارض مقدس کے قریب کر دے اگرچہ یہ جگہ ایک پھینکے ہوئے پتھر کے فاصلے پر ہو، اس کے بعد سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اگر میں بیت المقدس کے قریب ہوتا تو تمہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر دکھلا دیتا جو ایک راستے کے کنارے پر سرخ ٹیلے کے قریب ہے۔

کچھ ذکر قارون کا:

بنی اسرائیل کا قصہ تو ختم ہو چکا، قرآن کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات کے ضمن میں تین اہم واقعات اور بھی بیان فرمائے ہیں، جن میں سے ایک واقعے کا تعلق قارون سے ہے، یہ بنی اسرائیل ہی کا ایک شخص تھا، مشہور صحابی حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے ایک روایت منقول ہے جس میں کہا گیا ہے کہ قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچا زاد بھائی بھی تھا، انتہائی مالدار تھا، اس کے ساتھ ہی وہ تورات کا حافظ بھی تھا، مال ودولت کی کثرت نے اس کے دل کو پتھر جیسا سخت بنا دیا تھا، غریبوں کی مدد تو کیا کرتا ان کو حقیر اور ذلیل سمجھ کر ان کے ساتھ برا سلوک کرتا تھا، روایات میں ہے کہ فرعون کے زمانے میں وہ بنی اسرائیل کی نگرانی پر مامور تھا، بنی اسرائیل سے قومی تعلق اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قریبی رشتہ رکھنے کے باوجود وہ فرعون کا انتہائی وفادار تھا اور فرعون کے کہنے پر ان کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بھی بناتا رہتا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کو نصیحت کرتے رہتے تھے کہ وہ رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرے، غریبوں کی مدد کرے، اپنے مال کا حق ادا کرے یعنی زکوٰۃ ادا کرے اور صدقہ وخیرات دے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نصیحتیں وہ ایک کان سے سنتا اور دوسرے کان سے نکال دیتا، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام اگرچہ اس کے قریبی عزیز تھے مگر وہ ان دونوں سے حسد بھی کرتا تھا، اس کا خیال تھا کہ دنیوی مال ودولت اور جاہ وحشمت اس کے پاس ہے، اس لحاظ سے بنی اسرائیل کی دینی اور روحانی قیادت کا مستحق وہ ہے، اس کے بجائے موسیٰ اور ہارون دونوں بنی اسرائیل کے سرپرست اور مربی بنے بیٹھے ہیں، اس کو یہ خیال بھی ہوا کہ اگر موسیٰ ہی اس کو اپنا وزیر اور مشیر مقرر کرلیں تب بھی اس کوتاہی کی تلافی ہوسکتی ہے، موسیٰ نے میرے بجائے ہارون کو اپنا وزیر بنا رکھا ہے، اس نے ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس کا شکوہ بھی کیا کہ میں بھی آپ کا بھائی ہوں، میرے اندر ہارون سے زیادہ خوبیاں ں، مجھے میری حیثیت کے مطابق کوئی منصب کیوں نہیں دیا جاتا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ کار نبوت ہے اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے یہ کام اس کے حوالے کر دیتا ہے، میرا

اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہے، اور نہ ہارون ہی کا اس معاملے میں کوئی کردار ہے، اس۔ تم یہ گلے شکوے چھوڑ کر اللہ کی طرف لو لگاؤ، جو مال تمہیں اس نے عطا کیا ہے اس میں سے اس کا حق ادا کرو، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مسلسل نصیحتوں سے تنگ آ کر ایک دن اس نے کہا کہ اے موسیٰ! یہ جو تم بار بار میرے مال و دولت کا ذکر کرتے ہو اور مجھے اللہ کی را میں خرچ کرنے کی تلقین کرتے رہتے ہو تو کیا یہ مال مجھے تمہارے اللہ نے دے رکھا ہے کہ اس کے راستے میں لٹا دوں، یہ مال تو میرے علم، تجربے اور محنت کی دین ہے، میں اس میں سے ایک دمڑی بھی خرچ کرنے والا نہیں ہوں۔

ایک روز جب کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو وعظ و نصیحت کرنے میں مشغول تھے قارون اپنے مال و متاع اور خدم و حشم کے ساتھ جلوس کی شکل میں سامنے سے گزرا، مقصد اپنی طاقت اور دولت کی نمائش تھا، قرآن کریم نے اس کے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ ہم نے اس کو خزانے عطا کر رکھے تھے، روایات میں ہے کہ اس کو حضرت یوسف علیہ السلام کا مدفون خزانہ ہاتھ لگ گیا تھا جس پر وہ اتراتا پھرتا تھا، اس نے یہ خزانہ بند کمروں میں رکھ چھوڑا تھا، ان کمروں پر تالے لگے رہتے تھے، ان کی تالیوں کا بوجھ اتنا تھا کہ اگر کچھ لوگ مل کر بھی ان کنجیوں کو اٹھائیں تو بوجھ سے ان کی کمر دوہری ہو جائے، جب وہ اپنے خزانوں کی نمائش کرتا ہوا گزرا تو بنی اسرائیل کے بعض لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا اور بعض نے اپنے اس خیال کا برملا اظہار بھی کر دیا کہ کاش ہمارے پاس بھی اسی قدر مال و دولت ہوتی، ہم بھی اسی طرح خزانوں سے لدے اونٹ اور گھوڑے لے کر نکلتے، ہمارے پاس بھی اتنی کنجیاں ہوتیں کہ انہیں چند لوگ مل کر بھی نہ اٹھا پاتے، بعض سمجھ دار لوگوں نے ان کو نصیحت کی تم اس کی ظاہری شان و شوکت اور اس کی دنیوی جاہ و حشمت پر نہ جاؤ، جو کچھ اس کے پاس ہے وہ چند روزہ ہے، تم دیکھو گے کہ عنقریب وہ اپنی دولت کے ساتھ قصۂ پارینہ بن جائے گا، یہی ہوا جس وقت وہ اپنے مال کی نمائش کرتا ہوا گزرا، اس کے ہونٹوں پر تمسخرانہ مسکراہٹ اور آنکھوں میں اللہ کے نیک بندوں کے لئے حقارت تھی، انجام یہ ہوا کہ زمین کا سینہ شق ہوا اور وہ اسی جگہ اپنی دولت و ثروت کے ساتھ دھنستا

چلا گیا، بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ وہ اپنے محل میں تھا، اللہ کے حکم سے وہ محل قارون سمیت زمین کے اندر سما گیا، اس طرح قارون کو دنیا ہی میں اس کے کبر ونخوت اور تمرد وسرکشی کی سزا مل گئی، آج بھی لوگ جب کسی صاحب ثروت مغرور ومتکبر شخص کو اپنے مال و دولت پر غرور کرتا ہوا دیکھتے ہیں تو اسے قارون سے تشبیہ دیتے ہیں، یہ واقعہ کب پیش آیا اس کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا البتہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب بنی اسرائیل فرعون سے نجات پانے کے بعد مصر میں فروکش تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وادیِ تیہہ میں پیش آیا ہو، قرآن کریم نے سورۂ قصص میں یہ واقعہ بنی اسرائیل کے قصے کے بعد ذکر کیا ہے، اس سے بعض اہل علم نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ قارون کا قصہ وادیٔ تیہہ میں پیش آیا۔

ایک قتل کا واقعہ:

قرآن کریم میں ایک اور واقعہ بھی مذکور ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک مرتبہ کسی شخص کا قتل ہو گیا، قاتل کا پتہ نہیں چل پا رہا تھا جس کی وجہ سے سب لوگ پریشان تھے، تفسیر کی کتابوں میں لکھا ہے کہ انجان قاتل کے ذریعے قتل کا یہ واقعہ تورات کے نزول سے پہلے کا ہے، بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ ہماری تمام تر کوششوں کے باوجود قاتل کا پتہ نہیں چل پا رہا ہے آپ اپنے رب سے کہیں کہ وہ قاتل کی نشان دہی کر دے تاکہ ہم اس کو سزا دے سکیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دُعا کی، وحی آئی کہ اے موسیٰ! ان سے کہو کہ ایک گائے ذبح کرو قاتل کا پتہ چل جائے گا، اگر یہ قوم فطرت سلیمہ کی حامل ہوتی تو پیغمبر کے کہنے پر فوراً گائے ذبح کر کے مقصد تک پہنچ جاتے، اس کے بجائے وہ یہ حکم سن کر کہنے لگے کہ کیا آپ ہم سے مذاق کر رہے ہیں، کہاں قاتل اور کہاں گائے کو ذبح کرنے کا معاملہ، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: **استغفر اللّٰہ، نعوذ باللّٰہ!** کیا تم مجھے جاہل سمجھتے ہو، ارے بھائی یہ حکم خداوندی ہے، یہ حکم سننے کے بعد اگر وہ گائے کاٹ دیتے تو معاملہ آسان تھا لیکن چوں کہ فطرت میں کج روی تھی اس لئے انھوں نے گائے کی نسل اور رنگ وروپ کے متعلق سوالات شروع کر دئے، کہنے لگے کہ اے موسیٰ اپنے رب سے پوچھ کر بتلا دیجئے کہ وہ گائے کیسی ہونی چاہئے، موسیٰ نے کہا اللہ فرماتا ہے کہ گائے نہ

بوڑھی ہو اور نہ نوخیز بل کہ بڑھاپے اور جوانی کے درمیان میں ہو، ساتھ ہی حضرت موسیٰ نے یہ بھی فرمایا کہ اب تعمیل حکم کرڈالو، مگر انھوں نے پھر پوچھا کہ اس کا رنگ بھی تو معلوم کر کے بتلادیجئے، فرمایا اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ گائے کا رنگ گہرا زرد ہونا چاہئے اور رنگ بھی ایسا ہو جو دیکھنے والوں کی آنکھوں کو بھلا لگے، کہنے لگے کہ معاملہ کچھ الجھ سا گیا ہے آپ اللہ تعالیٰ سے پوچھ کر بتلائیں کہ گائے کس طرح کی ہو، اللہ نے چاہا اب ہم اس گائے تک پہنچ جائیں گے جس کو ذبح کرنا مقصود ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اللہ کہتا ہے کہ وہ گائے ایسی ہونی چاہئے جو زمین جوتنے والی نہ ہو اور نہ کھیت میں پانی دینے والی ہو، بے عیب ہو، کسی طرح کا کوئی داغ اس میں نہ ہو، کہنے لگے اب آپ نے ٹھیک بات بتلائی ہے، اس کے بعد انھوں نے ان صفات کی حامل گائے تلاش کی اور اس کو ذبح کیا، حدیث میں ہے اگر وہ لوگ اتنی حجتیں نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتنی قیود نہ لگائی جاتیں، جو گائے بھی وہ ذبح کردیتے کافی ہوجاتی، بہ ہر حال گائے ذبح کی گئی، مذبوح گائے کا ایک ٹکڑا مقتول کے جسم سے لگایا گیا جس سے وہ زندہ ہوگیا اور اس نے قاتل کا نام بتلا دیا، روایات میں ہے کہ قاتل کا نام بتلانے کے بعد وہ شخص دوبارہ مرگیا۔

حضرت خضر علیہ السلام کا ذکر خیر:

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات کا قصہ بھی بڑی اہمیت کا حامل اور نہایت سبق آموز ہے، قرآن کریم میں یہ قصہ سورۂ کہف میں مذکور ہے، بخاری شریف اور مسلم شریف میں حضرت ابی ابن کعبؓ کی روایت کے ذریعے بھی اس قصے کی بہت سی تفصیلات ہمارے سامنے آئی ہیں۔

حضرت خضر علیہ السلام ایک بزرگ شخصیت ہیں جن کی پیدائش حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانۂ نبوت کے کچھ بعد ہوئی، ان کا اصل نام بلیا ہے یہ سریانی لفظ ہے، عربی میں اس کا ترجمہ ہے احمد، ان کی کنیت ابو العباس ہے اور والد کا نام ملکان ہے، خضر کے معنی سبز کے ہیں، یہ بزرگ جہاں بیٹھتے تھے وہ جگہ اللہ کے حکم سے سرسبز وشاداب ہوجاتی تھی، انھوں نے لمبی عمر پائی، قرآن کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ان کی

ملاقات کا قصہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام کی پیدائش کے چھ سو سال بعد پیدا ہوئے، تفسیر صاوی میں ہے کہ انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف بھی حاصل کیا ہے، بعض کتابوں میں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ سے ملاقات کا ذکر بھی ملتا ہے، عمدۃ القاری شرح بخاری کے مصنف علامہ بدر الدین عینیؒ نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ زیادہ تر اہل علم کی رائے یہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں، بعض لوگ انہیں ولی اور بعض نبی کہتے ہیں لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تنبیہ اور آگاہی:

اس تفصیل کے بعد اب ہم اصل قصے کی طرف آتے ہیں، روایات میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو پند و نصیحت فرما رہے تھے، اسی دوران ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے سوال کیا، اے موسیٰ! انسانوں میں سب سے زیادہ علم رکھنے والا کون ہے، کیوں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نظر میں ان سے بڑا کوئی عالم نہیں تھا، اس لئے انھوں نے جواب میں کہہ دیا کہ میں اس زمانے کے انسانوں میں سب سے زیادہ علم رکھنے والا ہوں، بہ ظاہر یہ جواب درست تھا کیوں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نبی تھے اور ان کے علوم کا سرچشمہ وحی الٰہی تھی، وہ توراۃ کا بھی مکمل علم رکھتے تھے، اس لحاظ سے اگر انھوں نے خود کو سب سے زیادہ علم رکھنے والا کہا تو اس میں غلط کچھ بھی نہ تھا، مگر اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند نہیں آئی، کیوں کہ اس میں ایک طرح کا عُجب اور خود پسندی ہے، وحی آئی کہ اے موسیٰ! تم جس منصب پر ہو اس کا تقاضا یہ تھا کہ تم اس معاملے کو اللہ کے حوالے کرتے اور کہتے کہ اللہ ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کون زیادہ علم رکھنے والا ہے، تم نے اللہ کے سپرد کرنے کے بجائے یہ دعویٰ کر ڈالا کہ تم ہماری مخلوق میں سب سے زیادہ علم رکھتے ہو، حالاں کہ ہمارا ایک بندہ اور ہے جو مجمع البحرین پر رہتا ہے وہ تم سے زیادہ دانا و بینا اور عالم و فاضل ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا، الٰہا: جب وہ مجھ سے زیادہ علم رکھنے والے ہیں تو مجھے ان سے ملنے اور ان سے استفادہ کرنے کی اجازت دیجئے اور یہ بتلایئے کہ وہ کہاں ملیں گے، وحی آئی کہ

تم ان سے مجمع البحرین پر ملاقات کر سکتے ہو، میرے اس بندے تک پہنچنے کا طریقہ یہ ہے کہ تم اپنے توشہ دان میں ایک مچھلی رکھ لو، جس جگہ پہنچ کر مچھلی گم ہو جائے وہ ہی جگہ تمہاری منزل ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک مچھلی اپنے توشہ دان میں رکھی اور اپنے خادم یوشع بن نون کو ساتھ لیا اور مجمع البحرین کی طرف روانہ ہو گئے۔

قرآن کریم نے اس جگہ کو مجمع البحرین کہا ہے، یہ وہ جگہ ہے جہاں دو سمندر ایک ساتھ ملتے ہیں، قرآن کریم میں دوسری جگہوں پر بھی دو سمندروں کے ملنے کا ذکر آیا ہے، العربیہ ڈاٹ نیٹ کے مطابق مجمع البحرین کے اصل مقام کا تعین مصر کے ماہر آثار قدیمہ ڈائرکٹر جنرل رائے آرکیالوجیکل اسٹیڈیز ڈاکٹر عبدالرحیم ریحان نے کیا ہے، انھوں نے بتلایا کہ سورۂ کہف میں جس جگہ کو مجمع البحرین کہا گیا ہے وہ مصر کے معروف سیاحتی مقام شرم الشیخ کے قریب واقع ہے، آج کل اسے راس محمد کے نام سے جانا جاتا ہے، جزیرہ نما سینا کے جنوب میں واقع خلیج العقبہ اور خلیج السویز یہاں پر ایک دوسرے سے ملتی ہیں، ایسی جگہ کرۂ ارض پر کسی اور مقام پر نہیں ہے، اس سے ثابت ہوا کہ وہ جگہ جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات ہوئی تھی وہ جگہ یہی ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام کی تلاش:

بہ ہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے رفیق سفر کے ساتھ روانہ ہوئے، دوران سفر ایک جگہ آرام کے لئے رُکے اور ایک پتھر پر سر رکھ کر لیٹ گئے، اچانک توشہ دان میں رکھی ہوئی مچھلی حرکت میں آئی اور نکل کر سمندر میں چلی گئی، مچھلی کا زندہ ہو جانا اور توشہ دان سے نکل کر سمندر میں چلے جانا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک زبردست معجزہ تھا، اس کے ساتھ ہی دوسرا معجزہ یہ رونما ہوا کہ وہ مچھلی سمندر میں جس طرف بہتی ہوئی گئی وہاں ایک خشک راستہ بنتا چلا گیا، یہ راستہ وہاں تک بنتا چلا گیا جہاں تک وہ مچھلی بہتی ہوئی گئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نیند سے بیدار ہوئے تو آگے چل پڑے، خادم کو یاد ہی نہیں رہا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مچھلی کے زندہ ہونے، سمندر میں بہہ کر جانے اور سمندر کے اندر خشک راستہ بن جانے کا واقعہ بیان کرنا، ایک دن اور رات کا مزید سفر کرنے کے بعد وہ

دونوں ایک جگہ پہنچ کر رُک کے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خادم سے کہا کہ ہمارا ناشتہ لاؤ، ہم اس سفر سے کافی تھک گئے ہیں، یہاں تک واقعہ ذکر فرمانے کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کبھی تھکن محسوس نہیں ہوئی تھی، بہ ہر حال جب انھوں نے ناشتہ طلب کیا تو یوشع بن نون نے عرض کیا کہ اس سے پہلے ہم لوگ جہاں ٹھہرے تھے اور جہاں آپ نے آرام فرمایا تھا وہاں مچھلی زندہ ہوکر پانی میں چلی گئی تھی، جب آپ بیدار ہوئے تو میں آپ سے اس واقعے کا تذکرہ کرنا بھول گیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ جگہ جہاں مچھلی زندہ ہوئی تھی ہماری منزل تھی، اب ہمیں واپس جانا ہوگا، چناں چہ دونوں حضرات واپس اسی جگہ کے لئے روانہ ہوئے جہاں مچھلی زندہ ہوئی تھی، ایک رات دن کا سفر کر کے پھر واپس اسی جگہ پہنچے، وہاں پہنچ کر دیکھا کہ جس پتھر پر دو روز پہلے وہ سر رکھ کر آرام کر رہے تھے اسی پتھر پر سر رکھ کر کوئی شخص لیٹا ہوا ہے اور اس نے سر سے پاؤں تک چادر تان رکھی ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بلند آواز سے سلام کیا، سونے والے شخص نے جو حضرت خضر علیہ السلام تھے حیرت سے کہا کہ اس جنگل بیابان میں کون ہے جو سلام کر رہا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میرا نام موسیٰ ہے، حضرت خضر نے پوچھا بنی اسرائیل والے موسیٰ، آپ نے جواب دیا کہ میں موسیٰ بنی اسرائیل ہوں اور آپ سے ملاقات کے لئے حاضر ہوا ہوں، مجھے آپ وہ علم سکھلا دیجئے جو اللہ تعالیٰ نے بہ طور خاص آپ کو عطا فرمایا ہے، حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے، میرے پاس ایک علم ہے جو آپ کے پاس نہیں ہے، اور آپ کو بھی اللہ کی طرف سے ایک علم عطا ہوا ہے جو میرے پاس نہیں ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ان شاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے، میں آپ کے ساتھ رہوں گا اور کسی بھی معاملے میں آپ کی مخالفت نہیں کروں گا، حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا: ٹھیک ہے، آپ میرے ساتھ چلیں لیکن آپ مجھ سے کسی بھی معاملے میں کوئی سوال اس وقت تک نہیں کریں گے جب تک میں خود ہی آپ کو اس کی حقیقت نہ بتلا دوں۔

ملاقات کے بعد:

اس باہمی قول وقرار کے بعد یہ دونوں جلیل القدر ہستیاں دریا کے کنارے کنارے چلنے لگیں، کچھ ہی دور چلے تھے کہ سامنے سے ایک کشتی آتی ہوئی نظر آئی، حضرت خضر علیہ السلام نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو کنارے پر بلایا اور دریا کے دوسری طرف لے جانے کا کرایہ پوچھا، کشتی والے حضرت خضر علیہ السلام کو پہچانتے تھے اس لئے انھوں نے ان دونوں حضرات کو بغیر کرائے کے کشتی پر سوار کرلیا، کشتی کچھ ہی آگے بڑھی تھی کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ایک کلہاڑی لی اور کشتی کا ایک تختہ اکھاڑ ڈالا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حالاں کہ خاموش رہنے کا وعدہ کیا تھا مگر یہ دیکھ کر ان سے چپ نہ رہا گیا اور کہنے لگے کہ کشتی کے مالکان نے ہمیں بلا معاوضہ سوار کیا اور آپ نے اس حسن سلوک کا یہ بدلہ دیا کہ ان کی کشتی کا تختہ توڑ دیا، اس سے کشتی بھی خراب ہوگئی اور اس کے ڈوبنے کا خطرہ بھی پیدا ہوگیا، یہ تو بہت ہی غلط حرکت کی ہے آپ نے، حضرت خضر علیہ السلام نے یاد دلایا کہ آپ مجھ سے خاموش رہنے کا وعدہ کر چکے ہیں، آپ مجھ سے میرے کسی قول وفعل کے بارے میں کوئی سوال نہیں کرسکتے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شرمندگی کے ساتھ کہا کہ میں اپنا وعدہ بھول گیا تھا، آپ ناراض نہ ہوں، یہ قصہ بیان کرنے کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ واقعی حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنا وعدہ بھول گئے تھے، اس لئے وہ سوال کر بیٹھے تھے، تھوڑی دیر کے بعد ایک چڑیا آئی اور اس نے کشتی پر بیٹھ کر سمندر سے ایک قطرہ پانی کا پیا، حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ میرے اور آپ کے پاس جو علم ہے اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں اس کی اتنی حقیقت بھی نہیں ہے جتنی حقیقت سمندر کے مقابلے میں اس قطرے کی ہے جو چڑیا کی چونچ میں گیا ہے۔

ایک بستی کا واقعہ:

کچھ ہی دیر بعد ایک بستی آئی اور یہ دونوں حضرات وہاں اتر گئے، کچھ آگے بڑھے تو دیکھا کہ چند بچے میدان میں کھیل رہے ہیں، حضرت خضر علیہ السلام نے ان میں سے ایک بچے کو پکڑا اور اس کو قتل کردیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ دیکھ کر اپنے اوپر ضبط نہ

کر سکے، کہنے لگے کہ یہ آپ نے کیا کیا، ایک معصوم بچے کو جو اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھیل کود کر رہا تھا بغیر کسی وجہ کے قتل کر ڈالا، یہ تو گناہِ عظیم ہے، حضرت خضر علیہ السلام نے کہا کہ میں تو پہلے ہی یہ بات کہہ چکا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہ کر پائیں گے۔ حالاں کہ میں نے پہلے ہی آپ سے یہ وعدہ لے لیا تھا کہ جب تک میں خود سے کچھ نہ بولوں آپ خاموشی اختیار کیے رہیں گے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ معاملہ کیوں کہ بہت سخت ہے، مجھ سے صبر نہ ہو سکا، اس لئے سوال کر لیا، اس کو نظر انداز فرمائیں، البتہ اس کے بعد اگر میں نے کوئی سوال کیا تو آپ کو حق ہوگا کہ آپ مجھ سے خود کو جدا کر لیں، اس عہد و پیمان کے بعد یہ لوگ پھر آگے بڑھے، راستے میں ایک بستی پڑی، ان حضرات نے چاہا کہ وہاں قیام کریں، بستی والوں سے ان لوگوں نے کھانا بھی طلب کیا اور شب گزاری کی اجازت بھی چاہی مگر انھوں نے نہ کھانا دیا اور نہ بستی میں ٹھہرنے کی اجازت دی، واپس چلے تو ایک دیوار نظر آئی جو گرنے کے قریب تھی، حضرت خضر علیہ السلام نے اس دیوار کو ہاتھ لگا کر سیدھا کر دیا، یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ بستی والوں نے نہ ہمیں اپنے یہاں رکنے دیا اور نہ ہمیں کھانے کو پوچھا حالاں کہ ہم اس بستی میں نو وارد مہمان تھے، انسانیت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ہمارے ساتھ اچھا سلوک کرتے، آپ نے ان بدبختوں کی دیوار سیدھی کر دی، یہ کام کرنا ہی تھا تو کچھ اجرت ہی طے کر لیتے، حضرت خضر علیہ السلام نے کہا اب بہت ہو چکا میرا اور آپ کا ساتھ نبھنے والا نہیں ہے، آپ خود بھی کہہ چکے ہیں کہ آپ نے اب کچھ پوچھا تو میں آپ سے الگ ہو سکتا ہوں، اس لئے بہتر یہی ہے کہ آپ اپنا راستہ پکڑیں اور میں اپنی راہ چلوں، اب ہماری اور آپ کی جدائی کا وقت آ گیا ہے۔

کشتی کا واقعہ:

اس کے بعد حضرت خضر علیہ السلام نے تینوں واقعات کی حقیقت سے پردہ اٹھایا، پہلا واقعہ کشتی میں سوراخ کرنے کا تھا اور حضرت موسیٰ کا اعتراض بھی اپنی جگہ درست تھا کہ ایک تو کشتی والوں نے ہم سے کرایہ نہیں لیا اس پر آپ نے ان کے احسان کا یہ بدلہ دیا کہ ان کی اچھی خاصی کشتی میں عیب پیدا کر دیا، دوسرے یہ کہ آپ کی اس حرکت سے دریا کا

پانی کشتی میں آجائے گا اور کشتی اپنے مسافروں سمیت ڈوب جائے گی، حالاں کہ کشتی میں پانی نہیں آیا، روایات میں ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے دوبارہ تختہ اسی جگہ لگا دیا تھا، بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ تختہ تو نہیں لگایا البتہ اس جگہ کوئی شیشہ وغیرہ لگا دیا تا کہ پانی کی رکاوٹ ہو جائے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ پانی کشتی میں آسکتا تھا مگر بہ طور معجزے کے ایسا نہیں ہوا، یہ کشتی دس بھائیوں کی تھی جن میں سے پانچ معذور تھے، باقی پانچ بھائی محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے ان معذور بھائیوں کا پیٹ پالتے تھے یہ کشتی ہی ان کی گزراوقات کا واحد ذریعہ تھی، اس وقت یہ کشتی جس بستی کی طرف رواں دواں تھی وہاں کا حاکم ظالم وغاصب تھا اس کے علاقے سے جب بھی کوئی اچھی کشتی گزرتی وہ زوروزبردستی کر کے کشتی والوں سے ان کی کشتی چھین لیتا، حضرت خضر علیہ السلام نے چاہا کہ یہ کشتی ان بے چارے غریب بھائیوں کی ملکیت میں رہے اور وہ ظالم بادشاہ ان کی کشتی نہ ہتھیائے، اس لئے انھوں نے اس کا تختہ اکھاڑ کر اس کو عیب دار کر دیا، یہی ہوا بھی جب اس بادشاہ کے کارندوں نے شکستہ کشتی دیکھی تو اس کو جانے کی اجازت دے دی اس طرح ان کی کشتی محفوظ رہی۔

معصوم بچے کا قتل:

دوسرا واقعہ معصوم بچے کے قتل کا تھا، حضرت خضر علیہ السلام نے اس واقعے کی حقیقت یہ بیان کی کہ اس بچے کی طبیعت میں کفر تھا، وہ بڑا ہو کر اپنے والدین کا نافرمان بننے والا تھا، جب کہ اس کے والدین نیک اور صالح ہیں، مجھے معلوم تھا کہ یہ بچہ بڑا ہو کر اپنے والدین کو تکلیف پہنچائے گا، کفر میں مبتلا ہو گا جس کی وجہ سے اس کے ماں باپ بھی اپنی محبت اور شفقت کی وجہ سے خطرے میں پڑ سکتے تھے، وہ لڑکا ان کے ایمان کے لئے بھی آزمائش کا باعث بنتا اس لئے میں نے اسے قتل کر ڈالا، اور ہم نے یہ سوچا کہ اللہ تعالیٰ اس کے نیک دل ماں باپ کو اس لڑکے کے بدلے میں اس سے بہتر اولاد دے گا جو اخلاق واعمال کے اعتبار سے بھی اچھی ہو گی اور والدین کا فرماں بردار بھی بنے گی، بعض روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بچے کے والدین کو ایک بیٹی عطا کی، جس سے ایک نبی پیدا

ہوئے، بعض حضرات نے لکھا ہے کہ دو نبی پیدا ہوئے، روایات میں یہ بھی ہے کہ اس نبی سے اللہ تعالیٰ نے ایک بڑی امت کو ہدایت کا راستہ دکھلایا۔

تیسرا واقعہ دیوار سیدھی کرنے کا تھا، اس کے متعلق حضرت خضر علیہ السلام نے کہا کہ یہ دیوار یتیم بچوں کی ملکیت تھی، اور اس کے نیچے ان بچوں کے والدین کا چھوڑا ہوا خزانہ دفن تھا، اگر یہ دیوار گر جاتی تو خزانہ ظاہر ہو جاتا اور لوگ یتیم بچوں کا خزانہ لوٹ لیتے اور جب بچے بڑے ہوتے تو انہیں کچھ نہ ملتا، آپ کا رب چاہتا ہے کہ یہ خزانہ اس کے حقیقی وارثوں کو ملے، اس لئے میں نے ان کی دیوار کو گرنے سے بچالیا، بہ ہر حال یہ تین واقعات ہیں اور ان تینوں واقعات کی مصلحت اور حکمت یہ ہے، اب آپ ہمارے ساتھ نہیں رہ سکتے۔

حضرت یوشع بن نون علیہ السلام

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رفیق سفر:

حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کی ملاقات کے ضمن میں ایک ایسے شخص کا ذکر آیا ہے جو بہ طور رفیقِ سفر یا بہ حیثیتِ خادم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مجمع البحرین کی طرف روانہ ہوا تھا، قرآن کریم میں کئی مرتبہ اس شخص کا تذکرہ کیا گیا ہے، سورۂ کہف میں تین مرتبہ، ایک جگہ فرمایا گیا: ''اور جب موسیٰ نے کہا اپنے جوان سے'' دوسری جگہ فرمایا: ''پھر جب دونوں پہنچے'' تیسری جگہ ارشاد ہے: ''جب یہ دونوں آگے بڑھے'' تمام مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ یہاں جس جوان کا ذکر کیا گیا ہے اس سے حضرت یوشع بن نون علیہ السلام مراد ہیں، یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سچے پیروکار تھے، جو بارہ سرکردہ حضرات اریحاء بستی کا جائزہ لینے کے لئے گئے تھے ان میں حضرت یوشع بن نون بھی شامل تھے، قرآن کریم کے پارہ (۶) رکوع (۸) میں ہے قَالَ رَجُلَانِ (دو شخصوں نے کہا) میں سے ایک یہی ہیں اور دوسرے سے کالب بن یوحنا مراد ہیں، ان دونوں حضرات نے

بھی اریحاء میں وہ سب کچھ دیکھا جو باقی دس افراد نے دیکھا تھا مگر واپس آنے کے بعد وہ ڈر کر بیٹھ نہیں گئے، بل کہ انھوں نے قوم کو سمجھانے کی کوشش کی اور خود بھی جہاد پر جانے کے لئے مستعد رہے، یوشع حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھانجے اور ان کے جانشین تھے، ان کی جانشینی کا ذکر کتاب استثناء کے باب ۳۱ میں ہے، ان کا زمانہ چودھویں صدی قبل مسیح کا ہے، عہد نامہ قدیم کی ایک کتاب یشوع بھی ان کی طرف منسوب ہے، عیسائی انہیں یشوع بن نون کہتے ہیں جب کہ بخاری، مسلم، ترمذی وغیرہ حدیث کی کتابوں میں ان کا نام یوشع بن نون ہے، تفسیر رازی میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کو بنی اسرائیل کا نبی بنایا گیا۔

حضرت یوشع بن نون کا ایک واقعہ:

حضرت یوشع بن نون بڑے بہادر اور جری انسان تھے، تفسیر طبری میں ان کا یہ واقعہ لکھا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر سمندر کے کنارے پہنچے تو حضرت یوشع علیہ السلام نے پوچھا کہ آپ کے رب نے کس طرف جانے کا حکم دیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ سمندر کے دوسری طرف، یہ سن کر انھوں نے اپنا گھوڑا سمندر میں ڈال دیا، سمندر کے بیچ میں پہنچ کر پھر واپس آئے اور تین مرتبہ ایسا ہی کیا، اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی آئی کہ آپ سمندر کے پانی پر اپنا عصا ماریں، چناں چہ انھوں نے عصا مارا جس سے پانی میں بارہ راستے بن گئے، بنی اسرائیل کے ہر قبیلے کے لئے الگ راستہ تھا، تمام قبیلے اپنے اپنے راستوں پر چل کر سمندر عبور کرنے کے بعد خشکی پر پہنچ گئے، قصص القرآن میں تورات کا یہ اقتباس نقل کیا گیا ہے "اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی زندگی ہی میں اس بات سے آگاہ کر دیا تھا کہ یوشع میرے خاص بندے ہیں، اور بنی اسرائیل کے نوجوان انہی کی قیادت میں کنعان اور بیت المقدس کو ظالموں اور جابروں سے پاک کریں گے"۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جانشینی:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ بنی اسرائیل کی

نافرمانی اور سرکشی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک عبرتناک عذاب میں مبتلا کر دیا تھا اور وہ عذاب تھا مسلسل چالیس برس تک میدان تیہہ میں بھٹکتے پھرنا، چناں چہ پوری قوم چالیس سال تک اس میدان میں بھٹکتی رہی، اور ارض مقدس میں داخل ہونے سے انکار کرنے کی سزا پاتی رہی، چالیس سال کی اس مدت میں پہلے حضرت ہارون علیہ السلام کی وفات ہوئی، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وفات پائی، ان دونوں حضرات کے رخصت ہونے کے بعد بنی اسرائیل کی قیادت وسیادت حضرت یوشع بن نون کے سپرد ہوئی، جب چالیس سال مکمل ہو گئے تو حضرت یوشع علیہ السلام کو حکم ہوا کہ وہ بنی اسرائیل کو لے کر قوم عمالقہ سے جنگ کے لئے نکلیں، اور اس جابر وظالم قوم سے بیت المقدس کو خالی کرائیں، آپ نے اپنی قوم کو بتلایا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں قوم عمالقہ سے جنگ کرنے اور بیت المقدس فتح کرنے کا حکم دیا ہے، بنی اسرائیل چالیس سال کی جلاوطنی اور در بدری سے گھبرا چکے تھے، حضرت یوشع علیہ السلام کی یہ بات سن کر کہنے لگے، اے یوشع! ہم ہر طرح تیار ہیں، چناں چہ حضرت یوشع علیہ السلام بنی اسرائیل کے جنگجوؤں کو لے کر وادیٔ سینا سے نکلے، ارض مقدس کا پہلا شہر اریحاء تھا جسے آج کل جریکو کہا جاتا ہے، بنی اسرائیل کا پہلا نشانہ یہی شہر تھا، وہاں پہنچ کر انھوں نے قوم عمالقہ کو للکارا، کئی دن کی زبردست جدوجہد کے بعد شہر پناہ کے دروازے کھل گئے اور بنی اسرائیل کے جوان اپنے نبی کی قیادت میں عمالقہ کے جوانوں کو تہہ تیغ کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے، مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ پہلا موقع تھا جب بنی اسرائیل نے اپنی بہادری کے جوہر دکھلائے، اس کی ایک وجہ تو وہی تھی جو ہم نے ابھی بیان کی ہے کہ چالیس سال کی طویل سزا نے ان کو توڑ کر رکھ دیا تھا اور اب ان کے سامنے اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا کہ وہ جس حکم عدولی کی پاداش میں یہ سزا بھگت کر فارغ ہوئے ہیں اب اس کا اعادہ نہ کریں، تاکہ مزید ایسے کسی عذاب سے محفوظ رہیں، دوسرے ان کے ذہن میں یہ بات آگئی تھی کہ ارض مقدس پر ہمارا حق ہے، کیوں کہ یہ ہمارے آباؤ واجداد کی سرزمین ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اسے ان کی اولاد کو لوٹانے کا وعدہ کیا ہے، تیسرے انہیں یقین تھا کہ اس جنگ میں وہ غالب رہیں

گے، کیوں کہ اللہ کے نبی ان کے ساتھ ہیں اور اللہ ان سے فتح ونصرت کا وعدہ کر چکا ہے، بہ ہر حال کامیابی بنی اسرائیل کے قدم چومتی چلی گئی اور وہ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا شہر فتح کرتے چلے گئے یہاں تک کہ تمام ارض بیت المقدس پر قابض ہوگئے۔

سکینۂ بنی اسرائیل:

قرآن کریم میں ہے کہ اس جنگ میں ان کے ساتھ سکینہ بھی تھا، اس سکینہ کی موجودگی بھی بنی اسرائیل کے لئے اطمینان کا باعث تھی، سکینہ دراصل ایک تابوت تھا جس میں اہم تبرکات تھے، جیسے حضرت موسیٰ کا عصا، حضرت ہارون کا کرتا، مَنّ کا مرتبان، اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا کہ وہ کسی برتن میں من (آسمانی غذا) کو محفوظ کرلیں تاکہ تمہاری آنے والی نسلیں بھی اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ تم پر اللہ تعالیٰ نے کیسے کیسے انعامات کئے ہیں، تفسیر ماجدی میں لکھا ہے کہ یہ صندوق بنی اسرائیل کا اہم ترین ملی وقومی ورثہ تھا، اس میں تورات کا اصل نسخہ بھی محفوظ تھا، اور انبیاء بنی اسرائیل کے تبرکات بھی رکھے ہوئے تھے، بنی اسرائیل اس صندوق کو بڑا مقدس اور نہایت بابرکت سمجھتے تھے، اور اس کا انتہائی احترام کرتے تھے، یہ صندوق سفر، حضر، جنگ اور امن ہر حالت میں ان کے ساتھ رہتا تھا، بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ صندوق حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ جنت سے اتارا گیا تھا جو بہ طور میراث ایک سے دوسرے تک منتقل ہوتا رہا، یہاں تک کہ بنی اسرائیل کو مل گیا، قوم عمالقہ کے ساتھ جنگ میں یہ صندوق کہیں گم ہوگیا، یا عمالقہ اسے چھین کر لے گئے اور انھوں نے اسے ضائع کردیا، اس سلسلے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا، یہودیوں کو یقین ہے کہ یہ تابوت آج بھی بیت المقدس میں کہیں محفوظ ہے، چناں چہ وہ اس کی تلاش میں مسلسل سرگرداں رہتے ہیں، مسجد اقصیٰ کے آس پاس کھدائی کا عمل بھی اسی صندوق کی تلاش کے لئے کیا جاتا ہے، دیوار گریہ کے پاس جاکر یہودیوں کی آہ وبکا اسی صندوق کی گم شدگی کے غم میں صدیوں سے جاری ہے، بہ ہر حال بنی اسرائیل فاتح تو ہوگئے لیکن اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے، اللہ تعالیٰ نے حضرت یوشع علیہ السلام کی

معرفت انہیں حکم دیا تھا کہ وہ مفتوحہ شہر میں عاجزی وانکساری کے ساتھ کمر کو جھکا کر داخل ہوں اور زبان سے حِطَّةٌ کہتے رہیں جس کے معنی ہیں بخش دے، معاف کردے، مگر ان ظالموں نے خدائی فرمان میں تبدیلی کی، اور حطة کی جگہ دوسرا لفظ حنطة بدل دیا، ان کی اس حرکت پر آسمانی عذاب نازل کیا گیا، ایک دن طاعون کا عذاب آیا اور دو پہر تک ستر ہزار یہودی مر گئے، حضرت یوشع بن نون علیہ السلام نے ایک سو دس سال کی عمر میں وفات پائی، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قریب دفن کئے گئے۔

حضرت الیاس علیہ السلام

قرآن کریم میں حضرت الیاس علیہ السلام کا ذکر:

قرآن کریم میں حضرت الیاس علیہ السلام کا ذکر دو سورتوں میں آیا ہے، ایک سورۂ الانعام کی آیت ۸۶ میں، اس میں چار انبیاء کا بہ یک وقت ذکر کیا گیا ہے، حضرت زکریا، حضرت یحیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت الیاس علیہم السلام اور چاروں کو صالح کہا گیا ہے، دوسری جگہ سورۂ الصفت کی آیات ۱۲۳ سے ۱۳۲ تک میں ہے، یہ بنی اسرائیل کے نبی ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد پیدا ہوئے، بعض لوگوں نے ان کو حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں شمار کیا ہے، ان کا نسب نامہ اس طرح ہے الیاس بن یاسین بن فخاس بن عیزاء بن ہارون علیہ السلام، بعض حضرات حضرت حزقیل علیہ السلام اور حضرت الیاس علیہ السلام کو ایک ہی مانتے ہیں، مگر تاریخی اعتبار سے یہ نظریہ غلط ہے، ان کی پیدائش حضرت حزقیل علیہ السلام کے بعد ہوئی، حضرت الیاس علیہ السلام مشہور اسرائیلی نبی حضرت یسع علیہ السلام کے چچازاد بھائی بھی ہیں، انجیل یوحنا میں ان کا نام ایلیا بتلایا گیا ہے، بعض حضرات کہتے ہیں کہ ادریس اور الیاس دونوں ایک ہی نبی کے دو نام ہیں، لیکن یہ بات بھی درست نہیں ہے، قرآن کریم میں ان دونوں پیغمبروں کا الگ الگ ذکر کیا گیا ہے، اور ان دونوں کے جو حالات وواقعات بیان کئے گئے ہیں ان سے کہیں یہ پتہ نہیں

چلتا کہ یہ دونوں ایک ہی ہیں، بل کہ دونوں کے واقعات الگ الگ ہیں، مؤرخین نے ان کے نسب نامے بھی الگ الگ لکھے ہیں، ان سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں شخصیتیں الگ الگ ہیں۔

حضرت الیاس علیہ السلام کے مختصر حالات:

حضرت الیاس علیہ السلام اردن کے شہر جلعاد میں پیدا ہوئے، اس وقت اس علاقے پر اخی اب نامی بادشاہ کی حکمرانی تھی، تفسیر ماجدی میں ہے کہ آپ بادشاہ اخی اب کے ہم عصر ہوئے ہیں جو شمالی مملکت کا فرماں روا تھا، اس بادشاہ کا زمانہ ۸۷۵ء تا ۸۵۰ء قبل مسیح ہوا ہے، اس بادشاہ کے زمانے میں جب غیر قوموں میں شادیاں ہونے لگیں تو اس کی ایک بیوی جس کا نام الیزبل تھا اپنے ساتھ بعل نامی بت لے کر محل میں آ گئی، جو سونے کا بنا ہوا تھا، اس کی لمبائی بیس گز تھی اور اس کے چار منہ تھے، یہیں سے بتوں کی پوجا کا آغاز ہوا جو پھیلتے پھیلتے پورے ملک میں اور پوری اسرائیلی قوم میں سرایت کر گیا، اس شرک اور بت پرستی کا مقابلہ کرنے کے لئے جو چند انبیاء کرام مبعوث کئے گئے ان میں ایک اہم نام حضرت الیاس علیہ السلام کا ہے، آپ کی بعثت شام کی طرف ہوئی جس کے شہر بعلبک کو آپ نے اپنی تبلیغی اور دعوتی سرگرمیوں کا مرکز بنایا، یہ شہر اسی بعل نامی بت کے نام پر آباد ہوا ہے اور آج تک اسی نام سے مشہور ہے، اب یہ شہر لبنان میں ہے، قرآن کریم کی جن آیات میں حضرت الیاس علیہ السلام کی دعوت کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہیں۔

وَإِنَّ إِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَلَا تَتَّقُونَ أَتَدْعُونَ بَعْلًا وَتَذَرُونَ أَحْسَنَ الْخَالِقِينَ اللَّهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ فَكَذَّبُوهُ فَإِنَّهُمْ لَمُحْضَرُونَ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ سَلَامٌ عَلَىٰ إِلْ يَاسِينَ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ.(۱)

”اور بے شک الیاس بھی پیغمبروں میں سے ہیں، یاد کرو جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ تم ڈرتے کیوں نہیں، کیا تم بعل کو پکارتے ہو اور سب سے اچھے پیدا کرنے

(۱) الصافات: ۱۲۳-۱۳۲۔

والے کو چھوڑ دیتے ہو، اس اللہ کو جو تمہارا بھی رب ہے اور تمہارے باپ دادا کا بھی رب ہے، انھوں نے الیاس کو جھٹلا دیا، سو وہ (دوزخ میں) حاضر کئے جانے والے ہیں، البتہ وہ لوگ عذاب میں مبتلا نہیں کئے جائیں گے جو اس کے چنیدہ اور برگزیدہ بندے تھے، اور ہم نے ان کا ذکر خیر پچھلوں میں (باقی) چھوڑ دیا، سلام ہو الیاسین پر، ہم نیک لوگوں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں بے شک وہ ہمارے مؤمن بندوں میں سے تھے"۔

بت پرستی کے خلاف جدوجہد:

یوں تو تمام کتب تفاسیر میں حضرت الیاس علیہ السلام کا ذکر موجود ہے، کسی میں مختصر اور کسی میں تفصیل کے ساتھ، مگر سب سے مبسوط تذکرہ تفسیر مظہری نے علامہ بغویؒ کی معالم التنزیل کے حوالے سے کیا ہے، یہ تمام حالات وواقعات بائبل سے ماخوذ ہیں، بعض دوسری تفسیروں میں حضرت وہب بن منبہؒ اور حضرت کعب الاحبارؒ کے حوالے سے بھی لکھا گیا ہے، البتہ اس پر تمام مفسرین متفق ہیں کہ ان کو بعل نامی بت کی پرستش میں مبتلا قوم کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا تھا، کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بھی بعض قومیں اس بت کی پوجا کرتی تھیں، گویا یہ بہت پرانا بت تھا جو بعد تک باقی رہا، قصص القرآن کے مصنف تو حجاز کے مشہور بت ھُبل کو بھی بعل ہی کی بگڑی ہوئی شکل قرار دیتے ہیں، بعل عبرانی لفظ ہے جس کے معنی مالک، سردار، حاکم اور رب کے ہیں، یہ لفظ عربی میں بھی مستعمل ہے جس کے معنی شوہر کے ہیں، عجب نہیں کہ یہ معنی اس لئے ہوں کہ شوہر میں بھی حاکمیت کا عنصر پایا جاتا ہے، جیسا کہ بتلایا گیا کہ اخی اب نامی بادشاہ کی بیوی یہ بت لے کر شاہی محل میں داخل ہوئی اور رفتہ رفتہ پوری قوم اس میں مبتلا ہوگئی، بعل پرستی کا اس قدر رواج ہوا کہ خاص اس کی پوجا کے لئے مختلف موسموں میں میلے ٹھیلے لگنے لگے، اس پر سونے چاندی کے زیورات اور کھانے پینے کی چیزیں چڑھائی جاتیں، اس کو سجایا سنوارا جاتا، شاہی محل میں جو بت تھا اس کی خدمت پر چار سو خدام مامور تھے، محل سے باہر بھی بڑے بڑے معابد بنائے گئے جہاں بعل بت کو رکھا جاتا، اور مجاور اس کی دیکھ بھال کرتے، صبح وشام اس بت کو خوشبوؤں سے نہلایا جاتا، اس کی خوشنودی کے لئے جانور قربان کئے جاتے بل کہ بعض اوقات انسانوں تک کی بلی دی جاتی تھی۔

حضرت الیاس علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے بادشاہ وقت اخی اب اور اس کی رعایا کو توحید کی دعوت پیش کی، مگر چند حق پسند افراد کے سوا کسی نے بھی حضرت الیاس علیہ السلام کی بات پر توجہ نہیں دی، حضرت الیاس علیہ السلام نے اپنا دعوتی کام جاری رکھا، اس سے آپ کی قوم مخالفت پر آمادہ ہوگئی، خود بادشاہ اور اس کی بیوی بھی دشمن بن گئے، قوم تو آپ کا مذاق اڑاتی، آپ پر فقرے کستی اور کبھی ایذاء بھی پہنچاتی، لیکن بادشاہ نے تو یہ منصوبہ بنایا کہ الیاس کو قتل کر دیا جائے، قریب تھا کہ بادشاہ اپنے منصوبے پر عمل کرتا کہ آپ شہر چھوڑ کر ایک غار میں جا کر رہنے لگے، اور ایک لمبے عرصے تک اسی پہاڑ میں مقیم رہے، قوم کی طرف سے دی جانے والی تکلیفوں سے عاجز آ کر حضرت الیاس علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی کہ اے اللہ میری قوم کو قحط سالی کے عذاب میں مبتلا کر دے، مقصد یہ تھا کہ شاید اس عذاب میں مبتلا ہونے کے بعد وہ حقیقی رب کی طرف متوجہ ہوں، اور اس سے عذاب کے خاتمے کی دُعا مانگیں، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ لوگ پریشان ہو کر ان کے پاس آئیں اور ان سے مدد مانگیں اور انھیں اپنا معجزہ دکھلانے کا موقع مل جائے، ہوسکتا ہے ان کا معجزہ دیکھ کر قوم کا دل نرم پڑ جائے اور وہ اللہ پر ایمان لے آئے۔

قحط سالی کا عذاب:

حضرت الیاس علیہ السلام کی دُعا قبول ہوئی، قوم پر قحط سالی کا عذاب مسلط کر دیا گیا، لوگ ایک ایک بوند پانی کو ترس گئے، کھیت ویران ہوگئے، گھروں اور بازاروں میں جو غلہ وغیرہ موجود تھا وہ سب ختم ہوگیا، لوگ بھوک سے مرنے لگے، جانور بھی دم توڑنے لگے تب حضرت الیاس علیہ السلام غار سے نکل کر باہر آئے اور قوم سے کہنے لگے کہ یہ تمہارا بعل کس دن کام آئے گا، اس سے کہو کہ وہ بارش برسا دے تا کہ تمہیں اس قحط سے نجات ملے، اس دن پوری قوم بعل کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی رہی، اور اس سے بارش کی دُعا مانگتی رہی، مگر یہ پتھر یا سونے چاندی کا بے جان جسم بارش تو کیا برساتا ان کے آنسو بھی خشک نہ کر سکا، تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام نے قوم کے لوگوں سے کہا کہ تم کہتے ہو بعل تمہارا خدا ہے، اور اس کے ساڑھے چار سو نبی ہیں، میں کہتا ہوں اللہ ہم سب کا

مالک اور رب ہے اور اس وقت میں اس کا نبی ہوں، تم بعل کے سارے نبیوں کو اکٹھا کرلو اور ان سے کہو کہ وہ بعل کے سامنے اپنی قربانی پیش کریں، میں بھی اپنے اللہ کے سامنے اپنی قربانی پیش کرتا ہوں، دیکھتے ہیں کس کی قربانی قبول ہوتی ہے، اگر تمہارے بعل کے نبی سچے ہیں تو ان کی قربانی کو آسمانی بجلی خاکستر کردے گی اور میں سچا ہوا تو میری قربانی کو آگ کھالے گی، بنی اسرائیل میں قربانیوں کے قبول عدم قبول کا فیصلہ آسمانی بجلی سے ہی ہوا کرتا تھا، قوم نے اس تجویز پر عمل کرتے ہوئے اپنے نبیوں کو جمع کیا، بعل کی خوشنودی کے لئے انھوں نے قربانیاں پیش کیں، صبح سے شام تک دعائیں ہوتی رہیں، قربانی کے جانور یونہی بندھے پڑے رہے، جب سب عاجز آگئے اور کچھ نہ ہوا تو حضرت الیاس علیہ السلام نے اپنی قربانی پیش کی، کچھ ہی لمحے گزرے تھے کہ آسمانی بجلی آئی اور حضرت الیاس علیہ السلام کی قربانی کو راکھ کا ڈھیر بنا گئی، قوم کے لوگ کہنے لگے کہ اگر تیرا خدا ایسا ہے تو اس سے بارش کیوں نہیں مانگتا، حضرت الیاس علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں خشوع وخضوع کے ساتھ دُعا کی، دیکھتے ہی دیکھتے بارش برسنے لگی، کچھ ہی دیر میں سارا علاقہ جل تھل ہوگیا، قوم کے لوگ یہ حقیقی معجزہ دیکھ کر بل کہ پے در پے دو معجزے دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائے بل کہ حضرت الیاس علیہ السلام سے کہنے لگے تم تو جادوگر اور شعبدہ باز ہو، حقیقت یہ ہے کہ ایمان ہر دل میں اپنی جگہ نہیں بناتا، ان کی قوم کے دل بتوں کو پوجتے پوجتے بالکل سیاہ ہوچکے تھے، حضرت الیاس علیہ السلام کی تمام کوششیں ضائع ہوگئیں ان کے تمام معجزات بھی قوم کو راہ حق کی طرف لانے میں مؤثر نہ ہوسکے، بل کہ وہ اور زیادہ حق کے دشمن بن گئے، پوری قوم اس فکر میں لگ گئی کہ حضرت الیاس علیہ السلام کو قتل کردیا جائے، اللہ تعالیٰ نے ان کے منصوبہ ناکام بنادیا اور ان کو اپنے پاس بلالیا، اسرائیلی روایات کے مطابق ان کو آسمان پر زندہ اٹھالیا گیا، لیکن کسی روایت سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی کہ ان کو آسمان پر زندہ اٹھایا گیا ہے، غالب گمان یہی ہے کہ ان کی وفات ہوئی ہے، بعلبک میں جو لبنان کا مشہور شہر ہے حضرت الیاس علیہ السلام کا مزار ہے، اس کے قریب ہی حضرت معاذ بن جبلؓ کی ہمشیرہ حضرت حفصہؓ کی قبر بھی ہے۔

حضرت الیسع علیہ السلام

حضرت الیسع علیہ السلام بھی انبیاء بنی اسرائیل میں سے ہیں، پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ یہ حضرت الیاس علیہ السلام کے چچازاد بھائی ہیں، عمر میں ان سے چھوٹے تھے، شروع ہی سے ان کے ساتھ رہے اور وفات کے بعد اُن کے جانشین بھی بنے، اللہ تعالیٰ نے انہیں نبوت سے بھی سرفراز فرمایا۔ قرآن کریم میں دو جگہ حضرت الیسع کا ذکر آیا ہے، اور دونوں جگہ نہایت اختصار کے ساتھ ہے، ارشاد ربانی ہے: وَإِسْمَاعِيلَ وَالْيَسَعَ وَيُونُسَ وَلُوطًا وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعَالَمِينَ.(۱) ''اور اسماعیل اور الیسع اور یونس اور لوط ان سب کو ہم نے دنیا والوں پر فضیلت بخشی''۔

دوسری جگہ فرمایا: وَاذْكُرْ إِسْمَاعِيلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ وَكُلٌّ مِّنَ الْأَخْيَارِ(۲) ''اور آپ اسماعیل اور الیسع اور ذوالکفل کو بھی یاد کیجئے ان میں سے ہر ایک بہترین لوگوں میں سے تھے'' قرآن کریم میں اس سے زیادہ تذکرہ نہیں ملتا، البتہ مورخین لکھتے ہیں کہ ان کی بعثت بھی حضرت الیاس علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل ہی میں ہوئی اور ان کی دعوت بھی تورات ہی کی طرف تھی جیسا کہ ان تمام انبیاء نے تورات کی تعلیمات کو اپنی دعوت کی بنیاد بنایا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد مبعوث کئے گئے ہیں، تفسیر قرطبی میں ہے کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت الیسع اور حضرت الیاس علیہما السلام دونوں ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں، یہ خیال صحیح نہیں ہے، بل کہ یہ دونوں الگ الگ ہیں، حضرت الیسع حضرت الیاس کے شاگرد بھی ہیں، یہ دونوں حضرت زکریا، حضرت یحیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام سے پہلے گزرے ہیں، بعض لوگ حضرت ادریس اور حضرت الیاس علیہما السلام کو بھی ایک کہتے ہیں، یہ بھی غلط ہے، حضرت ادریس حضرت نوح علیہما السلام کے دادا ہیں اور حضرت الیاس علیہ السلام ان کی اولاد میں سے ہیں۔

(۱) الانعام:۸٦۔ (۲) سورہ ص آیت:۴۸۔

حضرت ذوالکفل علیہ السلام

قرآن کریم میں حضرت ذوالکفل کا ذکر بھی دو آیتوں میں ہے ایک سورۂ الانبیاء کی آیت ۸۶ میں اور دوسری جگہ سورۂ ص کی آیت ۴۸ میں، دونوں جگہوں پر حضرت ذوالکفل کا تذکرہ حضرت اسماعیل، حضرت ادریس اور حضرت الیسع علیہم السلام جیسے اولو العزم پیغمبروں کے ساتھ کیا گیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بھی اللہ کے نبی تھے، بعض حضرات کہتے ہیں کہ حضرت ذوالکفل نبی نہیں تھے بل کہ ایک نیک انسان تھے، بعض لوگ حضرت الیسع کا دوسرا نام ذوالکفل بتلاتے ہیں اور بعض حضرت یوشع بن نون علیہ السلام اور حضرت ذوالکفل کو ایک قرار دیتے ہیں، مگر اکثر حضرات کی رائے یہ ہے کہ حضرت ذوالکفل مستقل نبی تھے جن کی بعثت حضرت الیسع علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل میں ہوئی، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذوالکفل انبیاء بنی اسرائیل میں سے ہیں، اور بنی اسرائیل کے ان حالات وواقعات کے سوا جن کی تفصیلات قرآن عزیز میں مختلف انبیاء بنی اسرائیل کے ذکر میں آتی رہی ہیں ان کے زمانے میں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا جو عام تبلیغ وہدایت سے زائد اپنے اندر عبرت وبصیرت اور موعظت کا پہلو رکھتا ہو، اس لئے قرآن عزیز نے ان کے نام پر ہی اکتفا کیا" (۱)۔ احادیث سے بھی آپ کے حالات پر روشنی نہیں پڑتی، بائبل میں سرے سے آپ کا ذکر ہے ہی نہیں، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ذوالکفل گوتم بدھ کا لقب ہے، کفل دراصل کپل وستو کا معرب ہے، جو بدھ کا دارالحکومت تھا، ذوالکفل کے معنی ہیں کپل وستو کے مالک۔

ان کے متعلق کافی کچھ قصے مشہور ہیں مگر وہ سب اسرائیلی روایات سے ہم تک پہنچے ہیں جن کا کوئی اعتبار نہیں ہے، بعض لوگوں نے حضرت ذوالکفل کو بنی اسرائیل کے ایک شخص جس کا نام کفل تھا جوڑ دیا ہے، اس کا قصہ یہ ہے کہ کفل بڑا فاسق وفاجر شخص تھا، ہر

(۱) قصص القرآن: ۲/ ۳۴۷۔

وقت فسق وفجور میں مبتلا رہتا، ایک مرتبہ کوئی عورت اس کے قبضے میں آئی، وہ چاہتا تو اس سے زنا کرسکتا تھا لیکن اس نے عورت کی منت وخوشامد کے بعد اسے چھوڑ دیا اور سچی توبہ کرلی، توبہ کے بعد اسی رات اس کا انتقال ہوگیا، صبح کو لوگوں نے اس کے دروازے پر لکھا ہوا دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بخش دیا ہے، بہ ہر حال یہ کفل الگ ہے اور ذوالکفل الگ ہیں، اول الذکر بنی اسرائیل کا ایک عام شخص تھا اور ثانی الذکر اللہ کے رسول ہیں۔

حضرت شمویل علیہ السلام

شموئیل کے معنی:

شمویل عبرانی زبان کا لفظ ہے، اس کی اصل اشمویل ہے، کثرت استعمال کی وجہ سے شمویل ہوگیا، عربی زبان میں اس کا ترجمہ اسماعیل کیا گیا ہے، قرآن کریم میں ان کا تذکرہ نام کے ساتھ نہیں ہے، البتہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۴۶ میں ایک نبی کا ذکر ہے جن سے حضرت شمویل ہی مراد ہیں، وہ آیت یہ ہے: أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ. ''کیا تم کو بنی اسرائیل کی اس جماعت کا حال معلوم نہیں جس نے اپنے زمانے کے نبی سے درخواست کی تھی کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے ہمارے لئے ایک حاکم مقرر کردیجئے'' کیوں کہ وہ نبی جن سے درخواست کی گئی وہ یہی برگزیدہ پیغمبر تھے اور ان ہی کی دُعا سے بنی اسرائیل کو ایک حکمراں عطا کیا گیا تھا جن کا نام طالوت تھا، طالوت اور جالوت دو شخصیتوں کے نام ہیں، یہ دونوں شخصیتیں حضرت شمویل علیہ السلام کے زمانۂ نبوت میں موجود تھیں، قرآن کریم میں ان دونوں شخصیتوں کا نام اور دونوں کا قصہ تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔

حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کے قصے میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ بنی اسرائیل چالیس برس تک وادیِ تیہہ میں بھٹکتے رہے، اسی دوران حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام انتقال

فرما گئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بہ طور رفیق وخادم جو صاحب رہتے تھے ان کا نام یوشع تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد تاج نبوت انہی کے سر پر رکھا گیا، جب یہ نبی بنادیئے گئے اور بنی اسرائیل کی سزا کے چالیس برس بھی پورے ہو گئے تو حکم ہوا کہ ارض مقدس کی طرف بڑھو، اور اسے ظالموں سے خالی کرا کے وہاں امن وانصاف قائم کرو، وہ نبی جن کے ذریعے بنی اسرائیل کو جہاد کا حکم دیا گیا حضرت یوشع علیہ السلام ہی تھے انہی کی قیادت میں بنی اسرائیل کے جنگجو جوان اریحاء بستی میں داخل ہوئے، اور وہاں فتح کے جھنڈے گاڑتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے یہاں تک کہ ارض مقدس کے تمام شہر اور بستیاں بنی اسرائیل کے قبضے میں آگئیں، اس کے بعد حضرت یوشع بن نون نے بنی اسرائیل کی دینی تربیت کا سلسلہ شروع کیا اور وہ تورات کی تعلیمات سے ان کو روشناس کراتے رہے، کیوں کہ بنی اسرائیل میں گھریلو جھگڑے کثرت سے ہوتے تھے اس لئے انھوں نے ایک محکمۂ قضا بھی قائم کیا جو ساڑھے تین سو سال تک قائم رہا، اس دوران بہت سے قاضی مقرر ہوئے، ان میں سے کئی قاضی نبی اور رسول بھی بنائے گئے، حضرت شمویل علیہ السلام بھی پہلے قاضی مقرر ہوئے تھے، بعد میں ان کو نبوت سے بھی سرفراز فرمایا گیا۔

طالوت وجالوت کا قصہ:

حضرت شمویل علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ایک مرتبہ پھر بنی اسرائیل اپنی بداعمالیوں کی زد میں آئے، حضرت الیسع کی وفات کے بعد جالوت نامی ایک حکمراں نے بنی اسرائیل کو اپنے ظلم وتشدد کا نشانہ بنایا اور ان کی بستیوں پر قبضہ کرلیا، جالوت کا تعلق قوم عمالقہ سے ہے، یہ لوگ ارض مقدس سے نکل کر مصر وفلسطین کے درمیان بحر روم پر آباد ہو گئے تھے، جالوت نے بنی اسرائیل کی بستیوں پر ہی قبضہ نہیں کیا بل کہ وہ ان کے سرداروں تک کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گیا، باقی لوگوں پر ٹیکس لگا دیا، تابوت سکینہ بھی چھین کر لے گیا جس میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے تبرکات بھی تھے اور تورات کا اصل نسخہ بھی تھا، بنی اسرائیل کے لئے یہ انتہائی نازک وقت تھا، نہ ان میں کوئی نبی تھا، نہ رسول، نہ ان کا کوئی حاکم تھا اور نہ کوئی قائد، ان دنوں ایک خاتون حمل سے تھیں، ان

کے یہاں ولادت ہوئی، بچے کا نام شمویل رکھا گیا بڑے ہوکر شمویل بنی اسرائیل کے محکمۂ قضا میں قاضی اور پھر نبی بنے، اللہ تعالیٰ نے حضرت شمویل علیہ السلام کے ذریعے ایک بار پھر بنی اسرائیل کو عزت کی زندگی عطا کی۔

جن حالات میں حضرت شمویل علیہ السلام کی بعثت ہوئی بنی اسرائیل کے لئے وہ حالات انتہائی مایوس کن تھے، پوری قوم ذلت ونکبت کی زندگی گزار رہی تھی، تمام سربرآوردہ لوگ عمالقہ کی قید میں تھے، جو لوگ بستیوں میں بچے کھچے موجود تھے ان پر ٹیکس اور جزیہ لگا دیا گیا تھا، غرضیکہ بنی اسرائیل کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا، مایوسی ان کا مقدر بن گئی تھی، ان حالات میں ایک نبی کی بعثت ان کے لئے مژدۂ جانفزاء سے کم نہ تھی، ماضی کی نافرمانیوں سے تائب ہوکر پوری قوم حضرت شمویل علیہ السلام کے قریب آچکی تھی، ایک دن انہوں نے اپنے نبی سے درخواست کی کہ آپ ہمارا کوئی حکمراں یا کوئی بادشاہ مقرر کردیں تاکہ اس کی قیادت میں ہم ایک بار پھر منظّم ہوں اور اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کرلیں، حضرت شمویل علیہ السلام قوم کی تاریخ سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ یہ قوم اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کرنے میں ذرا نہیں جھجکتی، اگر اسے کوئی کام کرنے کے لئے کہا جاتا ہے تو اس میں مناظرہ اور مجادلہ کرتی ہے اس لئے انھوں نے کہا کہ بادشاہ تو میں تمہارے لئے مقرر کرسکتا ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ تم لوگ میرا فیصلہ تسلیم نہیں کروگے، اور اگر تم نے میرے مقرر کردہ بادشاہ کو بادل ناخواستہ تسلیم بھی کرلیا تو تم اس کا حکم نہیں مانوگے، ماضی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تم لوگ ایسا کرچکے ہو، جب تمہارے رب نے تمہیں یہ حکم دیا تھا کہ ارض مقدسہ میں داخل ہوجاؤ تو تم نے یہ حکم ماننے سے صاف انکار کردیا تھا اور کہنے لگے تھے کہ اے موسیٰ تم اور تمہارا رب جاکر لڑلے، ہم تو یہاں بیٹھے نتیجے کا انتظار کریں گے، حضرت شمویل علیہ السلام کی یہ بات سن کر بنی اسرائیل نے کہا، ہم بہت ذلیل اور رسوا ہوچکے ہیں، اب اللہ کا حکم بھی مانیں گے اور اس بادشاہ کے احکام کی تعمیل بھی کریں گے جو آپ ہمارے لئے مقرر کریں گے، قرآن کریم کی اس آیت میں بنی اسرائیل کی درخواست اور حضرت شمویل علیہ السلام کے جواب کی تفصیل اس طرح مذکور ہے: أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا

نُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ قَالَ ھَلْ عَسَیْتُمْ إِنْ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوْا قَالُوْا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَأَبْنَآئِنَا.(۱) ''کیا تم کو بنی اسرائیل کی اس جماعت کا حال معلوم نہیں جس نے موسیٰ کے بعد اپنے زمانے کے نبی سے درخواست کی تھی کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کردیجئے تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں، نبی نے جواب میں کہا کہ کچھ بعید نہیں کہ اگر تم کو جنگ کا حکم دیا جائے تو تم جنگ نہ کرو، کہنے لگے کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کیوں نہ کریں گے جب کہ ہمیں ہمارے گھروں سے نکال دیا گیا ہے اور اپنے بچوں سے جدا کردیا گیا ہے''۔

بنی اسرائیل کے وعدے اور وعدہ شکنی:

بہ ہر حال بنی اسرائیل نے حضرت شمویل علیہ السلام سے یہ عاجزانہ درخواست کی اور یہ وعدہ کرلیا کہ وہ بادشاہ کی حکم عدولی نہ کریں گے، جہاد سے روگردانی نہیں کریں گے اور اللہ کی طرف سے ہمارا جو بھی امتحان لیا جائے گا، ہم اس میں ثابت قدم رہیں گے تب انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ بنی اسرائیل کے لئے کوئی بادشاہ مقرر کردیجئے، اللہ تعالیٰ نے طالوت کو جو علم اور جسم ہر اعتبار سے دوسروں پر تفوق رکھتے تھے بادشاہ کی حیثیت سے مقرر کردیا، پہلے تو وہ بادشاہ کی تقرری کے لئے بے قرار تھے اور نبی کی منت خوشامد کررہے تھے لیکن جیسے ہی انہیں یہ علم ہوا کہ طالوت کو ان کا بادشاہ بنادیا گیا ہے ناراض ہوکر کہنے لگے کہ بھلا طالوت کو ہم پر حکمرانی کا حق کیسے حاصل ہوسکتا ہے، وہ تو مال و دولت سے محروم ہے، ہم اس منصب کے زیادہ اہل ہیں، جواب میں حضرت شمویل علیہ السلام نے صاف کہہ دیا کہ یہ اللہ کا فیصلہ ہے، تم مانو یا نہ مانو، اللہ کا فیصلہ بدلنے والا نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اسی کو پسند کیا ہے، وہ علم میں بھی وسعت رکھتا ہے اور جسمانی اعتبار سے بھی مضبوط ہے، اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی سلطنت عطا کرتا ہے۔

طالوت کی بادشاہت تسلیم کرنے میں بنی اسرائیل کو پس و پیش اس لئے تھا کہ اب تک بنی اسرائیل کی قیادت و سیادت جن قبیلوں کے پاس رہی ہے طالوت کا قبیلہ ان سے الگ تھا، حضرت یعقوب علیہ السلام کے متعدد بیٹے تھے، ان میں سے ایک بیٹے لاوی کی

(۱) البقرہ:۲۴۶۔

نسل میں عرصہ دراز سے نبوت کا سلسلہ قائم تھا، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون وغیرہ انبیاءِ کرام علیہم السلام لاوی ہی کی نسل سے تھے، ایک اور بیٹا یہودا تھا، اس کی اولاد میں بنی اسرائیل کی حکومت چلی آرہی تھی، طالوت کا تعلق بھی اگرچہ خاندان یعقوب سے تھا مگر یہ ان کے بیٹے بن یامین کی اولاد میں سے تھا جو حضرت یوسف علیہ السلام کے چھوٹے بھائی تھے، ان دونوں بھائیوں سے حضرت یعقوب علیہ السلام کے دوسرے بیٹوں کو جو حسد اور عناد تھا وہ سینکڑوں سال گزرنے کے بعد بھی ان کی نسلوں کے اندر موجود رہا، اس لئے انہیں طالوت کی حکمرانی قبول نہیں تھی، حضرت شمویل علیہ السلام کے اس واضح اور قطعی جواب کے بعد ان کے پاس انکار کا تو کوئی راستہ بچا نہیں تھا، آخری حربے کے طور پر انھوں نے یہ تجویز رکھی کہ اگر آپ طالوت کو ہمارا بادشاہ مقرر کرنا ہی چاہتے ہیں تو اس کی صداقت کا امتحان تو ہو جائے، حضرت شمویل علیہ السلام نے کہا کہ طالوت اس منصب کے اہل ہیں یا نہیں اس کا امتحان اس طرح ہوگا کہ تمہارے پاس وہ تابوتِ سکینہ آجائے گا، جس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لئے تسکین قلب کا سامان ہے اور جس میں موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے متروکات ہیں اگر طالوت سچے ہوں گے تو فرشتے وہ صندوق اٹھا کر لے آئیں گے۔

طالوت کی بادشاہت:

تابوت سکینہ کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے، اس صندوق میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے تبرکات بھی تھے اور وہ تختیاں بھی تھیں جن پر تورات لکھی ہوئی تھی، بنی اسرائیل اس تابوت کو جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے، جب بھی کسی قوم سے جنگ ہوتی یہ تابوت آگے آگے رکھا جاتا، اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو فتح سے ہم کنار کر دیتے، شومیٔ قسمت سے یہ تابوت اب بنی اسرائیل کے پاس نہیں تھا، جالوت نے جب بنی اسرائیل پر غلبہ حاصل کیا تو ان سے یہ تابوت بھی چھین کر لے گیا، اس تابوت سے محرومی ان کو بے چین و بے قرار کئے رکھتی تھی، حضرت شمویل علیہ السلام نے یہ تجویز رکھی تو انھوں نے فوراً مان لی، دونوں صورتیں ان کے لئے اچھی تھیں، اگر تابوت واپس مل جاتا

ہے تو یہ ان کی دلی تمنا تھی، نہیں ملتا تو طالوت کی بادشاہت ختم تھی، وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ طالوت بادشاہ نہ رہے اور ہم میں سے کسی کو بادشاہ بنا دیا جائے، لیکن اللہ کو طالوت کی بادشاہت برقرار رکھنا تھی اس لئے تابوت کی واپسی کے حالات پیدا ہوگئے، جالوت کی بستیوں میں طاعون اور دوسری مہلک بیماریاں پھیل گئیں، لوگ مرنے لگے، یہاں تک کہ ان کے پانچ شہر موت کی وجہ سے ویران ہوگئے، جالوت اور اس کی قوم کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جو کچھ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے وہ اس تابوت کی وجہ سے ہے، وہ لوگ اس تابوت کو منحوس سمجھنے لگے، کہاں تو وہ اس کی دل و جان سے حفاظت کرتے تھے کہاں وہ اس سے بے انتہا نفرت کرنے لگے، فیصلہ ہوا کہ تابوت کو دو بیلوں پر لاد کر ہنکا دیا جائے، وہ جہاں چاہیں گے اسے ڈال آئیں گے، چناں چہ انھوں نے اس تابوت کو دو بیلوں کے اوپر لادا اور انہیں جنگل کی طرف ہنکا دیا، فرشتے ان بیلوں کو طالوت کے دروازے تک لے آئے، بنی اسرائیل نے تابوت دیکھا تو انہیں یقین آ گیا کہ طالوت ہی بادشاہت کا مستحق ہے۔

جالوت سے جنگ:

طالوت کی بادشاہت کا اعلان ہوگیا، قدرے پس و پیش کے بعد بنی اسرائیل بھی ان کی بادشاہت پر متفق ہوگئے، جالوت کے خلاف جنگ کا بگل بجا دیا گیا، پہلی بار ایسا ہوا کہ اسرائیلیوں نے از خود جنگ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا، ورنہ اب سے پہلے تو وہ جنگوں وغیرہ سے بچتے رہے ہیں، جالوت نے ان کی بستیوں پر فوج کشی کر کے اسرائیلیوں کو اپنا غلام بنا لیا تھا، اس لئے وہ چاہتے تھے کہ جالوت سے بدلہ لیں اور اپنا کھویا وقار دوبارہ حاصل کریں، طالوت کی قیادت میں ان کا اجتماع اسی خواہش کا اظہار تھا، بادشاہ بننے کے بعد طالوت کا پہلا اعلان یہی تھا کہ جنگ کی تیاری کرو، اس اعلان پر اسّی ہزار لوگوں نے فوج میں شمولیت اختیار کر لی، مگر طالوت کو یقین نہیں تھا کہ یہ تعداد آخر تک ان کے ساتھ رہے گی، قوم کی بزدلی اور آرام طلبی کے تمام واقعات ان کے دل و دماغ میں تازہ تھے، اس لئے انھوں نے سوچا کہ پہلے انہیں آزما لیا جائے، جو لوگ آزمائش کی کسوٹی پر کھرے

اتریں گے انہیں ساتھ رکھا جائے گا، باقی کو واپس کردیا جائے گا، یا وہ خود ہی واپس ہوجائیں گے، موسم گرم تھا، دور دور تک پانی کا نام ونشان نہیں تھا، لشکر آگے بڑھا تو سامنے ایک نہر نظر آئی، طالوت نے اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو ایک نہر سے آزمائے گا، جس نے بھی اس نہر سے پانی پیا وہ اپنا راستہ الگ کرلے، ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، صرف وہ ہی لوگ ہمارے ساتھ آسکتے ہیں جو اس نہر کا پانی نہیں پئیں گے اور صبر وضبط کا مظاہرہ کریں گے، ہاں ایک گھونٹ پانی پینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، لوگوں نے یہ اعلان سنا، لیکن جب ان کے سامنے نہر آئی تو تھوڑے بہت لوگوں کے سوا سب پانی پر ٹوٹ پڑے، جن لوگوں نے ایک گھونٹ پانی پر صبر کیا اللہ تعالیٰ نے ان کی پیاس بجھادی، اور جن لوگوں نے بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے خوب سیراب ہوکر پانی پی لیا، ان کی پیاس تو کیا بجھتی بل کہ پانی کے لئے وہ اور بے تاب ہوگئے، شکم سیر ہوکر پانی پینے کی وجہ سے ان کے لئے آگے بڑھنا مشکل ہوگیا، کہنے لگے اے طالوت تم جاؤ ہم تو آگے نہیں جاسکتے، طالوت کے ساتھ صرف وہ تعداد رہ گئی جو اصحاب بدر کی تھی، یعنی تین سو تیرہ لوگ، باقی سب واپس ہوگئے، صحابۂ کرامؓ جب آپس میں بنی اسرائیل کے واقعات سنتے یا سناتے تو طالوت کا ذکر بھی آتا، یہ حضرات ایک دوسرے سے کہا کرتے تھے کہ اصحاب طالوت کی تعداد بھی اتنی ہی تھی جتنی اصحاب بدر کی تھی، اللہ تعالیٰ نے جس طرح تین سو تیرہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار پر فتح دی اسی طرح اصحاب طالوت نے بھی ایک لاکھ کفار پر غلبہ حاصل کیا، بہ ہر حال، پانی پینے والے یہ کہتے ہوئے اپنے گھروں کی طرف واپس ہوگئے کہ ہمارے اندر تو جالوت سے ٹکرانے کی طاقت نہیں ہے، صرف وہ لوگ رہ گئے جنھوں نے ایک گھونٹ پانی پیا تھا یا بالکل نہیں پیا تھا۔

بنی اسرائیل کی فتح:

عرب مؤرخ مسعودی نے لکھا ہے کہ فلسطین میں بربر قوم آباد تھی، جالوت ان کا بادشاہ تھا، بعض لوگوں نے اس کا تعلق قوم عاد اور قوم ثمود سے بھی بتلایا ہے جو نہایت قد آور اور طاقت ور قومیں تھیں، جالوت کے متعلق بھی تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اس کا قد

چھ ہاتھ اور ایک بالشت تھا، نہایت قوی الجثہ تھا، اسرائیلیوں نے اس کی بہادری کے قصے سن رکھے تھے اس لئے ان کی بڑی تعداد یہ کہتی ہوئی واپس ہوگئی کہ ہم اس سے مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں پاتے، طالوت تو خدا کی طرف سے محاذ جنگ پر بھیجے گئے تھے اس لئے ان کے پیچھے ہٹنے کا تو سوال ہی نہیں تھا، ان کے ساتھ تین سو تیرہ جانباز بھی فلسطین کی طرف بڑھنے لگے، یہ وہ لوگ تھے جن کا خیال تھا جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُو اللّٰهِ كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصَّابِرِينَ.(۱) "ان کو خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے، بسا اوقات چھوٹی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی بڑی جماعتوں پر غالب آجاتی ہیں اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے"۔ بہ ہر حال یہ چھوٹی سی جماعت پورے عزم اور مکمل یقین کے ساتھ جنگ کے ارادے سے آگے بڑھ رہی تھی، ان کی زبانوں پر یہ دُعا تھی: رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ.(۲) "اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں میں صبر پیدا فرما، ہمیں ثابت قدم رکھ اور کفار کے خلاف ہماری مدد فرما"۔

میدان جنگ میں پہنچے تو دیکھا کہ جالوت اپنے ایک لاکھ جوانوں کے ساتھ موجود ہے، اس نے سر سے پاؤں تک پیتل کی زرہ پہن رکھی تھی، یہاں تک کہ پاؤں میں بھی پیتل کے موزے تھے، میدان جنگ کا منظر لرزہ طاری کردینے والا تھا لیکن طالوت اور ان کے ساتھی صبر واستقامت کے ساتھ کھڑے رہے، طالوت نے اعلان کیا کہ جو شخص آگے بڑھ کر جالوت کو ٹھکانے لگائے گا میں آدھی سلطنت اس کے نام کردوں گا، اور شہزادی سے اس کا نکاح ہوگا، اعلان سن کر کچھ لوگ آگے بڑھے لیکن جالوت کا جثہ دیکھ کر واپس آگئے، اتنے میں ایک کم سن نوجوان آگے آیا اور اس نے وہ کر دکھلایا جس کی کوئی بہادر سے بہادر جوان بھی ہمت نہیں کر پارہا تھا، یہ نوجوان حضرت داؤد علیہ السلام تھے، ان کے چھ بھائی جنگ میں شریک تھے، وہ خود نہ جنگ میں شریک تھے اور نہ طالوت کے ساتھ آئے تھے، بل کہ ان کے والد نے انھیں بھائیوں کے حالات معلوم کرنے کے لئے میدان جنگ میں بھیجا تھا، راستے میں ایک جگہ تین پتھر پڑے ہوئے تھے، پتھروں سے آواز آئی، اے داؤد ہمیں

(۱) البقرہ:۲۴۹۔ (۲) البقرہ:۲۵۰۔

اٹھالو، ہم جالوت کو قتل کریں گے، داؤد علیہ السلام نے پتھر اٹھالئے، میدان جنگ میں پہنچے تو وہاں کا منظر دیکھ کر داؤد سے رہا نہ گیا، انہیں اسرائیلیوں کی کم ہمتی پر افسوس بھی ہوا کہ وہ جالوت کو دیکھ کر گھبرا رہے ہیں، کسی میں اتنا حوصلہ نہیں کہ وہ اس کا مقابلہ کرسکے، داؤد علیہ السلام حالاں کہ نوعمر بچے تھے، مگر وہ یہ منظر دیکھ کر اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکے، انھوں نے طالوت بادشاہ سے عرض کیا کہ ان کو جالوت کا مقابلہ کرنے کی اجازت دی جائے، بادشاہ نے کم سنی کے خیال سے اجازت نہیں دی، مگر انھوں نے اصرار کیا، مجبور ہوکر طالوت نے انہیں اجازت دے دی، جالوت کے سامنے پہنچے تو اس نے بچہ سمجھ کر کوئی اہمیت نہیں دی بل کہ مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ بچے واپس جاؤ، کیوں تم اپنی جان کے دشمن بن رہے ہو، داؤد تو عزم راسخ کے ساتھ آئے تھے، جالوت کے استہزاء کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا، جو پتھر وہ راستے سے اٹھا کر لائے تھے انہیں غلیل نما کسی چیز میں رکھ کر جالوت کی طرف نشانہ لگایا، خدا کے حکم سے وہ پتھر جالوت کے سر پر لگے، اس کا سر پاش پاش ہوگیا، داؤد علیہ السلام نے آگے بڑھ کر اس کا سرتن سے جدا کردیا، میدان جنگ کا نقشہ بدل گیا، ایک لاکھ کفار ایک کمانڈر کی ذلت آمیز موت دیکھ اس قدر بدحواس ہوئے کہ جس کا جدھر سینگ سمایا ادھر بھاگا چلا گیا، جو لوگ طالوت کے جوانوں کے ہاتھ لگے وہ قتل کردئے گئے، طالوت نے اس جنگ کے اصل ہیرو اور حقیقی فاتح حضرت داؤد علیہ السلام کو وعدے کے مطابق آدھی سلطنت بھی دے دی اور اپنی بیٹی سے ان کا نکاح بھی کردیا، قرآن کریم میں حضرت داؤد علیہ السلام کے اس واقعے کا ذکر حسب ذیل آیت کریمہ میں کیا گیا ہے فرمایا: فَهَزَمُوهُم بِإِذْنِ اللَّهِ وَقَتَلَ دَاوُودُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ ''پھر طالوت کے لوگوں نے اللہ کے حکم سے جالوت کی فوجوں کو شکست دے دی ،ور داؤد نے جالوت کو قتل کردیا، اور اللہ تعالیٰ نے داؤد کو سلطنت اور نبوت عطا کی اور اس کو جو چاہا وہ سکھلایا''۔(۱)

اس تاریخی جنگ کے بعد حضرت شمویل علیہ السلام کی وفات ہوگئی اور حضرت داؤد علیہ السلام کو نبوت عطا کردی گئی۔

(۱) البقرہ:۲۵۱۔

حضرت داؤد علیہ السلام

قرآن کریم میں ذکر:

حضرت شمویل علیہ السلام کے قصے میں ایک بہادر شخص کا ذکر آیا ہے جس نے اپنی کم سنی کے باوجود جالوت جیسے دیوھیکل شخص کو قتل کر دیا تھا، یہ شخص حضرت داؤد علیہ السلام تھے، آپ کی بہادری بنی اسرائیل میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرگئی تھی، حضرت طالوت علیہ السلام نے ان کی شجاعت سے متاثر ہو کر کاروبار سلطنت ان کے حوالے کر دیا تھا اور اپنی بیٹی ان کے نکاح میں دے دی تھی، اللہ تعالیٰ کا ایک اور فضلِ خاص ان پر یہ ہوا کہ ان کو منصب نبوت بھی عطا کر دیا گیا، انبیاء بنی اسرائیل میں یہ پہلے نبی ہیں جن کو دنیا کا تاج وتخت بھی ملا اور نبوت بھی حاصل ہوئی، تمام انبیاء کرام میں یہ دوسرے نبی ہیں جن کو قرآن کریم میں خلیفۃ اللہ کہا گیا ہے، پہلے حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور دوسرے حضرت داؤد علیہ السلام۔ قرآن کریم کی نو سورتوں میں سولہ جگہ آپ کا ذکر آیا ہے، قرآن کریم میں ان کی متعدد خصوصیات ذکر کی گئی ہیں جن میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ نہایت طاقت ور انسان تھے اور دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ بڑے عبادت گزار بندے تھے، قرآن کریم کی اس آیت میں ان دونوں خصوصیتوں کو جمع کیا گیا ہے: وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوُودَ ذَا الْأَيْدِ إِنَّهُ أَوَّابٌ.(۱) ”اور آپ ہمارے بندے داؤد کو یاد کیجئے جو بڑا صاحب قوت تھا اور وہ اللہ کی طرف بہت رجوع ہونے والا تھا“ بخاری میں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی حدیث موجود ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ”نمازوں میں سب سے زیادہ پسندیدہ نماز داؤد علیہ السلام کی ہے اور سب سے زیادہ پسندیدہ روزے بھی داؤد علیہ السلام کے ہیں، وہ آدھی رات تک سوتے پھر اللہ کی عبادت کرتے، رات کے آخری حصے میں پھر سو جاتے، اسی طرح وہ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک

(۱) سورہ ص: ۱۷۔

دن افطار فرماتے، اگر دشمن سے ان کا مقابلہ ہو جاتا تو راہ فرار اختیار نہ کرتے، وہ اللہ کی طرف بہت رجوع کرنے والے تھے"۔(۱)

لحن داؤدی:

حضرت داؤد علیہ السلام بنی اسرائیل کے پیغمبر بنا کر بھیجے گئے، ان کی سلطنت اس سرزمین پر قائم تھی جہاں آج کل فلسطین اور اسرائیل وغیرہ ملک آباد ہیں، آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے پانچ سو سال بعد اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بارہ سو سال قبل تشریف لائے، حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے یہودا آپ کے جد امجد ہیں، حضرت داؤد علیہ السلام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے پانچ سو سال بعد پھر ایک آسمانی کتاب کا نزول ہوا، اور یہ کتاب حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی، قرآن کریم میں اس کو زبور کہا گیا ہے، آپ سے پہلے جتنے بھی انبیاء تشریف لائے انھوں نے تورات پر عمل کیا اور اسی کے احکام پر عمل کرایا، پانچ سو سال کی طویل مدت میں لوگ تورات کی تعلیمات فراموش کر بیٹھے تھے ضرورت تھی کہ ان کو از سر نو خدائی احکام سے روشناس کرایا جاتا، اس کتاب کے ذریعے شریعت موسوی کو از سر نو زندہ کیا گیا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ زبور تورات کا تتمہ اور اس کا اختتامیہ ہے، اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے لئے نئے نئے پیرایہ بیان اختیار کئے گئے ہیں، حضرت داؤد علیہ السلام زبور کی آیات ایک خاص لحن سے تلاوت کرتے تھے جسے سن کر درخت اور پہاڑ تک جھوم اٹھتے تھے اور خدا کی تسبیح بیان کرنے لگتے تھے، یہ ایک معجزہ تھا جو ان کو عطا کیا گیا تھا، اتنی صدیاں گزرنے کے باوجود آج بھی جب کسی خوش گلوقاری کی تعریف کی جاتی ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے لحن داؤدی سے نوازا ہے، روایات میں ہے کہ صحابی رسول حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ کی آواز میں بڑی جاذبیت اور کشش تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ ابوموسیٰ اشعریؓ کو اللہ نے لحن داؤدی بخشا ہے، قرآن کریم کی سورۂ انبیاء، سورۂ السبا اور سورۂ ص میں حضرت داؤد علیہ السلام کے اس خاص وصف کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ جب خوش الحانی کے ساتھ زبور کی تلاوت کرتے تو ان کے

(۱) صحیح البخاری: ۲/۵۰، رقم الحدیث: ۱۱۳۱۔

وجد آفریں نغموں سے پرندے اور چوپائے بھی وجد میں آجاتے، ہوا میں اڑتے ہوئے پرندے آپ کے پاس آکر بیٹھ جاتے اور آپ کی تلاوت سنتے اور خود بھی اللہ کی حمد وثنا اور تسبیح وتہلیل کرتے، یہی نہیں بل کہ پہاڑ تک اللہ کی تقدیس بیان کرنے لگتے، قرآن کریم میں ہے: وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوُدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ.(۱) ''اور ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو تابع کردیا ہے کہ وہ داؤد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں''۔ وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُودَ مِنَّا فَضْلًا يَا جِبَالُ أَوِّبِي مَعَهُ وَالطَّيْرَ وَأَلَنَّا لَهُ الْحَدِيدَ.(۲) ''بے شک ہم نے داؤد کو اپنی جانب سے یہ فضیلت بخشی کہ اے پہاڑ اور پرندو تم داؤد کے ساتھ مل کر تسبیح اور پاکی بیان کرو''۔ إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ وَالطَّيْرَ مَحْشُورَةً كُلٌّ لَّهُ أَوَّابٌ.(۳) ''بے شک ہم نے داؤد کے لیے پہاڑوں کو مسخر کردیا ہے کہ وہ اس کے ساتھ مل کر صبح وشام تسبیح بیان کرتے ہیں، اور پرندوں کے پرے کے پرے جمع ہوجاتے ہیں اور سب مل کر خدا کی حمد کرتے ہیں۔

چرند و پرند کی تسبیح:

جہاں تک چرند و پرند اور شجر و حجر کی تسبیح کا معاملہ ہے تو قرآن کریم بہت واضح طور پر بیان کرچکا ہے کہ زمین و آسمان اور جو کچھ ان میں ہے وہ سب تسبیح بیان کرتے ہیں، مگر ہم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں پاتے، (بنی اسرائیل:۴۴) گویا پوری کائنات اور اس کا ذرہ ذرہ زبان حال سے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کررہا ہے، ہم اپنی ظاہری آنکھوں سے نہ ان کو تسبیح و مناجات میں مشغول دیکھ سکتے ہیں اور نہ اپنے کانوں سے ان کی تسبیح کے الفاظ سن سکتے ہیں اور نہ ہم اپنے قصور فہم کی وجہ سے ان کی تسبیح وتہلیل کا ادراک کرسکتے ہیں، یہ حضرت داؤد علیہ السلام کا شرف و امتیاز تھا کہ وہ کائنات کی تسبیح وتہلیل اپنے کانوں سے سن بھی لیتے تھے اور سمجھ بھی لیتے تھے۔

ہم زبور کا ذکر کررہے تھے یہ دوسری آسمانی کتاب تھی، مسند احمد ابن حنبل کی ایک روایت میں ہے کہ ''زبور رمضان المبارک میں نازل ہوئی''، زبور کی پیشین گوئیوں میں سے ایک کا حوالہ قرآن کریم نے بھی دیا ہے، ارشاد ہے: وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ

(۱) الانبیاء:۷۹۔ (۲) السبا:۱۰۔ (۳) ص ۱۸، ۱۹۔

بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ.(۱) ''اور بے شک ہم نے زبور میں ذکر کے بعد یہ لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے''۔ تمام مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ آیت کریمہ میں نیک اور صالح بندوں کا مصداق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابۂ کرامؓ بالخصوص خلفاء راشدین ہیں جن کے زمانۂ خلافت میں مسلمانوں کو عروج حاصل ہوا اور روئے زمین پر ان کا اقتدار قائم ہوا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا ایک اور معجزہ:

دوسرا معجزہ حضرت داؤد علیہ السلام کو یہ عطا کیا گیا تھا کہ لوہے کو ان کے ہاتھوں میں موم کی طرح نرم بنا دیا گیا، مفسرین نے لکھا ہے کہ لوہا ان کے ہاتھ میں اس قدر نرم کر دیا گیا تھا کہ کوئی چیز بنانے میں ان کو نہ آگ کی ضرورت پڑتی تھی اور نہ ہتھوڑے یا دوسرے آلات کی، وہ لوہے کو جس طرح چاہتے اپنے ہاتھوں سے موڑ توڑ دیتے اور اس سے جو چیز چاہتے بنا لیتے، یہ معجزہ ان کو اس لیے عطا کیا گیا تھا تا کہ وہ لوہے کی زرہ آسانی کے ساتھ بنا سکیں، اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے انہیں زرہ بنانے کا فن بھی سکھلایا، یہی نہیں کہ ایک سادہ سی زرہ بن جائے بل کہ زرہ بنانے میں جو ظاہری خوب صورتی پیدا کی جاتی ہے وہ ہنر بھی انہیں عطا کیا، چناں چہ حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ سے لوہے کی زرہ بنایا کرتے تھے، اس کی کڑیوں کو متوازن اور متناسب رکھتے، نہ ان میں کوئی چھوٹی ہوتی نہ بڑی، اس سے زرہ میں مضبوطی بھی پیدا ہوتی اور وہ دیکھنے میں بھی اچھی لگتی، مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام یہ دُعا مانگا کرتے تھے کہ یا اللہ! کوئی ایسی صورت پیدا فرما دیں کہ میرے لئے ہاتھ کی کمائی آسان ہو جائے، میں چاہتا ہوں کہ میں اپنے لئے اپنے ہاتھ سے کسب معاش کروں، میں اپنا بوجھ بیت المال پر نہیں ڈالنا چاہتا، اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دُعا قبول فرمائی اور ان کو زرہ بنانے کا ہنر دے دیا، بخاری شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ ''اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی محنت سے روزی کمایا کرتے تھے'' اس سے پہلے جو زرہیں متعارف تھیں وہ نہایت وزنی ہوا کرتی تھیں اور دیکھنے میں بھی بھدی ہوتی تھیں، حضرت داؤد علیہ السلام کی تیار کی ہوئی زرہیں ہلکی اور نرم ہوتیں

(۱) الانبیاء:۱۰۵۔

جنھیں پہن کر دشمن سے آسانی کے ساتھ مقابلہ کیا جا سکتا تھا، قرآن کریم میں اس معجزے کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے: وَعَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُوسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُم مِّنۢ بَأْسِكُمْ فَهَلْ أَنتُمْ شَاكِرُونَ. (۱) ''اور ہم نے داؤد کو تمہارے لئے زرہ بنانے کا فن سکھلایا تاکہ وہ زرہ تمہاری لڑائی میں تم کو محفوظ رکھے، تو کیا تم اس نعمت کا شکر بجالاؤ گے''۔

دنیوی نعمتوں پر شکر:

حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جو بے شمار دینی اور دنیوی نعمتیں عطا کی تھیں ان کا فیض نہ صرف حضرت داؤد علیہ السلام کو پہنچ رہا تھا بل کہ ان کے اہل خاندان بھی ان نعمتوں سے مستفید ہو رہے تھے، چناں چہ انہیں حکم ہوا کہ وہ ان نعمتوں پر اللہ کا شکر ادا کرتے رہیں، قرآن کریم میں ہے: اعْمَلُوا آلَ دَاوُودَ شُكْرًا ۚ وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ. (۲) ''اے داؤد کے خاندان والو! شکر کے طور پر اچھے کام کیا کرو، اور میرے بندوں میں بہت کم لوگ شکر کرنے والے ہیں''۔ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے اہل علم نے لکھا ہے کہ داؤد علیہ السلام نے اپنے گھر والوں پر رات دن کے چوبیس گھنٹے اس طرح تقسیم کر رکھے تھے کہ ان کا کوئی لمحہ عبادت الٰہی سے خالی نہ جائے، ہر وقت گھر کا کوئی نہ کوئی شخص اللہ کی عبادت میں مصروف رہتا، اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ نعمتیں پا کر انسان کو غافل نہ ہونا چاہئے بل کہ رات دن خود بھی شکر ادا کرتے رہنا چاہئے اور اپنے گھر والوں کو بھی اس کی تاکید کرنی چاہئے کہ وہ بھی شکر ادا کرتے رہیں، شکر ادا کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ زبان سے شکر کے الفاظ ادا کئے جائیں اور دوسری صورت یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ وقت اللہ کی عبادت میں لگایا جائے، یہ دونوں ہی صورتیں مطلوب ہیں، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہر فرض نماز کے بعد یہ دعا فرمایا کرتے تھے: اَللّٰهُمَّ أَعِنِّي عَلٰى ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ. ''اے اللہ! تیرا ذکر کرنے، تیرا شکر ادا کرنے اور تیری عبادت کرنے پر میری مدد فرما''۔

بنی اسرائیل کے مکر وفریب کا ایک واقعہ:

حضرت داؤد علیہ السلام کی حیات طیبہ میں دو اہم واقعات پیش آئے ہیں، جن میں

(۱) الانبیاء: ۸۰۔ (۲) سبا: ۱۳۔

سے ایک کا تعلق ان کی قوم یہود سے ہے اور دوسرے کا تعلق خود ان کی ذات پاک سے ہے، یہاں ہم اختصار کے ساتھ دونوں واقعات کا ذکر کرتے ہیں، پہلا واقعہ جس کا تعلق قوم یہود سے ہے قرآن کریم کی سورۂ بقرہ کی آیات ۶۵، ۶۶ اور سورۂ الاعراف کی آیات ۱۶۳ تا ۱۶۶ میں مذکور ہے، یہ واقعہ شہر ایلہ کا ہے جو بحر قلزم کے کنارے مدین اور وادیٔ سینا کے درمیان واقع تھا، وہاں کے لوگ جو سب کے سب بنی اسرائیل سے تعلق رکھتے تھے دریا کے قریب رہنے کی وجہ سے مچھلی کے شکار کے عادی تھے، اللہ تعالیٰ نے ان پر ہفتے کے دن شکار کرنا حرام کر دیا تھا، مگر یہودی روز اول ہی سے ربّ کائنات کی حکم عدولی اور اپنے پیغمبروں کی نافرمانی کے عادی تھے اس لئے یہ حرمت ان پر بڑی گراں گزرتی تھی، ویسے بھی ہفتے کے چھ دن تو دریا میں کچھ زیادہ مچھلیاں نظر نہ آتیں لیکن خاص ہفتے کے روز دریا مچھلیوں سے بھر جاتا، یہاں تک کہ مچھلیاں پانی کے اوپر تیرتی ہوئی بھی نظر آتی تھیں، مچھلیوں کو دیکھ کر ان کے منہ میں پانی آجاتا، مگر پابندی کی وجہ سے شکار نہ کر پاتے، اس کی سبیل انھوں نے یہ نکالی کہ وہ دریا کے پانی کو کاٹ کر گڑھوں میں جمع کر لیتے، پانی کے ساتھ مچھلیاں بھی آجاتیں، اتوار کے دن یہ لوگ مچھلیوں کو اپنے برتنوں میں سمیٹ لیتے، اس طرح وہ مچھلیوں کا شکار بھی کر لیتے، اور ہفتے کے دن شکار کرنے کے گناہ سے بھی خود کو محفوظ سمجھتے، حالاں کہ یہ کھلم کھلا اللہ کو دھوکا دینا تھا، بعض لوگ ایسا کرتے کہ مچھلیوں کو کسی ڈور وغیرہ میں جکڑ لیتے اور اس کا سرا زمین میں کسی پتھر وغیرہ سے باندھ دیتے اگلے دن آکر وہ بندھی ہوئی مچھلیوں کو کھول لیتے، شروع شروع میں تو یہ حیلے چلتے رہے، بعد میں کھلم کھلا شکار کرنے لگے، حضرت داؤد علیہ السلام نے ان کو کافی کچھ سمجھایا مگر ان کی اکثریت اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئی، اگرچہ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اس دن شکار نہیں کرتے تھے، اور دل سے اس حکم خداوندی پر عمل پیرا تھے، انھوں نے نافرمانوں کو سمجھانے کی کوشش بھی بہت کی، مگر انھوں نے ایک نہ سنی، مجبوراً نیک لوگوں نے اپنے آپ کو ان سے الگ کرلیا، یہاں تک کہ بستی دو حصوں میں منقسم ہوگئی، ایک طرف وہ لوگ رہنے لگے جو ہفتے کے دن بھی مچھلیوں کا شکار کرتے تھے اور دوسری طرف اللہ کے وہ نیک بندے رہنے لگے جو اس نافرمانی کو دل سے برا سمجھتے تھے، ایک روز ان لوگوں کو یہ محسوس ہوا کہ بستی

کے جس حصے میں نافرمان رہتے ہیں کوئی ہلچل نہیں ہے، اُدھر موت کا سا سناٹا طاری ہے، جا کر دیکھا تو گھروں میں انسانوں کی جگہ بندر بیٹھے ہوئے تھے، معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے بہ طور سزا ان کو بندر بنا دیا تھا، حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں کہ یہودیوں کے جو جوان تھے ان کو بندر بنا دیا گیا تھا اور جو بوڑھے تھے وہ خنزیر کی شکل میں منتقل کر دئے گئے تھے، یہ مسخ شدہ بندر اپنے رشتہ داروں اور تعلق رکھنے والوں کو پہچانتے بھی تھے، اس لیے جب ان میں سے کوئی مل جاتا تو اپنے اس انجام پر روتے بھی تھے، صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں ہے کہ بعض صحابۂ کرامؓ نے اپنے زمانے کے بندروں اور خنزیروں کے متعلق پوچھا کہ کیا یہ بھی اسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب کسی قوم کو مسخ صورت کا عذاب دیا جاتا ہے تو ان کی نسل نہیں چلتی، گویا یہ مسخ شد بندر اور خنزیر وغیرہ چند روز زندہ رہ کر ہلاک ہو جاتے ہیں۔(۱)

حضرت داؤد علیہ السلام کی آزمائش وابتلاء کا واقعہ:

دوسرا واقعہ خود حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا، یہ ایک طرح کی آزمائش تھی جس میں حضرت داؤد علیہ السلام مبتلا ہوئے لیکن جیسے ہی انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا فوراً ہی سجدے میں گر گئے اور اللہ رب العزت سے معافی کے طلب گار ہوئے، یہ واقعہ قرآن کریم کی سورۂ ص میں مذکور ہے، دو فریق جن کا کسی معاملے میں نزاع تھا مقدمات کے خاص وقت سے ہٹ کر ایسے وقت محل میں داخل ہوئے جب حضرت داؤد علیہ السلام عبادت الٰہی میں مشغول تھے، محل میں داخل ہونے کے لئے بھی انھوں نے عام راستہ اختیار نہیں کیا بلکہ محل کی دیوار پھاند کر عبادت خانے میں پہنچ گئے، حضرت داؤد علیہ السلام دو اجنبی لوگوں کو اپنے سامنے دیکھ کر گھبرا گئے، گھبرانے کی کی وجہ واضح تھی، ایک تو یہ کہ آنے والے بالکل اجنبی تھے، دوسرے یہ کہ ان کی آمد محل کے باب الداخلہ کے بجائے دیوار پھاند کر ہوئی تھی، پھر یہ وقت عبادت کا تھا، مقدمات سننے کا نہیں تھا، حضرت داؤد علیہ السلام کو خیال ہوا کہ کہیں یہ دونوں دشمن نہ ہوں اور انہیں قتل کرنے کے ارادے سے نہ آئے ہوں، حضرت داؤد علیہ السلام کی گھبراہٹ دیکھ کر اجنبی کہنے لگے کہ آپ ڈریں نہیں، ہم تو دو

(۱) مسلم شریف: ۴/۲۰۵۱، رقم الحدیث: ۲۶۶۳۔

فریق ہیں، ان میں سے ایک نے دوسرے پر کچھ زیادتی کی ہے ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہم دونوں کا مقدمہ سن لیں، اور فیصلہ فرمادیں کہ ہم میں سے کون حق پر ہے اور کون زیادتی کر رہا ہے، ہم انصاف چاہتے ہیں، اس لیے آپ ہم دونوں کا فیصلہ انصاف کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر کریں اور ہمیں سیدھی راہ دکھلائیں، اس کے بعد ان میں سے ایک نے اپنے جھگڑے کی تفصیل بتلائی کہ یہ شخص میرا بھائی ہے، اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک دنبی ہے، یہ چاہتا ہے کہ میری ایک دنبی بھی لے لے اور اپنی سو پوری کرلے، یہ شخص انتہائی منہ زور ہے، میں کچھ کہہ بھی نہیں پاتا کہ یہ مجھے زور سے بول کر دبا لیتا ہے، حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ شخص جو ننانوے دنبیوں میں تیری ایک دنبی ملانا چاہتا ہے تجھ پر ظلم کر رہا ہے اور اکثر شریک ایک دوسرے پر اسی طرح زیادتی کرتے ہیں، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان رکھتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں، وہ تو ظلم نہیں کرتے، اس فیصلے کے بعد اچانک حضرت داؤد علیہ السلام کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ان دو اجنبیوں کو یہاں بھیج کر میرا امتحان لیا گیا ہے، یہ خیال آتے ہیں حضرت داؤد علیہ السلام سجدے میں گر پڑے اور توبہ کرنے لگے، یہ قصہ بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے ان کی غلطی معاف کردی، ہمارے یہاں ان کے لئے خاص مرتبۂ قربت اور بہترین ٹھکانہ (جنت) ہے، قرآن کریم میں صرف اتنا ہی واقعہ بیان کیا گیا ہے، حضرت داؤد علیہ السلام کا امتحان کیوں لیا گیا، وہ کیا غلطی تھی جس پر حضرت داؤد علیہ السلام کو تنبہ ہوا اور آپ نے توبہ کی، وہ دو اجنبی کون تھے، اور حقیقت میں ان کا مقصد کیا تھا، ان تمام سوالوں کے جواب سے قرآن کریم خاموش ہے، لیکن تفسیر کی کتابوں میں ان سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

تمام انبیاء معصوم ہیں:

حضرت داؤد علیہ السلام سے وہ کونسی لغزش سرزد ہوئی تھی جس کی بنا پر یہ واقعہ پیش آیا، اور جیسے ہی حضرت داؤد علیہ السلام کو اپنی غلطی کا احساس ہوا نادم ہو کر سجدے میں گر پڑے اور معافی کے طلب گار ہوئے، قرآن کریم میں اس غلطی کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے

بل کہ اس کی طرف اشارہ تک بھی نہیں کیا گیا ہے، اسی لیے بعض محتاط مفسرین نے اس سلسلے میں خاموشی اختیار کی ہے، ان میں مشہور مفسر حافظ ابن کثیر بھی شامل ہیں، جن کا کہنا یہ ہے کہ جس چیز کو اللہ نے خود مبہم رکھا ہو ہمیں بھی اس کو مبہم ہی رکھنا چاہئے، اس غلطی کی تلاش میں عقلی گھوڑے دوڑانا خدائی مصلحت اور حکمت کے خلاف ہے، افسوس بعض مفسرین اسرائیلیات پر آنکھ بند کرکے بھروسہ کرتے ہیں اور جو کچھ انہیں اس ذریعے سے ملتا ہے اسے بلا تحقیق اپنی کتابوں میں شامل کر لیتے ہیں، اس غیر محتاط روش کی بنا پر ہمارے تفسیری ذخیرے میں بہت سے بے سروپا قصے جمع ہو گئے ہیں جن پر محقق علماء نے رد بھی کیا ہے، حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق بھی یہ قصہ گڑھا گیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی نظر ایک مرتبہ اپنی فوج کے ایک افسر اوریا کی بیوی پر پڑ گئی جو بہت حسین وجمیل تھی، حضرت داؤد علیہ السلام (نعوذ باللہ) اس پر فریفتہ ہو گئے، ان کے دل میں خواہش ہوئی کہ یہ عورت ان کے نکاح میں آجائے، حالاں کہ پہلے سے ان کے حرم میں ننانوے بیویاں موجود تھیں، اس خواہش کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ اوریا کو راستے سے ہٹایا جائے انھوں نے اوریا کو قتل کرانے کے مقصد سے اس کو ایک خطرناک فوجی مشن پر بھیج دیا جہاں وہ قتل کر دیا گیا، بعد میں آپ نے اس کی بیوی سے شادی کر لی، دو فرشتوں نے انسانوں کی شکل میں آکر پیغمبر کی اس غلطی پر تنبیہ کی، دیکھا جائے تو یہ غلطی نہیں ہے، بل کہ ایک طرح سے بے قصور شخص کے قتل کی سازش ہے، ایسے شخص سے جو نبوت ورسالت کے عظیم منصب پر فائز ہو کسی ایسی سازش کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہودی علماء کا جو طریقۂ کار اپنے پیغمبروں کے متعلق رہا ہے اسی نے ان سے اس طرح کا واقعہ گڑھنے اور اسے پھیلانے پر آمادہ کیا ہے، یہ بالکل بے بنیاد اور من گھڑت قصہ ہے، اللہ کے نبی ہر طرح سے معصوم ہوتے ہیں، وہ اس طرح کے کسی گناہ میں ملوث نہیں ہو سکتے، بائبل کی کتاب سموئیل باب ۱۱ میں تو یہاں تک لکھ دیا گیا ہے کہ معاذ اللہ داؤد علیہ السلام اوریا کی بیوی سے زنا بھی کر بیٹھے تھے، یہودی علماء ہوں یا مسیحی علماء اپنے پیغمبروں کے متعلق غیر محقق اور غیر مستند بل کہ نا قابل اعتبار روایات جمع کر لیتے ہیں اور اس پر تحقیق کا خوشنما لیبل چسپاں کر دیتے ہیں، الحمد للہ

ہمارے مفسرین احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اور اگر اس طرح کے واقعات ان کے سامنے آتے ہیں تو وہ ان کی تردید سے بھی پہلو تہی نہیں کرتے، چناں چہ تمام مشہور ومعروف مفسرین نے اپنی تفسیروں میں اس واقعے کی تردید کی ہے اور اسے اسرائیلیات سے ماخوذ واقعہ قرار دیا ہے۔

واقعۂ آزمائش کی حقیقت:

تفسیر معارف القرآن میں مولانا مفتی محمد شفیع عثمانیؒ نے ان آیات کی تشریح وتفسیر کرتے ہوئے مختلف مفسرین کی تحقیقات جمع کی ہیں جن کو عقل بھی قبول کرتی ہے اور جن سے شان رسالت پر کوئی حرف بھی نہیں آتا، اسی ضمن میں انھوں نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تفسیر بیان القرآن کے حوالے سے لکھا ہے کہ دو فریق ایک مقدمہ لے کر بے وقت دیوار پھاند کر آئے، ان کا یہ طریقہ انتہائی گستاخانہ تھا جو کسی بھی شخص کو مشتعل کرنے کے لئے کافی تھا چہ جائیکہ وہ بادشاہ وقت ہو، پھر انھوں نے اپنا لب ولہجہ بھی غیر شائستہ رکھا، مقدمہ لے کر آئے تھے، پیش کر دیتے، انھوں نے یہ نصیحت بھی شروع کر دی کہ آپ انصاف سے کام لینا، ظلم وتعدی نہ کرنا وغیرہ، وغیرہ۔ کیا کوئی حاکم اس طرح کا لب ولہجہ برداشت کر سکتا ہے، مگر حضرت داؤد علیہ السلام نے انتہائی ضبط سے کام لیا، توجہ کے ساتھ ان کی بات سنی، اور اپنے کسی عمل سے ان پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ ان کے غیر وقت دیوار پھاند کر آنے سے اور گستاخانہ انداز تخاطب سے وہ ناراض ہیں، صرف اتنی فروگذاشت ہوئی کہ فیصلہ سناتے وقت انھوں نے ظالم کو خطاب کرنے کے بجائے مظلوم کو مخاطب بنایا جس سے ایک طرح کی جانب داری مترشح ہو رہی تھی، مگر جیسے ہی اس فروگذاشت پر تنبہ ہوا فوراً سجدے میں گر گئے اور معافی کے خواستگار ہوئے، اللہ نے فوراً ہی انہیں معاف فرما دیا اور انہیں اپنے تقرب کی بشارت بھی سنا دی۔

تفسیر روح المعانی میں لکھا ہے کہ اس مقدمے میں مدعی بولتا رہا، مدعا علیہ خاموش رہا، حضرت داؤد علیہ السلام سے یہ غلطی ہوئی کہ انہوں نے مدعی کی بات سن کر ہی نصیحت شروع فرما دی، چاہئے تو یہ تھا کہ مدعا علیہ سے بھی پوچھا جاتا، اس کی بات بھی سنی جاتی،

حالاں کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے ابھی مقدمہ کا فیصلہ بھی نہیں کیا تھا، مدعی کی بات سن کر وہ نصیحت فرمارہے تھے اور یہ اتنی بڑی بات بھی نہیں تھی، مگر ان جیسے جلیل القدر پیغمبر کے شایان شان نہیں تھا کہ وہ پوری بات سنے بغیر نصیحت شروع کردیں، پہلے ان کو دونوں فریقوں کا موقف سننا چاہیے تھا پھر کچھ کہنا چاہیے تھا، اسی بات پر آپ کو تنبہ ہوا، جس کی وجہ سے انھوں نے سجدہ ریز ہوکر معافی مانگی۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی عبادت کا حال:

احکام القرآن کے مصنف لکھتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے گھر کا نظام الاوقات یہ بنا رکھا تھا کہ چوبیس گھنٹوں میں کوئی ایک لمحہ بھی عبادت الٰہی سے خالی نہ گزرے، کسی وقت وہ خود عبادت میں مشغول ہوتے اور کبھی ان کے گھر والے، ایک روز انھوں نے بارگاہ الٰہی میں عرض بھی کیا کہ رات دن میں کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرتا جس میں داؤد یا آل داؤد میں سے کوئی تیری حمد وثنا میں مشغول نہ ہو، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ داؤد تمھیں شب وروز کی یہ حمد وثنا میری توفیق سے حاصل ہے، کسی روز میں تمھیں تمہارے حال پر چھوڑ دوں گا تب تم یہ بات نہ کہہ سکو گے، اس کے بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ دو آدمی اپنا مقدمہ لے کر آگئے، یہ وقت مقدمات سننے کا نہیں تھا بلکہ حضرت داؤد علیہ السلام کی عبادت کا تھا، ان لوگوں کی آمد سے جو بالکل اچانک ہوئی عبادت کے اس نظام میں خلل واقع ہوگیا اور کچھ دیر کے لئے حمد وثنا کا سلسلہ موقوف ہوگیا، حضرت داؤد علیہ السلام ان لوگوں کا مقدمہ سننے اور فیصلہ کرنے میں لگ گئے، گھر کے باقی افراد بھی اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے، غرضیکہ کچھ وقت ایسا گزرا کہ قصر شاہی میں کوئی شخص بھی عبادت نہیں کررہا تھا، یہ صورت حال حضرت داؤد علیہ السلام کے اس دعوے کے منافی تھی جو انھوں نے بارگاہ الٰہی میں کیا تھا، جیسے ہی حضرت داؤد علیہ السلام کو اس کا خیال آیا انھیں اپنی غلطی کا احساس بھی ہوگیا کہ چوبیس گھنٹے کی ہماری عبادت میں خود ہماری مرضی کو کوئی دخل نہیں ہے بل کہ یہ اللہ کی مدد اور اس کی توفیق سے ہے، اللہ اگر چاہے تو وہ خلوت گاہ میں اجنبیوں کو بھیج کر بھی اس سلسلے کو منقطع کرنے پر قدرت رکھتا ہے، اس غلطی کا احساس ہوا تو سجدے میں گر

گئے اور اس دن جو دعویٰ کیا تھا اس پر ندامت کا اظہار کرنے لگے، اللہ تعالیٰ نے بھی مزید امتحان نہیں لیا اور فوراً ہی معاف بھی کردیا، اس آخری توجیہ کی تائید حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے ایک اثر سے بھی ہوتی ہے جس کو مستدرک حاکم کے حوالے سے صاحب قصص القرآن نے نقل کیا ہے، بعض لوگوں نے اس واقعے پر بے سروپا حاشیے بھی لگائے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام چالیس سال سجدے میں پڑے رہے سر نہیں اٹھایا، یہاں تک کہ سر کے اردگرد گھاس اُگ آئی، کسی نے لکھا چالیس سال تک آنسو نہیں رُکے، کسی نے لکھا تمیں سال تک اپنی خطأ کو یاد کر کے آنسو بہاتے رہے، یہ سب بیکار کی باتیں ہیں، قرآن کریم نے صرف اتنا بتلایا ہے کہ وہ سجدے میں گرے اور مغفرت کے طلب گار ہوئے، اس سے زیادہ کی کوئی بات قرآن کریم پر اضافہ ہے جس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی عمر سو سال ہوئی، چالیس برس تک عنان حکومت آپ کے ہاتھوں میں رہی، جس وقت پیغام اجل پہنچا آپ تقدیس الٰہی میں مشغول تھے اور پرندے آپ کے اردگرد جمع ہو کر آپ کے نغمات الوہیت سن رہے تھے، آپ کی وفات ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مبارکہ سے پندرہ سو چھیاسی سال قبل ہوئی، بیتِ المقدس میں آپ کی قبر مبارک آج بھی موجود ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام

حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کے سولہ بیٹوں میں سے ایک ہیں، اللہ تعالیٰ نے صرف انہیں اپنے والد کا جانشین منتخب فرمایا، نہ صرف امور سلطنت میں بل کہ کار نبوت میں بھی وہ اپنے والد کے سچے جانشین تھے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

وَوَرِثَ سُلَیْمَانُ دَاوُودَ.(۱) ''اور سلیمان داؤد کے وارث بنے''۔ ان کی پیدائش حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے پانچ سو چھتر سال کے بعد یروشلم میں ہوئی، آپ کی

(۱) النمل:۱۶۔

والدہ ماجدہ بھی بڑی نیک خاتون تھیں، سنن ابن ماجہ میں ایک روایت ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے اپنے بیٹے سلیمان علیہ السلام کو نصیحت فرمائی کہ اے بیٹے رات بھر سوئے نہ رہا کرو، اس لئے کہ پوری رات سوتے رہنا انسان کو قیامت کے دن اچھے اعمال سے محروم بنا دے گا‘‘۔(۱)

قرآن کریم کی سات سورتوں میں سولہ جگہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر موجود ہے، سورۂ سبا اور سورۂ ص میں قدرے تفصیل سے ہے، اپنے والد کی طرح ان کو بھی بہت سی خصوصیات اور معجزات عطا کئے گئے تھے، قرآن کریم میں ان کا ذکر اختصار کے ساتھ اور احادیث کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی فہم وفراست:

پہلی خصوصیت جس کی طرف قرآن کریم نے ہماری رہ نمائی کی ہے وہ یہ ہے کہ ان کو نوعمری ہی سے فہم وفراست سے نواز دیا گیا تھا، حضرت داؤد علیہ السلام کو اپنے ہونہار بیٹے کی ذہانت پر بڑا اعتماد تھا، اور وہ ان سے امور سلطنت میں مشورہ لیتے رہتے تھے، کوئی مقدمہ ان کی عدالت میں پیش ہوتا اور وہ پیچیدہ ہوتا تب بھی وہ اپنے بیٹے کی رائے معلوم کرتے اور اس کے مطابق فیصلہ سناتے، بخاری شریف میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے رسول اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک نقل کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ دو عورتیں اپنے بچوں کو لے کر سفر کر رہی تھیں، ان میں سے ایک کا بچہ بھیڑیا اٹھا کر لے گیا، جو بچہ محفوظ رہا اس پر دونوں عورتیں جھگڑا کرنے لگیں، دونوں کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ بچہ میرا ہے، ثبوت کسی کے پاس نہیں تھا، دونوں عورتیں اپنا مقدمہ لے کر حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئیں، آپ نے دونوں کے بیانات سنے اور بڑی عمر کی عورت کے حق میں فیصلہ فرما دیا، کیوں کہ بچہ اسی کی گود میں تھا، فیصلے کے بعد دونوں عورتیں واپس ہونے لگیں تو ان کا گزر حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس سے ہوا، انھوں نے معاملے کی تفصیل پوچھی، دونوں نے اپنا اپنا دعویٰ پیش کر دیا، حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک چھری منگوائی اور کہنے لگے ایسا کرتے ہیں اس بچے کے دو ٹکڑے کر دیتے ہیں، تم دونوں ایک ایک ٹکڑا لے لینا، یہ سن

(۱) سنن ابن ماجہ: ۱/۴۲۲، رقم الحدیث: ۱۳۳۲۔

کر بڑی عورت جس کی گود میں بچہ تھا اور جس کے حق میں فیصلہ ہوا تھا خاموش رہی، دوسری عورت رونے لگی اور التجاء کرنے لگی کہ اللہ کے واسطے میرے بچے کے دو ٹکڑے مت کیجئے، میں اس عورت کے حق میں اپنے بچے سے دست بردار ہوتی ہوں، بچہ اسی کے پاس رہنے دیجئے، اس عورت کی آہ وزاری سن کر حضرت سلیمان علیہ السلام کو یقین ہو گیا کہ بچہ دراصل چھوٹی کا ہے، چناں چہ بڑی عورت سے وہ بچہ لے لیا گیا اور چھوٹی عمر کی عورت کے سپرد کر دیا گیا، قرآن کریم میں ایک اور مقدمہ کا ذکر ہے جس کا فیصلہ پہلے حضرت داؤد علیہ السلام نے کیا پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے کیا اور انہی کا فیصلہ نافذ بھی ہوا، واقعہ یہ پیش آیا کہ کچھ لوگوں کی بکریاں رات کے وقت کسی کھیت میں گھس گئیں اور اس کو نقصان پہنچا کر چلی گئیں، کھیت والے اپنا مقدمہ لے کر حضرت داؤد علیہ السلام کی عدالت میں پہنچے، حضرت داؤد علیہ السلام نے دونوں فریقوں کی بات سن کر یہ فیصلہ سنایا کہ کھیت والوں کا نقصان ہوا ہے اس لئے بکریاں کھیت والوں کے سپرد کر دی جائیں تاکہ وہ ان کو فروخت کر کے اپنے نقصان کی تلافی کر لیں یا نقصان کے عوض میں وہ بکریاں اپنے پاس رکھ لیں، بکریوں کی قیمت کھیت والوں کے نقصان کے برابر تھیں، اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک ایسے فیصلے تک رہ نمائی فرمائی جس میں دونوں فریقوں کا فائدہ تھا، بکریوں والے کی بکریاں ان کی ملکیت سے نہیں نکل رہی تھیں اور کھیت والوں کو ان کی ضائع شدہ کھیتی کا معاوضہ مل رہا تھا، وہ فیصلہ یہ تھا کہ بکریاں عارضی طور پر کھیت والوں کو دے دی جائیں تاکہ وہ ان کے دودھ سے فائدہ اٹھائیں، اور کھیت بکریوں والوں کے سپرد کر دیا جائے تاکہ وہ اس کی خدمت کریں، اس کو کھاد پانی وغیرہ دے کر اس حالت پر لے آئیں جس پر وہ پہلے تھا، اس کے بعد بکریاں ان کے مالک کو اور کھیت اس کے مالک کو واپس دے دیا جائے، دونوں فریق اس فیصلے پر خوشی سے راضی ہو گئے۔

بے مثال سلطنت:

حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے یہ معجزہ عطا فرمایا تھا کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرتے تھے تو چرند وپرند اور شجر وحجر سب سنتے تھے اور ان کی لے میں لے ملا کر

خود بھی پڑھتے، ان کو خوش گلوئی کا یہ حال تھا کہ پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ ان کے پاس آکر بیٹھ جاتے ان کی تلاوت سنتے اور جھومتے، ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہواؤں کو اور جنات کو مسخر کردیا تھا، اس معجزے کی حقیقت یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے دعا کی: قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَهَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ. (۱) ”اے میرے پروردگار میری مغفرت فرما اور مجھے ایسی سلطنت عطا فرما کہ جو میرے علاوہ کسی کے لئے مناسب نہ ہو، بے شک آپ بڑے ہی دینے والے ہیں“۔ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے لکھا ہے کہ ”احادیث میں ہے کہ ہر نبی کی ایک دعا ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قبولیت کا وعدہ فرمایا ہے یعنی وہ دُعا ضرور قبول کی جائے گی، شاید حضرت سلیمان کی یہ وہی دُعا ہے، آخری نبی زادے اور بادشاہ زادے تھے، دُعا میں بھی یہ رنگ رہا کہ بادشاہت ملے اور اعجازی رنگ کی ملے، وہ زمانہ ملوک اور جبارین کا تھا، اس حیثیت سے بھی یہ دُعا مذاقِ زمانہ کے موافق تھی اور ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا مقصد ملک حاصل کرنے سے اپنی شوکت وحشمت کا مظاہرہ کرنا نہیں بل کہ اس کے دین کو ظاہر وغالب کرنا اور قانون سماوی کو پھیلانا ہوتا ہے جس کے وہ حامل بنا کر بھیجے جاتے ہیں، لہٰذا اس کو دنیا داروں کی دُعا پر قیاس نہ کیا جائے گا“۔(۲)

اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی دُعا اس طرح قبول فرمائی کہ ان کو ایک وسیع وعریض سلطنت کا بادشاہ بنادیا، یہ سلطنت اس قدر لمبی چوڑی تھی کہ اس میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچنے کے لئے ایک ماہ کی مسافت درکار تھی، اس مسافت کو اللہ نے اس طرح سمیٹا کہ ہواؤں کو ان کے لئے مسخر کردیا کہ وہ اپنے تخت شاہی کو ہواؤں کے دوش پر ڈال دیتے اور مہینوں کی مسافت چند گھنٹوں میں طے کر لیتے، قرآن کریم میں ہواؤں کے مسخر ہونے اور حکم سلیمانی کے پابند ہونے کا ذکر اس آیت کریمہ میں ہے: وَلِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ. (۳) ”اور سلیمان کے لئے ہم نے ہوا کو مسخر کردیا کہ اس کا صبح کو چلنا مہینے بھر کی مسافت تھی اور اس کا شام کو چلنا بھی مہینے بھر کی

(۱) سورہ ص: ۳۵۔ (۲) فوائد عثمانی بر ترجمہ شیخ الہند۔ (۳) سبا: ۱۲۔

مسافت تھی"۔ ایک اور آیت میں ہے: فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِأَمْرِهٖ.(۱) "اور ہم نے ہوا کو ان کے لئے مسخر کر دیا تھا کہ ان کے حکم سے چلتی تھی"۔ اسی طرح ایک اور آیت میں ہے: وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِأَمْرِهٖ إِلَى الْأَرْضِ الَّتِيْ بَارَكْنَا فِيْهَا وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عَالِمِيْنَ.(۲) "اور ہم نے تیز ہوا کو سلیمان کے تابع کر دیا تھا کہ وہ ان کے حکم سے اس سرزمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکتیں رکھی تھیں اور ہم ہر چیز سے باخبر ہیں"۔

ہواؤں کی تسخیر:

حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس معجزے کا ذکر قرآن کریم میں تو مختصر طور پر ہے لیکن احادیث میں اس کی تفصیلات ملتی ہیں کہ وہ کس طرح ان ہواؤں پر سفر کرتے تھے، ان کا ایک تخت تھا جس پر بیٹھ کر وہ مہینوں کا فاصلہ چند گھنٹوں میں طے کر لیتے، یہ تخت کتنا وسیع وعریض تھا اس کا ذکر بھی تفسیر کی کتابوں میں ملتا ہے، اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے زمانے کے تیز رفتار اور لمبے چوڑے ہوائی جہاز بھی تخت سلیمانی کے سامنے ہیچ ہیں۔

قرآن کریم کی ان تین آیات سے بہ حیثیت مجموعی یہ پتہ چلتا ہے کہ ہوائیں حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے مسخر کر دی گئیں تھیں اور وہ ان کے حکم اور مرضی کے تابع تھیں، خواہ وہ ہوائیں باد صبا کی طرح سبک رفتار تھیں یا باد صرصر کی طرح تیز وتند، دوسری بات یہ کہ تیز آندھیاں بھی ان کا حکم ملتے ہی نرم ہواؤں میں تبدیل ہو جاتی تھیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ اپنی نرمی اور سبک رفتاری کے باوجود وہ انتہائی تیز رفتار تھیں، یہاں تک کہ جو فاصلہ ایک مہینے میں طے ہوتا تھا ان ہواؤں کے ذریعے صبح کے چند گھنٹوں میں طے ہو جاتا یا شام کی چند ساعتوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتا۔

حضرت حسن بصریؒ کے حوالے سے مفسر ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ یہ سفر اس قدر برق رفتاری کے ساتھ طے ہوتا کہ صبح کو بیت المقدس سے روانہ ہوتے تو دوپہر کو اصطخر میں جا کر ٹھہرتے، اصطخر ایران کا ایک قدیم شہر ہے، وہاں دوپہر کا کھانا کھاتے، ظہر بعد یہاں سے چلتے تو رات میں کابل پہنچ جاتے، کبھی یمن میں دوپہر کا کھانا تناول فرماتے اور ملک شام

(۱) ص:۳۶۔ (۲) انبیاء:۸۱۔

میں رات کا، کبھی عراق پہنچ کر قیام فرماتے، واضح رہے کہ بیت المقدس اور اصطخر کے درمیان اس قدر فاصلہ ہے جو تیز رفتار سواری کے ساتھ ایک ماہ میں طے کیا جاسکتا ہے، اسی طرح اصطخر اور کابل کے درمیان کی مسافت بھی ایک ماہ میں طے ہوتی ہے۔(۱) گویا تخت سلیمانی انجن اور مشین جیسے اسباب ظاہر سے بالاتر صرف اللہ کے حکم سے ایک بہت تیز رفتار ہوائی جہاز سے بھی زیادہ تیز مگر سبک رفتاری کے ساتھ ہوا کے کاندھے پر اڑا چلا جاتا تھا، لہٰذا واقعۂ تسخیرِ ریاح کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی نبوت حقہ کے خصوصی امتیازات میں ایک امتیاز تسلیم کرتے ہوئے بغیر کسی تاویل کے صحیح تسلیم کیا جائے اور لاطائل تفصیلات وتاویلات اور اسرائیلیات میں نہ الجھا جائے۔(۲)

تخت سلیمانی:

اس قصے میں تخت سلیمانی کا ذکر اہمیت کا حامل ہے، اسی پر بیٹھ کر حضرت سلیمان علیہ السلام ہواؤں کو حکم دیتے اور وہ ان کو ادھر سے ادھر لے کر جاتیں، اس تخت کی نوعیت کیا تھی، وہ کتنا لمبا چوڑا تھا، اس پر کتنے لوگ سفر کرتے تھے، ان سوالوں کا جواب ہمیں مفتی محمد شفیع عثمانیؒ نے تفسیر ابن کثیر کے حوالے سے دیا ہے، تحریر فرماتے ہیں: ''اس تخت پر چھ لاکھ کرسیاں رکھی جاتی تھیں جن پر سلیمان علیہ السلام کے ساتھ اہل ایمان انسان اور ان سے پیچھے اہل ایمان جن بیٹھتے تھے، پھر پرندوں کو حکم ہوتا کہ وہ اس پورے تخت پر سایہ کرلیں، تاکہ آفتاب کی تپش سے تکلیف نہ ہو، پھر ہوا کو حکم دیا جاتا تھا کہ وہ اس عظیم الشان مجمع کو اٹھا کر جہاں کا حکم ہوتا پہنچا دیتی تھی، اور بعض روایات میں ہے کہ اس ہوائی سفر میں سلیمان علیہ السلام سر جھکائے اللہ کے ذکر وشکر میں مشغول رہتے تھے، دائیں بائیں اِدھر اُدھر جیسا کہ ریل یا ہوائی جہاز کے سفر میں لوگوں کی عادت ہوتی ہے کچھ نہ دیکھتے تھے اور اپنے عمل سے تواضع کا اظہار فرماتے تھے۔(۳)

جس طرح انسان اللہ کی مخلوق ہے اسی طرح جن بھی اللہ کی مخلوق ہے، دونوں کی تخلیقی نوعیت الگ الگ ہے کہ انسان کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے اور جن کو آگ سے بنایا گیا

(۱) معارف القرآن: ۲۶۴/۷۔ (۲) قصص القرآن: ۱۰۴/۲۔ (۳) تفسیر معارف القرآن: ۲۱۳/۶۔

ہے، لیکن مقصد تخلیق میں دونوں ایک ہیں، قرآن کریم میں ہے: **وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ**.(۱) ''اور ہم نے جن اور انسان کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ ہماری عبادت کریں''۔ البتہ کیوں کہ تمام مخلوقات میں حضرت انسان کا درجہ انتہائی بلند ہے یہاں تک کہ اسے اشرف المخلوقات کہا گیا ہے اس لئے اس کائنات کی تمام چیزیں خواہ وہ جاندار ہوں یا بے جان سب انسان کے فائدے کے لئے ہیں، اب یہ انسان کی اپنی صلاحیت ہے کہ وہ ان چیزوں سے کس طرح اور کس حد تک فائدہ اٹھاتا ہے، جن بھی اللہ کی مخلوق ہے، انسان اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، اور اسے اپنے تابع بنا سکتا ہے، مگر یہ سب اللہ کے حکم سے ہے، یہ بھی طے ہے کہ ہر شخص کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ جنات کو اپنے تابع کرلے، بعض صحابہ کرامؓ کے متعلق روایات میں آیا ہے کہ جنات ان کے لئے مسخر اور تابع تھے، حضرت ابوہریرہ، ابی بن کعب، معاذ بن جبل، عمر بن الخطاب، ابوایوب انصاری اور زید بن ثابت وغیرہ رضی اللہ عنہم کے متعلق تفسیر کی کتابوں میں ہے کہ جنات ان کی خدمت پر مامور تھے، مگر یہ سب محض اللہ کے حکم اور اس کے فضل سے تھا، اللہ تعالیٰ اپنے بعض خاص بندوں کو بہ طور کرامت یہ چیز عطا کردیتے ہیں، بعض لوگ عمل وغیرہ کے ذریعے جنات کو تابع کرلیتے ہیں، یہ بھی اللہ ہی کے حکم سے ہوتا ہے، انسانوں کی طرح جنات میں بھی نیک و بد ہوتے ہیں، قرآن کریم میں شیاطین الانس والجن کی تعبیر ملتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنات بھی سرکش ہوتے ہیں اور وہ نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں، مرد و خواتین پر جنات چڑھ جانا اسی نوعیت کی شرارتیں ہیں جو جنات شیاطین انجام دیتے رہتے ہیں، بعض اوقات یہ انبیاء کو بھی نہیں چھوڑتے، حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ''ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ سے ارشاد فرمایا کہ رات ایک سرکش شیطان نے میری نماز میں خلل ڈالنے کی کوشش کی، میں نے اس کو پکڑ لیا، پھر میں نے سوچا کہ اس کو مسجد کے ستون میں باندھ دوں تاکہ دن میں تم سب بھی اس کو دیکھ لو مگر مجھے اس وقت اپنے بھائی سلیمان کی یہ دُعا یاد آگئی: **رب هب لی ملكا لا ينبغی لاحد من بعدی**. اس کے بعد میں نے اس کو ذلیل کرکے چھوڑ دیا''۔(۲)

(۱) الذاریات:۵۶۔ (۲) صحیح البخاری:۲/۶۴، رقم الحدیث:۱۲۱۰۔

جنات بھی مسخر تھے:

بہ ہر حال جنات کو مسخر کرنے کا معجزہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو عطا کیا گیا تھا اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ہی نے سب سے پہلے ان سے خدمت لی ہے اور انہیں اپنے کاموں پر مامور کیا ہے، مفسرین نے لکھا ہے کہ ہر طرح کے جنات ان کے تابع تھے، صاحبِ ایمان بھی اور اصحابِ کفر و شرک بھی، یعنی جنات و شیاطین سب پر ان کی حکومت تھی اور وہ سب ان کے چشم و ابرو کے اشارے پر ناچتے تھے، اگر کوئی جن یا شیطان حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم سے سرتابی کرتا تو اسے سزا بھی ملتی تھی، قرآن کریم میں ہے: وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَمَنْ يَزِغْ مِنْهُمْ عَنْ أَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ.(۱) ''اور جنات میں سے بعض وہ جن تھے جو سلیمان کے رب کے حکم سے سلیمان کے سامنے مختلف قسم کے کام کرتے تھے اور اگر ان میں سے کوئی کج روی اختیار کرے گا اور ہمارے حکم کی خلاف ورزی کرے گا تو ہم اس کو دہکتی آگ کا مزہ چکھا دیں گے''۔ اکثر مفسرین نے اس سے اخروی عذاب مراد لیا ہے یعنی جنات میں سے جن لوگوں نے ہمارے حکم کے خلاف کیا اور سلیمان علیہ السلام کا حکم نہیں مانا ان کو آخرت میں جہنم کی سزا دی جائے گی، مگر بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ مقرر کر رکھا تھا جو سرکش اور نافرمان جنات کو آگ کے کوڑوں کی سزا دیتا تھا اور ان کو سلیمان علیہ السلام کا حکم ماننے پر مجبور کرتا تھا۔

جو جنات و شیاطین حضرت سلیمان علیہ السلام کے تابع تھے ان کی ڈیوٹی کیا تھی، ان سے کیا کام لیا جاتا تھا، قرآن کریم کی سورۂ سبا میں ان کاموں کی تفصیل ملتی ہے، سورۂ انبیاء میں ہے کہ: وَمِنَ الشَّيَاطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهُ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ.(۲) ''ہم نے شیاطین جن میں سے ایسے لوگوں کو جو دریاؤں میں غوطہ لگایا کرتے تھے، اور ان کے علاوہ بھی دوسرے کام کیا کرتے تھے (سلیمان کے تابع کر دیا تھا)'' مفسرین نے لکھا ہے کہ سمندروں اور دریاؤں میں غوطہ لگا کر اور ان کی تہہ میں جا کر یہ لوگ سلیمان علیہ السلام کے لئے بیش قیمت موتی نکال کر لاتے، جن سے جواہرات بنتے اور جو

(۱) سبا:۱۲۔ (۲) الانبیاء:۸۲۔

تاج وتخت میں سجائے جاتے، ایک اور کام جو جنات سے لیا جاتا وہ یہ تھا کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی تعمیراتی سرگرمیوں میں حصہ لیتے، عمارت سازی کے کام میں آنے والے بڑے بڑے پتھر جن کو اٹھا کر لانا اور دیواروں میں ان کی جگہ پر رکھنا انسانوں کے بس کی بات نہ تھی یہ طاقت ور جنات آسانی کے ساتھ اٹھا کر لے آتے، روایات میں ہے کہ پورا شہر بیت المقدس، اس کی چہار دیواری، اور مسجد اقصی جو روئے زمین پر دوسری مسجد ہے جو اللہ کے عبادت کے لیے بنائی گئی اولاً ان ہی جنات کے ذریعے تعمیر کی گئی، بخاری ومسلم میں حضرت ابوذر غفاریؓ سے مروی ہے کہ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مسجد حرام کی بنیاد رکھی اور وہ مکہ کی آبادی کا باعث بنی، اسی طرح حضرت یعقوب علیہ السلام نے مسجد بیت المقدس کی بنیاد ڈالی اور اس کی وجہ سے بیت المقدس کی آبادی وجود میں آئی''۔ پھر عرصۂ دراز کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم سے مسجد اور شہر کی تجدید کی گئی اور جنوں کی تسخیر کی وجہ سے بے نظیر اور شان دار تعمیر عالم وجود میں آئی، جنوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے محل اور دوسرے مکانات بھی تعمیر کئے، قرآن کریم میں اس کا ذکر ہے، اس زمانے کی یہ تعمیرات جو جنوں کے ذریعے وجود میں آئیں آج تک لوگوں کے لئے باعث حیرت بنی ہوئی ہیں کہ ایسے دیو پیکر پتھر بل کہ چٹانیں کی چٹانیں کس طرح لائی گئیں اور کس طرح ان کو بلندیوں پر پہنچا کر ایک دوسرے کے ساتھ جوڑا گیا۔(۱)

یہی نہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو جنات کی خدمات مہیا کی گئیں، بل کہ تعمیراتی ساز وسامان بھی بہم پہنچایا گیا، اس سلسلے میں قرآن عزیز نے تانبے کے چشمے کا ذکر کیا ہے، جو پانی کی طرح زمین پر بہتا تھا، اس کا منبع یمن میں تھا اور یہ تین دن کی مسافت تک بہتا ہوا چلا جاتا تھا، یہ پانی گرم بھی نہ تھا، اس کو آسانی کے ساتھ برتنوں میں بھر لیا جاتا، پھر اس سے تعمیراتی پتھر بھی جوڑے جاتے اور اس پگھلے ہوئے تانبے سے برتن بھی بنائے جاتے، یہ برتن چھوٹے بھی ہوتے اور بڑے بڑے بھی، اتنی بڑی دیگیں بھی ہوتیں جو اپنی جگہ سے سرکتی بھی نہیں تھیں، ان دیگوں میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر کا کھانا تیار ہوتا تھا، برتن سازی سے لے کر تعمیر سازی تک کے تمام کام یہ جنات انجام دیا کرتے تھے۔

(۱) قصص القرآن:۲/۲۱۰۔

جانوروں کی بولیاں:

ایک اور معجزہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ عطا کیا گیا تھا وہ جانوروں کی بولیاں سمجھتے تھے، اس میں اڑنے والے پرندے بھی تھے جو حضرت سلیمان علیہ السلام سے اس طرح باتیں کرتے تھے جس طرح ہم اور آپ آپس میں کرتے ہیں، اور زمین پر رینگنے والے کیڑے مکوڑے بھی تھے جن کے رینگنے تک کی آواز ہم نہیں سن پاتے مگر سلیمان علیہ السلام ان کی گفتگو سن بھی لیتے تھے اور سمجھ بھی لیتے تھے، چناں چہ جب وہ کسی سفر پر روانہ ہوتے تو ان کے ساتھ انسان بھی ہوتے، جنات بھی ہوتے اور پرندوں کے غول بھی ہوتے، حضرت سلیمان علیہ السلام کا ان تینوں قسم کی مخلوقات پر زبردست دبدبہ تھا، لشکر میں تینوں کی جگہیں متعین تھیں اور سب کے کام بھی تقسیم تھے، پورا لشکر بڑا منظّم ہوا کرتا تھا، قرآن کریم کی اس آیت میں اسی نظم وضبط کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، فرمایا: وَحُشِرَ لِسُلَيْمَانَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ.(۱) ''اور سلیمان کے لئے اس کے لشکر جنات میں سے اور انسانوں میں سے اور پرندوں میں سے اور وہ (منظّم اور مرتب کرنے کے لئے) روکے جاتے تھے''۔ یعنی جس طرح چلنے سے پہلے افواج کسی ایک میدان میں جمع ہو کر ڈسپلن قائم کرتی ہیں اور اس کی عملی مشق کرتی ہیں اسی طرح چلنے سے پہلے سلیمان علیہ السلام کے لشکر بھی ترتیب دئے جاتے تھے۔

ایک چیونٹی کا قصہ:

جانوروں کی بولی سمجھنے کے ذیل میں یہ دو واقعات قابل ذکر ہیں، قرآن عزیز میں چیونٹیوں کا ذکر ہے جو سلیمان علیہ السلام کا لشکر دیکھ کر اپنے بلوں میں گھس گئیں تھیں، اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام کسی سفر پر تشریف لے جا رہے تھے، پورا لشکر ساتھ تھا، ایک روایت میں ہے کہ کسی علاقے میں قحط سالی تھی، وہاں کا قصد تھا تاکہ وہاں پہنچ کر دعا کریں اور اس علاقے کے لوگوں کو تسلی دیں، راستے میں ایک ایسی وادی سے گزر ہوا جہاں چیونٹیوں کی کثرت تھی، قرآن کریم نے اسے ''وادیِ نمل'' کہا ہے

(۱) النمل: ۱۷۔

یعنی چیونٹیوں کی وادی، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس پورے علاقے میں اللہ کی اسی مخلوق کا بسیرا تھا، ان ننھی چیونٹیوں نے دور سے حضرت سلیمان علیہ السلام اور ان کی فوج کو آتا ہوا دیکھا تو ان میں سے ایک چیونٹی کہنے لگی، بہنو! اپنے بلوں میں گھس جاؤ ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور ان کی فوجیں تمہیں کچل ڈالیں، اور ان کو خبر بھی نہ ہو، چیونٹی کی اس بات پر حضرت سلیمان علیہ السلام کھل کھلا کر ہنس پڑے، اور کہنے لگے اے میرے رب! مجھے اس بات پر قائم رکھ کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کرتا رہوں جو تو نے مجھے عطا کر رکھی ہیں، اور جو تو نے میرے ماں باپ کو عطا کی تھیں، اور مجھے اس کی توفیق بھی عطا فرما کہ میں ایسے اچھے عمل کروں جن سے تو راضی ہو، اور مجھے اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں شامل فرما، ایسے حالات میں جب کہ بے زبان چیونٹیاں تک ان کا لشکر جرار دیکھ کر بلوں میں گھس گئی ہوں، تشکر اور عجز وانکساری کے جذبات کا اظہار ایک پیغمبر ہی کر سکتا ہے، روایات میں ہے کہ اس سفر میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے دیکھا کہ ایک چیونٹی آسمان کی طرف منہ اٹھائے یہ دُعا مانگ رہی ہے ''اے ہمارے پروردگار ہم بھی تیری مخلوق ہیں، تیرے فضل وکرم کے محتاج ہیں، ہم کو بارش سے محروم نہ رکھ ورنہ ہم ہلاک ہو جائیں گے'' حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ دُعا سنی تو اپنے لشکر کو حکم دیا واپس چلو، ایک چیونٹی کی دُعا نے ہمارا کام کر دیا ہے، اب ہماری طلب کے بغیر بارش ہوگی۔

ہدہد کا واقعہ:

دوسرا واقعہ ایک پرندے ہدہد کا ہے، یہ پرندہ آپ کے لشکر میں شامل تھا، ایک مرتبہ کسی جگہ پڑاؤ تھا، حضرت سلیمان علیہ السلام کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ وہ اپنی خدمت میں حاضر رہنے والے تمام انسانوں، جنوں حتی کہ پرندوں تک کی خبر گیری رکھتے تھے، کون کہاں ہے، کہاں گیا ہے، ایک اچھے حاکم کا یہی طریقہ ہونا بھی چاہئے، دیکھا تو ہدہد غائب تھا، سوال ہوا کہ مجھے کیا ہو گیا کہ میں ہدہد کو نہیں دیکھ رہا ہوں، ویسے سوال یہ کرنا چاہئے تھا کہ ہدہد کہاں ہے، نظر نہیں آرہا ہے، مفسرین نے لکھا ہے کہ ہدہد کی غیر حاضری سے ابتدا میں دل کے اندر یہ خوف ہوا کہ شاید میرے کسی قصور کی وجہ سے ایک نعمت میں کمی آئی ہے کہ

صنفِ طیور میں سے ایک یعنی ہدہد غائب ہوگیا اس لئے اپنے نفس سے سوال کیا کہ ایسا کیوں ہوا، اسی کو محاسبہ بھی کہتے ہیں، اس ابتدائی محاسبہ اور غور وفکر کے بعد فرمایا کہ میں اسے دیکھ نہیں پا رہا ہوں یا واقعۃً وہ غائب ہے، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے کسی نے سوال کیا کہ اتنے بہت سے پرندوں میں صرف ہدہد ہی کی تلاش کس لئے ہوئی، اسی کو کیوں پوچھا گیا، فرمایا حضرت سلیمان علیہ السلام کسی ایسے مقام پر ٹھہرے ہوئے تھے جہاں پانی نہیں تھا، اللہ تعالیٰ نے ہدہد کو یہ خصوصیت عطا فرمائی ہے کہ وہ زمین کے اندر کی چیزوں کو اور زمین کے اندر بہنے والے چشموں کو دیکھ لیتا ہے، مقصود حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ تھا کہ وہ ہدہد سے معلوم کریں کہ اس میدان میں پانی کس جگہ اور کتنی گہرائی میں ہے، اور کس جگہ زمین کھودنے سے پانی کافی مقدار میں حاصل ہوسکتا ہے، ہدہد کی نشاندہی کے بعد وہ جنات کو حکم دیتے کہ زمین کھود کر پانی نکالیں۔(۱)

درباریوں نے بتلایا کہ ہدہد تو موجود نہیں ہے، اور کافی دیر سے اِدھر نظر بھی نہیں آیا، یہ سن کر حضرت سلیمان علیہ السلام کو بڑا غصہ آیا کہنے لگے، اسے آنے دو، میں اُسے سخت سزا دوں گا، اور سزا یہ ہوگی کہ آج اسے ذبح کر ڈالوں گا، ہاں اگر اس نے اپنی غیر موجودگی کی معقول وجہ پیش کی تو اس کی جان بخشی جاسکتی ہے، اسے بتلانا ہوگا کہ وہ اتنی دیر سے کہاں غائب ہے، اور کیوں غائب ہے، کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ہدہد دربارِ شاہی میں حاضر ہوگیا، اسے پتہ تھا کہ میں کافی دیر سے غائب ہوں، سلیمان علیہ السلام ناراض ہورہے ہوں گے، اس لئے اس نے دربار میں پہنچتے ہی عرض کیا کہ میں ایک ایسی خبر لے کر آیا ہوں جس کی آپ کو بھی خبر نہیں ہے، حالاں کہ اپنے بڑوں کے ساتھ یہ طرزِ تخاطب مناسب نہیں کہ میں وہ بات جانتا ہوں جو آپ نہیں جانتے اور مجھے وہ باتیں معلوم ہیں جن کی آپ کو خبر نہیں، لیکن ہدہد نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے یہ تمہید قائم کی، اس کے بعد اس نے مُلک سبا کا ذکر شروع کیا، جہاں وہ پرواز کرتے کرتے پہنچ گیا تھا، مفسرین نے لکھا ہے کہ ایک دن اچانک ہی ہدہد کے دل میں خیال آیا کہ ذرا دور تلک پرواز کی جائے، چناں چہ وہ اتنا اڑا کہ سلیمان علیہ السلام کی سلطنت کی حدود سے باہر نکل گیا،

(۱) معارف القرآن: ۶/ ۵۷۰۔

اچانک ہی اس کی نگاہ ایک نئی آبادی پر پڑی، کیوں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا ملک تو پورا اس کی نظر میں تھا یہ جگہ نئی معلوم ہوئی، دوسرے پرندوں سے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ یہ ایک مستقل ملک ہے جس کا نام مآرب ہے اور یہاں قوم سبا رہتی ہے، تفسیر ماجدی میں لکھا ہے کہ سبا یمن کے علاقے میں تھا، اس کا دار الحکومت مآرب تھا، یمن کے موجودہ دار الحکومت سے مآرب کا فاصلہ مشرق میں ساٹھ میل ہے، یہ شہر سطح سمندر سے انتالیس سو فٹ بلندی پر بسا ہوا تھا، مؤرخین لکھتے ہیں کہ یہ ایک متمدن ملک تھا، جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس ملک کے انجینئروں نے پانی کو ذخیرہ کرنے کے لئے نہایت مضبوط اور قابل دید بند (ڈیم) تعمیر کیا تھا جو کئی میل لمبا تھا اس کی اونچائی ایک سو پچاس فٹ اور چوڑائی پچاس فٹ تھی، اسلام کی آمد سے قبل ہی یہ ڈیم ٹوٹ گیا جس سے ملک میں کافی تباہی پھیلی، اس کے اثرات صدیوں تک محسوس کئے گئے، یہ ایک بہت خوب صورت اور زرخیز علاقہ تھا، قرآن کریم نے اس علاقے کی خوب صورتی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ جَنَّتَانِ عَنْ يَمِينٍ وَشِمَالٍ.(۱) ”بلاشبہ اہل سبا کے لئے ان کے وطن (یعنی مآرب) میں بڑی بڑی نشانیاں موجود تھیں، وہ نشانیاں باغوں کی دو طرفہ قطاریں تھیں جو دائیں بھی تھیں اور بائیں بھی“۔ گویا اس علاقے میں دو طرفہ باغات تھے، مفسرین لکھتے ہیں کہ باغات کا یہ دو رویہ سلسلہ تین سو میل تک پھیلا ہوا تھا، اور یہ باغات لذیذ پھلوں اور میووں کے درختوں سے بھرے ہوئے تھے، اگر کوئی شخص اپنے سر پر خالی ٹوکری رکھ کر نکل جاتا تو چلتے چلتے اس کی ٹوکری خود بہ خود ٹوٹ کر گرنے والے پھلوں سے بھر جاتی، حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ سبا ملک نہیں ہے بل کہ یمن کے بادشاہوں اور اس ملک کے باشندوں کا نام ہے، ملکہ بلقیس جن کا ذکر آگے آنے والا ہے وہ اسی قوم سے تعلق رکھتی تھیں، اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے رزق کے دروازے کھول دئے تھے، ان کے ملک میں عیش و آرام کے تمام اسباب مہیا تھے، کھانے پینے کی چیزوں کی فراوانی تھی، ایک مدت تک یہ لوگ اللہ کی وحدانیت پر قائم رہے اور اس کی اطاعت کرتے رہے، پھر یہ عیش و عشرت میں اس قدر غرق ہوئے کہ پہلے اللہ کی اطاعت اور اس کی یاد سے غافل ہو گئے، پھر اس کے وجود ہی

(۱) سبا:۱۵۔

سے انکار کرنے لگے، اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح کے لیے تیرہ نبی مبعوث فرمائے، لیکن انھوں نے کسی نبی کی بات نہیں مانی، یہاں تک کہ سیلاب کی شکل میں ان پر ایک خوفناک عذاب آیا جس نے وہ تمام سرسبز وشاداب علاقہ بنجر بنا دیا، وہ ڈیم بھی ٹوٹ گیا جو اس ملک میں کاریگری کا بہترین نمونہ اور زرخیزی کا بڑا ذریعہ تھا، اس کے ٹوٹنے سے آبادیوں کے نام ونشان تک مٹ گئے۔

قوم سبا اور ملکۂ بلقیس:

بہ ہر حال ہدہد نے اپنی کارگزاری بیان کرنی شروع کی کہ میں نے وہاں ایک عورت کو دیکھا ہے جو اس ملک پر حکومت کر رہی ہے اور حکومت بھی اتنے اعلا درجے کی ہے کہ اس کو ہر چیز میسر ہے، پورے ملک میں خوش حالی کا دور دورہ ہے، ہر طرف شادابی وزرخیزی ہے، دربار کی شان وشوکت بھی قابل دید ہے، ملکہ ایک تخت پر جلوہ افروز ہوتی ہے جو نہایت عظیم الشان ہے، تفسیر کی کتابوں میں اس تخت کی کچھ تفصیلات ملتی ہیں کہ وہ انتہائی بیش قیمت تخت تھا، اس پر ہیرے جواہرات ٹکے ہوئے تھے، کسی دوسرے ملک کے بادشاہ کے پاس اس جیسا تخت موجود نہیں تھا، ہدہد نے اس ملک اور اس کی ملکہ کے متعلق اور بھی معلومات حاصل کیں، اسے معلوم تھا کہ جب وہ اپنے ملک واپس جائے گا اور دربار میں پہنچے گا تو حضرت سلیمان علیہ السلام اس سے باز پرس ضرور کریں گے اس لئے اس کے پاس مکمل معلومات ہونی چاہئیں تاکہ وہ اپنا حاصل سفر سنا کر ان کو مطمئن کر سکے، ہدہد نے یہ بھی بتلایا کہ میں نے دیکھا کہ ملکہ اور اس کی قوم کے لوگ اللہ تعالیٰ کے بجائے سورج کے آگے سجدہ کرتے ہیں، شیطان نے ان کی کج روی اور گمراہی پر خوشنما پردے ڈال دئے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ ہم بہت اچھا کر رہے ہیں، حالاں کہ وہ سراسر گمراہی میں مبتلا ہیں، شیطان نے ان کو حق کے راستے پر چلنے سے روک رکھا ہے، اس لئے وہ حق تک پہنچنے سے محروم ہیں، چاہئے تو یہ تھا کہ وہ اس ذات برحق کے سامنے اپنا سر جھکاتے اور اس کی عبادت کرتے جس نے آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی چیزوں کو ظاہر کر دیا ہے اور جو ہماری ہر بات سے واقف ہے خواہ وہ کھلی ہوئی ہو یا چھپی ہوئی ہو، دربار شاہی کا پرندہ بھی

آداب گفتگو سے واقف تھا، اسے معلوم تھا کہ کونسی بات کس وقت کہنی ہے، اور کس کے سامنے کیا بات کہنی ہے، کیوں کہ وہ ایک پیغمبر سے گفتگو کر رہا تھا اور پیغمبر سے بڑھ کر توحید کا علمبردار کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا، اس لئے اس نے ملکۂ سبا اور اس کی قوم کی وہ باتیں انہیں بتلائیں جو عقیدۂ توحید کے منافی تھیں اور جن کو سن کر پیغمبر کو ہر حال میں غصہ آنا تھا کہ ہمارے پڑوس میں غیر اللہ کی پرستش ہو رہی ہے اور ہم اس سے بے خبر پڑے ہوئے ہیں، ہدہد کی اس مفصل تقریر کے جواب میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے ارشاد فرمایا تم نے اپنی بات کہہ دی، اب ہم دیکھیں گے کہ تم سچ بول رہے ہو یا اپنی جان بچانے کے لئے تم نے یہ کہانی گھڑلی ہے، اس کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکۂ سبا کے نام ایک خط تحریر فرمایا اور ہدہد سے کہا کہ تم میرا یہ خط لے کر وہاں جاؤ اور اسے ان کے پاس ڈال دو، ڈالنے کے بعد ان کے پاس رکنے کی ضرورت نہیں، دور ہٹ جانا اور وہاں سے دیکھنا کہ خط کے ردّ عمل میں وہ کیا کرتے ہیں، آپس میں کیا گفتگو کرتے ہیں، خط میں لکھا ہوا تھا کہ ”یہ خط سلیمان کی طرف سے ہے اور اس کا مضمون یہ ہے کہ شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم والا ہے، تم لوگ میرے مقابلے میں تکبر نہ کرو اور طاعت وتسلیم اختیار کرتے ہوئے میرے پاس چلے آؤ“ حسب الحکم ہدہد خط لے کر روانہ ہوا، جس وقت وہ مآرب پہنچا ملکہ اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھی، ہدہد نے ایک سوراخ میں اپنی چونچ اندر ڈال کر وہ خط ملکہ کے سینے پر رکھ دیا، اس ملکہ کا نام بلقیس تھا۔

توارت میں بلقیس کا نام موجود ہے، قرآن کریم میں ان کا ذکر بغیر نام کے ہے، پورا نام بلقیس بنت شراحیل ہے، بعض روایات میں ہے کہ ان کی والدہ جنیہ تھی، جس کا نام بلعمہ بنت شیصان بتلایا جاتا ہے، بلقیس کا دادا ہداہد پورے یمن کا بادشاہ تھا، اس کے چالیس بیٹے ہوئے جو سب کے سب ملوک اور بادشاہ بنے، ان کے والد سراح نے کسی جنیہ خاتون سے نکاح کرلیا تھا، اسی کے بطن سے بلقیس کی پیدائش ہوئی۔

بہ ہر حال بلقیس نے دیکھا کہ اس کے سینے پر خط پڑا ہوا ہے، کھول کر پڑھا، اعیانِ حکومت کو جمع کر کے بتلایا کہ میرے پاس عجیب وغریب طریقے سے ایک خط آیا ہے، اور

خط میں یہ مضمون لکھا ہے، مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بلقیس حضرت سلیمان علیہ السلام کے نام اور ان کے حکومت سے واقف رہی ہوں گی، اسی لئے انھوں نے خط کو اہمیت دی، اور اس کے متعلق مشورہ کرنے کے لئے اپنے لوگوں کو جمع کیا اور ان سے پوچھا کہ اس خط کے جواب میں ہمیں کیا لکھنا چاہیے، ہم سے کہا گیا ہے کہ ہم ان کی اطاعت قبول کرلیں، آپ بتلائیں ہم ان کی بات مان لیں، یا ان کو صاف جواب دے دیں، انھوں نے اپنے اعیان حکومت سے یہ بھی کہا کہ میں آپ لوگوں کے مشورے کے بغیر اس خط کا جواب نہیں دوں گی، اس لئے آپ حضرات غور وفکر کر کے ایسا کوئی مشورہ دیں جس میں ہمارے ملک کی بھلائی اور خیر خواہی بھی ہو، اعیان حکومت نے کہا کہ اصل فیصلہ تو آپ ہی کو کرنا ہے کہ اس کے خط کے جواب میں کیا لکھنا چاہیے اور کیا نہیں لکھنا چاہیے، لیکن جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم تو یہی کہیں گے کہ یہ محض گیدڑ بھبکیاں ہیں، ہمیں ڈرنے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، ہم کمزور نہیں ہیں، ہمارے پاس افرادی طاقت کی بھی کمی نہیں ہے اور ہم جنگی ساز وسامان بھی خوب رکھتے ہیں، بلقیس ایک سمجھدار ملکہ تھیں، انھوں نے اپنے حکومتی ارکان کی بات توجہ سے سنی، لیکن جذبات کے بجائے عقل وشعور سے کام لیا، انھوں نے کہا کہ جنگ تو آخری حل ہے، پہلے تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ سلیمان نے یہ خط کیوں بھیجا ہے اور ان کے عزائم کیا ہیں، ویسے بھی جب ملوک اور بادشاہ کسی بستی میں قدم رکھتے ہیں تو اسے تباہ وبرباد کردیتے ہیں، ہمیں حتی الامکان یہ کوشش کرنی چاہیے کہ جنگ نہ ہو، طاقت وقوت کے بجائے بات چیت سے کوئی حل نکل آئے، اس لئے میں پہلے سلیمان کے پاس کچھ تحفے روانہ کرتی ہوں، پھر دیکھتی ہوں کہ وہ کیا رویّہ اختیار کرتے ہیں، ہمارے جو قاصد تحائف لے کر جائیں گے وہ بھی ان کی شان وشوکت اور قوت وطاقت کا اندازہ کرلیں گے کہ واقعی وہ ہمیں ڈرانا چاہتے ہیں یا حقیقت میں وہ اتنی قوت رکھتے ہیں کہ ہمیں دبالیں گے، ملکہ کے فیصلے سے سب نے اتفاق کیا، چند لوگوں کے ذریعے بیش قیمت تحائف سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں روانہ کردئے گئے، یہ گویا خط کا جواب بھی تھا اور طاقت کا

استعمال روکنے کی حکمت عملی بھی تھی، ملکہ بلقیس دیکھنا چاہتی تھیں کہ ان کے بھیجے ہوئے تحفے قبول ہوں گے یا واپس کر دیے جائیں گے، اگلا اقدام اسی پر منحصر تھا۔

جب یہ تحفے حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں پہنچے تو انھوں نے لانے والوں سے فرمایا، تم لوگ اپنی ملکہ سے کہنا کہ میرے خط کا غلط مطلب سمجھا گیا ہے، مجھے تمہارے ان تحفوں کی ضرورت نہیں ہے جن کو تم نہایت بیش قیمت سمجھ کر خوش ہو رہے ہو، اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے کہیں زیادہ دیا ہے جو تمہارے پاس ہے، بہتر یہ ہوگا کہ تم اپنے یہ تحفے اٹھاؤ اور چلتے بنو، بلقیس سے جا کر کہنا کہ میرے حکم کی تعمیل کرے، اگر اس نے تعمیل حکم میں پس وپیش سے کام لیا تو میں خود اپنا لشکر لے کر تمہارے ملک میں داخل ہو جاؤں گا اور تمہیں وہاں سے بے عزت کر کے باہر نکال دوں گا، اس کے بعد تم اس قابل بھی نہیں رہو گے کہ ہمارے لشکر کو روک سکو یا کوئی مزاحمت کر سکو، قاصدین ملکہ کے پاس واپس پہنچے، سفر کی روداد پیش کی، اور جو مشاہدات تھے وہ بتلائے، ساتھ ہی حضرت سلیمان علیہ السلام کا پیغام بھی سنا دیا، یہ بھی بتلا دیا کہ ان کی حکومت کوئی معمولی حکومت نہیں ہے، انسان ہی نہیں بل کہ جنات اور حیوانات تک ان کے تابع فرمان ہیں، ملکہ نے صبر وتحمل کے ساتھ یہ واقعات سنے اور یہ فیصلہ کیا کہ عقلمندی اسی میں ہے کہ سلیمان کا حکم مان لیا جائے اور ان کی اطاعت اختیار کر لی جائے، یہ فیصلہ کرنے کے بعد ملکہ نے اپنی حکومت کے وزیروں، مشیروں کو بھی بتلا دیا کہ ہم سلیمان کے حکم کی تعمیل کریں گے، ہمارا ارادہ ان کی خدمت میں حاضری کا ہے، اس لئے سفر کی تیاری شروع کر دی جائے۔

آصف بن برخیا:

حضرت سلیمان علیہ السلام کو وحی کے ذریعے خبر مل گئی کہ ملکہ بلقیس روانہ ہو رہی ہیں، آپ نے اپنے درباریوں سے کہا کہ میں چاہتا ہوں بلقیس کا وہ تخت جس کا ذکر ہدہد نے کیا تھا کہ اس جیسا تخت کسی بادشاہ کے پاس نہیں ہے یہاں آجائے اور اس کے آنے سے پہلے دربار میں بچھا دیا جائے، دربار میں اس وقت بڑے بڑے جنات موجود تھے، حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان سے دریافت فرمایا کہ تم میں سے کون یہ کام مقررہ وقت

میں انجام دے سکتا ہے، ایک دیو ہیکل جن نے عرض کیا کہ آپ کے اپنی جگہ سے اٹھ کر جانے سے پہلے یعنی دربار برخواست ہونے سے قبل ہی میں اس تخت کو لا سکتا ہوں، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اس تخت کو یہاں لانے کی طاقت بھی رکھتا ہوں اور نہایت قابل اعتماد بھی ہوں، ایک اور شخص اٹھا، اس نے عرض کیا کہ میں پلک جھپکنے سے پہلے اس تخت کو آپ کی خدمت میں حاضر کردوں گا، اس شخص کا نام آصف بن برخیا تھا، حضرت سلیمان علیہ السلام کا نہایت قابل اعتماد وزیر تھا، اکثر اہل علم کی رائے ہے کہ آصف قوم جنات سے تعلق رکھتا تھا، بعض حضرات نے اسے انسان بھی کہا ہے، قرآن کریم نے اس شخص کا صرف اس قدر تعارف کرایا ہے کہ اس کے پاس کتاب کا علم تھا، اس کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں کہ وہ اسم اعظم کا حامل تھا، کسی نے کہا ہے کہ تمام سرکاری کاغذات اور رجسٹر وغیرہ اس کی تحویل میں رہتے تھے، علامہ شبیر احمد عثمانی نے تحریر فرمایا کہ ''راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص حضرت سلیمان علیہ السلام کا صحابی اور وزیر آصف برخیا ہے جو کتب سماویہ کا عالم اور اللہ کے اسماء اور کلام کی تاثیر سے واقف تھا، اس نے عرض کیا کہ میں چشم زدن میں تخت حاضر کرسکتا ہوں، آپ کسی طرف دیکھئے، قبل اس کے آپ اُدھر سے نگاہ ہٹائیں تخت آپ کے سامنے ہوگا۔(۱)

ملکہ بلقیس کا تختِ شاہی:

ایسا ہی ہوا، جیسے ہی حضرت سلیمان نے پلک جھپکائی ان کے سامنے تخت رکھا ہوا تھا، قرآن کریم نے اس واقعے کی اس طرح منظر کشی کی ہے: قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتَابِ أَنَا آتِیْکَ بِهٖ قَبْلَ أَنْ یَّرْتَدَّ إِلَیْکَ طَرْفُکَ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ لِیَبْلُوَنِیْٓ أَأَشْكُرُ أَمْ أَكْفُرُ وَمَنْ شَكَرَ فَإِنَّمَا یَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّیْ غَنِیٌّ كَرِیْمٌ.(۲) ''ایک شخص نے جس کے پاس کتاب کا علم تھا، عرض کیا کہ میں اس تخت کو آپ کی خدمت میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے ہی چشم زدن میں حاضر کرسکتا ہوں، پھر جب سلیمان نے اس تخت کو اپنے سامنے رکھا ہوا دیکھا تو کہا یہ بھی میرے پروردگار کا ایک فضل ہے تاکہ وہ مجھ کو آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا

(۱) فوائد عثمانی۔ (۲) النمل:۴۰۔

ناشکری کرتا ہوں، اور جو شخص شکر کرتا ہے وہ اپنے فائدے کے لئے ہی کرتا ہے اور جو شخص ناسپاسی کی روش اختیار کرتا ہے تو میرا رب بے پروا اور کرم کرنے والا ہے"۔

یہ تخت جس کا ذکر ہو رہا ہے نہایت محفوظ تھا اور ایسی جگہ رکھا ہوا تھا جہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا لیکن سلیمان علیہ السلام کے وزیر نے خدا کی عطا کردہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس تخت کو وہاں سے اٹھا کر حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں پیش کر دیا اور اتنی جلدی پیش کیا کہ اِدھر آنکھ جھپکی اُدھر وہ تخت سامنے موجود تھا، یہ بھی آپ کے معجزات میں سے ایک معجزہ تھا، اور اسی لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے رب کا شکر ادا کیا کہ اس نے اپنے فضل سے انہیں اس قدر قوت اور اتنی شان و شوکت عطا کر رکھی ہے۔

اس تخت کے متعلق جو مآرب سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں لا کر رکھا گیا، صاحب معارف القرآن نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ اس کا طول اسّی ہاتھ، عرض چالیس ہاتھ اور بلندی تیس ہاتھ تھی جس پر موتی، یاقوت احمر، زبرجد اخضر کا کام تھا، اس کے پائے موتی اور جواہرات کے تھے اور پردے ریشم وحریر کے، اندر باہر یکے بعد دیگرے سات مقفل عمارتوں میں محفوظ تھا۔(۱)

جب یہ تخت وہاں سے منگوالیا گیا تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے حکم دیا کہ اس میں کچھ تبدیلیاں کر دی جائیں، یہ تبدیلیاں کیوں کی گئیں، اس سلسلے میں قرآن حکیم میں ہے: نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ أَتَهْتَدِیْ أَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِیْنَ لَا یَهْتَدُوْنَ.(۲) "بلقیس کے لئے اس کے عرش میں کچھ تبدیلیاں کر دو ہم دیکھیں گے کہ وہ حقیقت تک پہنچتی ہے یا اس کا شمار بھی ان لوگوں میں ہے جو راہ یاب نہیں ہوتے"۔

بہ ہر حال تخت میں کچھ ردّ و بدل کر دیا گیا، اس قدر ردّ و بدل کہ پہلی نظر میں اس کو پہچاننا مشکل ہو جائے، ہاں اگر توجہ سے دیکھے تو سمجھ جائے کہ یہ تو وہی ہے، ان تبدیلیوں سے بلقیس کے فہم و فراست کا امتحان مقصود تھا، چناں چہ جب وہ دربار میں پہنچیں اور ان کی نظر تخت پر پڑی تو وہ کچھ دیر کے لئے مبہوت کھڑی رہ گئیں، ان سے پوچھا گیا کہ آپ کا

(۱) معارف القرآن:۶۔(۲) النمل:۴۱۔

تخت بھی ایسا ہی ہے کیا؟ وہ بھی نہایت سمجھ دار خاتون تھیں آخر ایک بڑی قوم پر حکومت کر رہی تھیں، جواب میں انھوں نے یہ نہیں کہا کہ ایسا ہی ہے، نہ یہ کہا ایسا نہیں ہے بل کہ کہنے لگیں گویا ہو بہ ہو وہی ہے، حقیقت بھی یہی تھی، تخت کی بناوٹ تو یہی بتلا رہی تھی کہ یہ میرا تخت ہے، مگر اس میں جو تبدیلیاں کی گئیں تھیں ان سے یہ شبہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ تخت میرا نہیں ہے، اس لئے انھوں نے نہایت سمجھداری کے ساتھ جواب دیا۔

''قصص القرآن'' میں ہے کہ بلقیس نے یہ بھی کہا کہ ہمیں آپ کی بے نظیر قوت وطاقت کا اندازہ ہو چکا ہے، اس لئے ہم آپ کے مطیع اور فرماں بردار بن کر حاضر ہو گئے ہیں، جہاں تک اس تخت کا معاملہ ہے یہ بھی آپ کا محیر العقول کارنامہ ہے، اور یہ آپ کی لاثانی قوت کا ادنی مظاہرہ بھی ہے، اور ہمارے حفاظتی اسباب کے لئے تازیانہ بھی ہے، میں آپ کی اطاعت قبول کرتی ہوں اور آپ کے لئے اپنی وفاداری کا اعلان کرتی ہوں، اس سلسلے کے واقعات میں یہ بھی ہے کہ بلقیس کی آمد سے پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنات کے ذریعے سے ایک عظیم الشان محل بھی تعمیر کرایا تھا جو اپنی بلندی، وسعت اور خوب صورتی کے لحاظ سے بے نظیر تھا، اس میں داخل ہونے کے لئے جو صحن پڑتا تھا اس میں ایک بڑا حوض بنوایا گیا جس میں صاف شفاف پانی چھوڑا گیا اور اس کے اوپر شفاف آبگینوں سے اور بلوریں ٹکڑوں سے ایک فرش بنا دیا گیا جس سے نیچے حوض میں بہنے والا پانی پوری طرح چمکتا تھا اور دیکھنے والے کو یہ اندازہ ہی نہیں ہو پاتا تھا کہ اوپر فرش ڈلا ہوا ہے، ملکہ سبا کو اس قصر میں قیام کے لئے لے جایا گیا۔

جب ملکہ محل میں داخل ہونے لگیں اور انھوں نے صحن میں بہتا ہوا پانی دیکھا تو اسے عبور کرنے کے لئے کپڑوں کو پنڈلیوں سے اوپر اٹھانے کے لئے ہاتھ نیچے کئے تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا اس کی ضرورت نہیں ہے، یہ شیشے کا فرش ہے، جس سے پانی جھلک رہا ہے، شان وشوکت کے اس مظاہرے سے ملکہ کو تھوڑی سی خفت تو ہوئی مگر انہیں یہ بھی یقین آ گیا کہ جو مناظر میں دیکھ رہی ہوں یا شان وشوکت اور طاقت وقوت کے جو مظاہر میرے سامنے آ رہے ہیں وہ کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے، بلاشبہ یہ بے نظیر طاقت کسی ایسی ہستی کی عطا کردہ ہے جو شمس وقمر بل کہ پوری کائنات کی مالک ہے،

اسی لئے سلیمان علیہ السلام مجھ سے اپنی اطاعت کے خواہاں نہیں ہیں بل کہ وہ چاہتے ہیں کہ میں اس ہستی کو تسلیم کروں، یہ وہ لمحہ تھا جس نے ملکہ کے دل کی کائنات بدل دی، ان کی زبان سے یہ جملہ ادا ہوا: رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ. (١) ''اے میرے پروردگار (اب تک) میں اپنی ذات پر ظلم کرتی رہی اور (اب) میں سلیمان کے ساتھ اللہ پر ایمان لاتی ہوں جو تمام جہانوں کا رب ہے''۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا مقصد بھی یہی تھا کہ قوم سبا اور اس کی ملکہ اللہ پر ایمان لائیں اور غیر اللہ کی پرستش چھوڑیں، سو ان کا مقصد پورا ہوگیا، رہی یہ بات کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ بلقیس سے نکاح کرلیا تھا یا نہیں، اس سلسلے میں نہ قرآن کریم میں کوئی وضاحت ہے اور نہ احادیث کے ذخیرے میں کچھ ملتا ہے، اس لئے اس سلسلے میں ہمیں بھی کوئی رائے قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا امتحان:

اب تک جو واقعات بیان کئے گئے ہیں، ان سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی بے مثال شان وشوکت پر روشنی پڑتی ہے، واقعی اس طرح کی بادشاہت روئے زمین پر نہ کسی کو حاصل ہوئی ہوگی اور نہ آئندہ کسی انسان کو ملے گی، مگر اللہ کی طرف سے ان کی بھی آزمائش کی گئی، ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ اپنے گھوڑوں کے معائنے میں مصروف تھے کہ شام کی نماز پڑھنا بھول گئے، قرآن کریم میں یہ قصہ مذکور ہے کہ جب شام کے وقت ان کے سامنے اصیل اور عمدہ گھوڑے پیش کئے گئے تو ان کو دیکھنے میں اس قدر وقت لگا کہ دن چھپ گیا اور اس وقت کی نماز رہ گئی، کسی خادم کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ وہ یاد دلا دیتا، پھر خود ہی خیال آیا تو کہنے لگے کہ میں اس مال کی محبت میں اپنے رب کی یاد سے غافل ہوگیا، توبہ کی اور خادموں کو حکم دیا کہ ان گھوڑوں کو میرے سامنے لاؤ، چناں چہ گھوڑے لائے گئے، آپ نے ان کو ذبح کرڈالا، دوسرا واقعہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ خیال ظاہر فرمایا کہ آج رات میں اپنی تمام بیویوں کے ساتھ وظیفۂ زوجیت ادا کروں گا، اور ان میں سے ہر بیوی کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوگا جو اللہ کے راستے میں جہاد کرے گا،

(١) نمل: ٤٤۔

لیکن یہ خیال ظاہر فرماتے ہوئے آپ ان شاء اللہ کہنا بھول گئے، اللہ تعالیٰ کو اپنے محبوب بندے کی یہ بھول پسند نہیں آئی، اور اللہ نے آپ کے اس دعوے کو اس طرح غلط ثابت کیا کہ ان بیویوں میں سے صرف ایک حاملہ ہوئیں اور ان کے یہاں بھی ایک مردہ بچہ پیدا ہوا جس کا ایک پہلو نادارد تھا، حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس بھول کا احساس ہوا کہ میرے ان شاء اللہ نہ کہنے سے ایسا ہوا ہے، اسی وقت اللہ کی طرف رجوع فرمایا اور اپنی اس فروگذاشت پر استغفار کیا، یہ واقعہ صحیح بخاری وغیرہ میں مذکور ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات:

قرآن کریم نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے:

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنسَأَتَهُ.(۱) ''اور جب ہم نے اس (سلیمان) کی موت کا فیصلہ کر دیا تو ان جنوں کو موت کی خبر کسی نے نہیں دی مگر دیمک نے جو سلیمان کی لاٹھی چاٹ رہی تھی''۔ اس آیت کی تفسیر یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم سے جنات ایک عظیم الشان عمارت بنا رہے تھے، ابھی وہ عمارت پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچی تھی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت کا وقت قریب آ گیا، اگر آپ کو اسی حالت میں موت دے دی جاتی تو جنات تعمیر کا کام چھوڑ چھاڑ کر فرار ہو جاتے، ان کو حضرت سلیمان علیہ السلام کا رعب اور دبدبہ کام میں مشغول رکھتا تھا، اس کا انتظام اللہ نے یہ کیا کہ سلیمان علیہ السلام نے خود کو شیشے کے ایک کمرے میں محصور کر لیا اور لاٹھی سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے، عام طور پر اسی لکڑی کے سہارے ٹیک لگا کر آپ مصروف عبادت بھی رہتے تھے، جنات سمیت تمام لوگ یہ سمجھتے رہے کہ آپ عبادت کر رہے ہیں، حالاں کہ اس وقت فرشتۂ اجل نے آپ کی روح قبض کر لی تھی، صرف آپ کا جسد خاکی وہاں کھڑا ہوا تھا، جنات کو پتہ بھی نہ چلا کہ آپ وفات پا گئے ہیں، وہ برابر کام میں مشغول رہے، اِدھر دیمک نے اس لکڑی کو کھانا شروع کر دیا جس پر آپ ٹیک لگا کر کھڑے تھے، یہاں تک کہ لکڑی پوری طرح دیمک کی خوراک بن کر ختم ہو گئی،

(۱) سبا:۱۴۔

اسی کے ساتھ ہی آپ کا جسد خاکی بھی زمین پر گر پڑا، تب جنات کو پتہ چلا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام تو وفات پا چکے ہیں، یہ بھی ایک معجزہ تھا جو موت کے بعد ظاہر ہوا، آپ کی وفات ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ نبوت سے تقریباً پندرہ سو چھیالیس سال قبل ہوئی۔

حضرت ایوب علیہ السلام

قرآن کریم کی چار سورتوں میں حضرت ایوب علیہ السلام کا ذکر ہے، سورۂ نساء اور سورۂ انعام میں اختصار کے ساتھ اور سورۂ انبیاء اور سورۂ ص میں قدرے تفصیل کے ساتھ:

سورۂ انبیا میں ہے: وَأَيُّوبَ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَكَشَفْنَا مَا بِهِ مِن ضُرٍّ وَآتَيْنَاهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُم مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِندِنَا وَذِكْرَىٰ لِلْعَابِدِينَ.(۱) ''اور ایوب کو دیکھو! جب انہوں نے اپنے پروردگار کو پکارا کہ مجھے یہ تکلیف لگ گئی ہے اور تو رحم کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے، پھر ہم نے ان کی دعا قبول کی اور انہیں جو تکلیف لاحق تھی وہ دور کر دی، اور ان کو ان کے گھر والے بھی دئے اور ان کے ساتھ اتنے ہی اور بھی تاکہ ہماری طرف سے رحمت کا اظہار ہو اور عبادت کرنے والوں کے لیے یادگار سبق بنے''۔ سورۂ ص میں ہے: وَاذْكُرْ عَبْدَنَا أَيُّوبَ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ بِنُصْبٍ وَعَذَابٍ ارْكُضْ بِرِجْلِكَ هَٰذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ وَشَرَابٌ وَوَهَبْنَا لَهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُم مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِب بِّهِ وَلَا تَحْنَثْ إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا نِّعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ.(۲) ''اور ہمارے بندے ایوب کو یاد کرو جب انھوں نے اپنے رب کو آواز دی تھی کہ شیطان نے مجھے دکھ اور تکلیف لگائی ہے (ہم نے ان سے کہا) اپنا پاؤں زمین پر مارو، لو! یہ ٹھنڈا پانی ہے نہانے کے لئے بھی اور پینے کے لئے بھی، اور ہم نے ان کے گھر والے بھی عطا کر دئے اور ان کے ساتھ اتنے ہی

(۱) الانبیاء: ۸۳، ۸۴۔ (۲) ص: ۴۱: ۴۴۔

اور بھی، تا کہ ان پر ہماری رحمت ہو اور عقل والوں کے لئے ایک یادگار نصیحت بھی اور ہم نے ان سے یہ بھی کہا کہ اپنے ہاتھ میں تنکوں کا ایک مٹھا لو اور اس سے مار دو اور اپنی قسم مت توڑو، حقیقت یہ ہے کہ ہم نے ان کو بڑا صبر کرنے والا پایا وہ بہترین بندے تھے، واقعی وہ اللہ سے خوب لو لگائے ہوئے تھے"۔

بیماری کے ذریعہ حضرت ایوب علیہ السلام کی آزمائش اور بے مثال صبر:

ان آیات کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کو کوئی بہت ہی سخت جسمانی تکلیف لاحق تھی، جس پر وہ نہایت صبر کرتے تھے، قرآن کریم نے ان کے صبر وضبط کی تعریف کی ہے، یہی وجہ ہے کہ جب ہم کسی کو تکلیفوں پر صبر کرنے والا دیکھتے ہیں تو اس کے صبر کو صبر ایوب سے تشبیہ دیتے ہیں، قرآن کریم نے یہ نہیں بتلایا کہ حضرت ایوب علیہ السلام کو کیا تکلیف تھی، اسرائیلی روایات میں نہایت مبالغے کے ساتھ کام لیا گیا ہے اور طرح طرح کی بیماریاں بیان کی گئی ہیں، مگر ہمارے مفسرین کا موقف یہ ہے کہ جب قرآن کریم اس سلسلے میں خاموشی اختیار کرتا ہے تو ہمیں بھی ان کی بیماری سے متعلق عقلی گھوڑے دوڑانے کی ضرورت نہیں ہے، بہ ہر حال ان کو کوئی بڑی تکلیف تھی جس پر وہ انتہائی صبر کرتے تھے، اس تکلیف کی وجہ سے ان کے گھر والے، عزیز وقریب سب ساتھ چھوڑ گئے تھے، صرف ان کی بیوی ان کے ساتھ رہ گئیں تھیں، یا دو شخص اور تھے جو صبح وشام ان کے پاس آتے جاتے رہتے تھے، ایک مرتبہ جب تکلیف نے نہایت شدت اختیار کی تو انھوں نے بارگاہ الٰہی میں اپنی تکلیف کا اس طرح اظہار کیا کہ اس تکلیف کو شیطان کی طرف منسوب کیا، محققین کی رائے میں حضرت ایوب علیہ السلام نے یہ بات بہ طور ادب فرمائی، ورنہ حقیقت میں جو کچھ ہم پر گزرتی ہے یا جو واقعات وحوادث پیش آتے ہیں وہ سب اللہ ہی کی طرف سے ہوتے ہیں، خیر تو اللہ کی طرف سے ہے ہی، جس چیز کو ہم شر کہتے ہیں وہ ہماری نسبت سے شر ہے، ورنہ کائنات کے مجموعی مصالح کے لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ بھی خیر ہی ہے، اس لئے شر بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام کی دُعا:

قرآن کریم نے اپنے معجزانہ اسلوب میں حضرت ایوب علیہ السلام کے جن واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے، ان کی کچھ تفصیل تفسیر کی کتابوں میں ہے، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ دو شخص جو حضرت ایوب علیہ السلام کی خدمت میں صبح وشام آیا جایا کرتے تھے حاضر ہوئے، حضرت ایوب علیہ السلام کو انتہائی درد والم میں مبتلا دیکھ کر ان میں سے ایک شخص دوسرے سے کہنے لگا کہ ایوب سے یقیناً کوئی بہت بڑا گناہ سرزد ہوا ہے، تب ہی تو اتنی بڑی سزا انہیں دی گئی ہے، اور سزا بھی اتنی لمبی کہ ختم ہونے کے نام نہیں لے رہی ہے، دوسرے شخص نے یہ بات حضرت ایوب علیہ السلام کو بتلا دی کہ فلاں شخص یوں کہہ رہا تھا، یہ بات سن کر حضرت ایوب علیہ السلام کو بڑا صدمہ ہوا، فوراً سجدے میں گر پڑے، اور گڑ گڑا کر دعا کی اے پروردگار مجھے اس عذاب سے نجات عطا کر، کچھ ہی دیر گزری تھی کہ انہیں قضائے حاجت کی ضرورت پیش آئی، اہلیہ محترمہ ان کو لے کر گئیں، اور مخصوص جگہ پر بٹھلا کر چلی آئیں، جب فارغ ہو کر وہاں سے ہٹے تو وحی آئی کہ اے ایوب! اپنا پاؤں زمین پر مارو، جیسے ہی انھوں نے زمین پر پاؤں مارا پانی کا ایک چشمہ ابل پڑا، وحی آئی کہ یہ ٹھنڈا پانی ہے، پینے کے لئے بھی ہے اور غسل کرنے کے لئے بھی، حضرت ایوب علیہ السلام نے اس پانی سے غسل صحت کیا، ان کی تمام بیماری جاتی رہی، بل کہ پہلے سے زیادہ صحت مند ہو گئے، ادھر بیوی انتظار کر رہی تھیں کہ کب فارغ ہوں اور کب آواز دیں، اتنے میں کیا دیکھتی ہیں کہ سامنے سے ایک تندرست اور تروتازہ نکھرا ہوا شخص چلا آرہا ہے، اہلیہ ان کو پہچان نہ پائیں بل کہ اسی سے پوچھنے لگیں کہ ادھر میرے شوہر ایوب تھے کیا تم نے انہیں دیکھا ہے، آنے والے شخص نے کہا کیا تم نے مجھے پہچانا نہیں، میں ہی ایوب ہوں۔

بیماری سے نجات:

روایات میں ہے کہ غسل کے بعد اللہ نے ان کو تمام بیماریوں سے نجات عطا کر دی اور پہلے سے زیادہ صحت مند بنا دیا، اس طویل بیماری کی وجہ سے ان کے گھر والے انہیں چھوڑ کر چلے گئے تھے وہ بھی انہیں دے دیے گئے بل کہ اتنے ہی اور بھی دئے گئے، اس

طرح ان کا گھر آباد ہو گیا، دوسری طرف ان کی تنگ دستی اور غربت بھی دور کردی گئی، ان کے پاس کچھ گیہوں اور کچھ جو تھے، اللہ تعالیٰ نے گیہوں کو سونے اور جو کو چاندی سے بدل دیا، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام تین سال تک اس مصیبت میں مبتلا رہے، حضرت حسن بصری سات سال بتلاتے ہیں، ایک مرتبہ حضرت ایوب غسل فرما رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر سونے کی ٹڈیاں برسائیں، حضرت ایوب علیہ السلام نے دیکھا تو جلدی جلدی مٹھی بھر کر کپڑے میں رکھنے لگے، اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی فرمایا اے ایوب ہم نے تو پہلے ہی تمہیں بڑی دولت دے رکھی ہے، عرض کیا آپ کا ارشاد بجا ہے، لیکن جب آپ کی نعمتیں اور برکتیں برس رہی ہیں تو ہم بندے ان سے کس طرح مستغنی اور بے نیاز ہو سکتے ہیں۔

اہلیہ کی وفاداری:

جیسا کہ عرض کیا گیا حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری سے اکتا کر سب ہی نے ساتھ چھوڑ دیا تھا، صرف ان کی وفادار اہلیہ تھیں جنھوں نے ان کا ساتھ نبھایا، وہی ان کی تیمارداری کرتی تھیں اور وہی ان کی غمگسار بھی تھیں، ایک مرتبہ حضرت ایوب علیہ السلام اپنی بیماری سے کچھ زیادہ ہی پریشانی محسوس کررہے تھے کہ اہلیہ محترمہ کی زبان سے کچھ ایسے الفاظ نکل گئے جن میں اللہ سے شکوے شکایت کا پہلو نکلتا تھا، یہ الفاظ صبر ایوب کے بھی منافی تھی، اہلیہ کی یہ بات حضرت ایوب علیہ السلام کو پسند نہیں آئی اور قسم کھا کر کہنے لگے ذرا میں تندرست ہو جاؤں پھر میں تمہیں اس غلط بات پر سزا دوں گا اور سو کوڑے لگاؤں گا، اللہ تعالیٰ نے صحت دے دی، اب قسم پورا کرنے کا سوال ہوا، ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ ایک طرف قسم ہے جس کو پورا کرنا ضروری ہے، دوسری طرف نیک دل، وفاشعار، غمگسار اور خدمت گزار بیوی ہے، جس نے بیوی ہونے کا پورا پورا حق ادا کیا، ایسی وفاشناس خاتون کو سزا دیں تو کس طرح دیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو وحی کے ذریعے حکم دیا کہ وہ سو تنکوں کا ایک مٹھا لیں اور اس سے اپنی بیوی کو ماریں، اس سے ان کی قسم بھی پوری ہو جائیں گی اور بیوی کو کوئی زیادہ تکلیف بھی نہیں ہوگی۔

حضرت یونس علیہ السلام

نینوا میں بعثت:

قرآن کریم کی چھ سورتوں میں حضرت یونس علیہ السلام کا تذکرہ ہے، دو سورتیں جن میں دوسرے انبیاء کرام کے ساتھ صرف نام مذکور ہے یہ ہیں، سورۂ نساء اور سورۂ انعام، باقی چار سورتوں میں واقعات بھی بیان کئے گئے ہیں، سورۂ یونس اور سورۂ صافات میں ان کا تذکرہ یونس نام کے ساتھ کیا گیا ہے اور سورۂ انبیاء و سورۂ قلم میں نام کے بجائے صفت ذکر کی گئی ہے، ایک میں ذوالنون اور دوسری میں صاحب الحوت، نون اور حوت دونوں کے معنی ہیں مچھلی، یہ صفت اس لئے بیان کی گئی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کچھ وقت کے لئے مچھلی کے پیٹ میں رہے، پھر اللہ نے اپنے فضل و کرم سے انھیں مچھلی کے پیٹ سے نکالا۔

تفسیر ماجدی میں ہے کہ ان کے والد کا نام متّی تھا، تورات میں ان کا نام جون یا یونا کر بیان کیا گیا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے آٹھ سو برس قبل نینوا میں مبعوث ہوئے، یہ شہر اس زمانے کی سپر پاور سیریا کا پایۂ تخت تھا، آج کل عراق میں جہاں موصل ہے اس کے بالمقابل دریائے دجلہ کے بائیں کنارے پر واقع ہے، اس وقت نینوا کا رقبہ اٹھارہ سو ایکڑ تھا (تفسیر ماجدی)، قرآن کریم میں بتلایا گیا ہے کہ جس وقت حضرت یونس علیہ السلام نینوا میں مبعوث ہوئے، اس وقت شہر کی آبادی ایک لاکھ یا اس سے کچھ زائد تھی۔

قوم کی سرکشی اور حضرت یونس علیہ السلام کی پیش گوئی:

حضرت یونس علیہ السلام نے ایک لمبے عرصے تک نینوا میں قیام فرمایا اور وہاں کے لوگوں کو ایمان لانے کی دعوت دی، جب وہ قوم راہ راست پر نہ آئی تو انھوں نے متنبہ کیا کہ تم پر تین دن کے اندر اندر عذاب آئے گا، تم سب ہلاک ہو جاؤ گے اور تمہارا یہ شہر بھی تباہ و برباد ہو جائے گا، یہ کہہ کر حضرت یونس علیہ السلام شہر سے باہر چلے گئے، لوگوں میں ہلچل

مچ گئی، وہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ حضرت یونس علیہ السلام کبھی جھوٹ نہیں بولتے، ان کا یہاں سے چلے جانا بھی اس بات کی علامت ہے کہ شہر پر کوئی ناگہانی آفت آنے والی ہے، ادھر کچھ علامات بھی ایسی ظاہر ہوئیں جن سے اس عذاب کا خطرہ یقین میں تبدیل ہونے لگا، سب لوگوں نے اللہ کے حضور عاجزی کے ساتھ توبہ کی، اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور عذاب ٹل گیا، حضرت یونس علیہ السلام کیوں کہ شہر سے چلے گئے تھے، انہیں معلوم نہیں تھا کہ لوگ توبہ کر چکے ہیں اور ان کی توبہ کے نتیجے میں اللہ نے عذاب ٹال دیا ہے، اس لئے جب تین دن گزر گئے اور بستی پر عذاب نہیں آیا تو انہیں خیال ہوا کہ اگر میں واپس جاتا ہوں تو میری قوم کے لوگ مجھے جھوٹا ٹھہرائیں گے، یہ بھی ممکن ہے کہ مجھے جھوٹا سمجھ کر قتل کر دیں، اس لئے اللہ کے حکم کا انتظار کرنے کے بجائے وہ سمندر کی طرف نکل گئے، وہاں پہنچ کر وہ ایک کشتی پر سوار ہوئے جو مسافروں سے بھری ہوئی تھی، کیوں کہ حضرت یونس علیہ السلام اللہ کے جلیل القدر پیغمبر تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ بات پسند نہیں آئی کہ انھوں نے حکم الٰہی کا انتظار کئے بغیر وہ جگہ چھوڑ دی، اور سمندر کی طرف نکل آئے، یہاں تک کہ کسی دوسری جگہ جانے کے ارادے سے کشتی میں بھی بیٹھ گئے، مسافروں سے بھری ہوئی کشتی جب بیچ سمندر میں پہنچی تو ڈوبنے کے قریب آگئی، ملاحوں نے کہا کشتی میں وزن زیادہ ہو رہا ہے، ایک آدمی کو کشتی سے باہر نکلنا ہوگا تبھی کشتی صحیح طریقے سے چل پائے گی، سوال یہ ہوا کہ مسافروں میں سے یہ قربانی کون دے، کشتی سمندر کے اندر ہے، ساحل تک تیر کر پہنچنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے، فیصلہ ہوا کہ تمام مسافروں کے نام کی پرچیاں بنالی جائیں اور قرعہ ڈال لیا جائے، جس کا نام نکلے اس کو کشتی سے اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا جائے، قرعہ ڈالا گیا، حضرت یونس علیہ السلام کا نام نکلا، کئی مرتبہ قرعہ ڈالا گیا ہر مرتبہ آپ ہی کا نام نکلا، چناں چہ کشتی والوں نے ان کو پکڑ کر پانی میں پھینک دیا، ایک بڑی مچھلی کو حکم ہوا کہ ہمارا ایک نیک بندہ کشتی سے اٹھا کر سمندر میں پھینکا جارہا ہے، تو اپنا منہ کھول کر کھڑی رہ اور جب ان کو پھینکا جائے تو ان کو نگل لے، ایسا ہی ہوا، ایک بڑی مچھلی منہ کھولے آپ کے انتظار میں تھی، جیسے ہی آپ کو سمندر کے اندر پھینکا گیا اس نے ان کو نگل لیا، مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ کشتی کے ڈانواڈول ہونے کے بعد آپ کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ مجھ

سے غلطی سرزد ہوئی ہے، اور یہ اسی کی سزا ہے، انھوں نے ملاحوں سے کہا کہ میں اپنے آقا کا بھگوڑا غلام ہوں، میری ہی وجہ سے کشتی پر یہ مصیبت آئی ہے، مجھے پانی میں پھینک دو، لیکن ملاح اس کے لئے تیار نہیں ہوئے بل کہ یہ فیصلہ کیا کہ قرعہ ڈالا جائے اور جس کا نام نکل آئے اس کو پھینک دیا جائے، آپ کچھ عرصے مچھلی کے پیٹ میں رہے، اس دوران آپ یہ تسبیح پڑھتے رہے، لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّي كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ. اس تسبیح کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے آپ کی دُعا قبول فرمائی، مچھلی کو حکم دیا کہ وہ ان کو کسی میدان میں لا کر ڈال دے، ایسا ہی ہوا، روایات میں ہے کہ ایک عرصے تک مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی وجہ سے حضرت یونس علیہ السلام بہت کمزور ہو گئے تھے، بعض روایات میں تو یہ بھی ہے کہ ان کے بدن پر بال بھی نہیں رہے تھے، اس میدان میں اللہ تعالیٰ نے خاص ان کے لئے کدو کا درخت اُگایا، جسے وہ کھاتے رہے اور اور ایک بکری بھیج دی جس کا دودھ پیتے رہے یہاں تک کہ تندرست ہو گئے۔

حضرت یونس علیہ السلام کی نینوا سے روانگی:

مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام اپنے اجتہاد سے یہ سمجھے کہ جب قوم پر سے عذاب ٹل گیا ہے تو اب میرا یہاں ٹھہرنا ضروری نہیں ہے، اس لئے وحی کا انتظار کئے بغیر وہ وہاں سے روانہ ہو گئے، حالاں کہ مرتبۂ نبوت کے شایانِ شان یہی تھا کہ وحی کا انتظار کیا جاتا، یہ بات کچھ نامناسب سی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آنے سے پہلے ہی وہ وہاں سے نکل گئے، اسی پر گرفت ہو گئی، بڑے لوگوں کی یہی شان ہوتی ہے کہ معمولی سی نامناسب بات پر بھی ان سے باز پرس ہو جاتی ہے، بہ ہر حال مچھلی کے پیٹ سے نجات پانے کے بعد ان کو حکم ہوا کہ وہ اپنی قوم میں واپس جائیں، اور اسے سنبھالیں۔

وطن کی طرف واپسی:

حکم ملتے ہی آپ نینوا کی طرف روانہ ہو گئے، راستے میں ایک چرواہا ملا، آپ نے اس سے نینوا کے حالات معلوم کئے، اس نے کہا کہ ہمارے ایک نبی تھے، یونس، انھوں نے ہمیں بہت سمجھایا مگر ہم نے ان کی بات نہیں مانی، ایک دن وہ عذاب کی پیش گوئی کر کے

نینوا سے چلے گئے تب ہمیں ہوش آیا، عذاب کے آثار شروع ہوئے تو ہم لوگوں نے توبہ کی، اور دعا کی کہ اے اللہ ہم سے اپنا عذاب ٹال دے، اللہ کو رحم آ گیا، اور اس نے اپنا عذاب ٹال دیا، حضرت یونس علیہ السلام نے چرواہے سے کہا کہ اگر تیری بکریوں میں دودھ ہو تو مجھے پلا دے، اس نے کہا کیسا دودھ، کہاں کا دودھ، جب سے ہمارے پیغمبر یونس بستی چھوڑ کر گئے ہیں قحط نے ہمیں گھیر لیا ہے، بکریوں کے تھن خشک ہو چکے ہیں، کھیت بنجر بن گئے ہیں، غلّہ تو درکنار گھانس تک پیدا نہیں ہوتی، قوم کی یہ حالت زار سن کر آپ کو سخت تکلیف ہوئی، اور اپنے جانے کا افسوس بھی ہوا، آپ نے چرواہے کو کچھ تسلّی دی اور بکریوں کے بدن پر ہاتھ پھیرا تو وہ موٹی تازہ ہو گئیں، ان کے تھن دودھ سے بھر گئے، یہ دیکھ کر چرواہا حیرت زدہ ہو گیا، اس نے سوچا کہ یقیناً یہی ہمارے روحانی باپ اور پیشوا ہیں جو ہمیں چھوڑ کر چلے گئے تھے، یہ سوچ کر وہ شہر کی طرف بھاگا اور لوگوں کو خوش خبری سنائی کہ ہمارے نبی واپس آ گئے ہیں، قوم کے لوگ تو منتظر بیٹھے تھے، یہ سنتے ہی ساری آبادی دیوانوں کی طرح باہر نکل آئی، حضرت یونس علیہ السلام کو دیکھا تو لوگ ان کے قدموں پر گر پڑے اور بڑے احترام کے ساتھ انہیں شہر میں لے کر آئے، آپ کے زندہ سلامت واپس آنے کے بعد لوگوں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور اطمینان وسکون کا سانس لیا، کچھ عرصے زندہ رہنے کے بعد حضرت یونس علیہ السلام نے اسی شہر میں وفات پائی اور یہیں کسی پہاڑی پر دفن ہوئے۔

حضرت عزیر علیہ السلام

حضرت عزیر اور قرآن حکیم:

قرآن کریم میں صرف ایک جگہ حضرت عزیر علیہ السلام کا ذکر آیا ہے، اور وہ بھی یہود کی گمراہی کے ضمن میں کہ وہ عزیر کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے، (سورۂ توبہ: ۳۰) اس کے علاوہ قرآن کریم میں ان کا ذکر نام کے ساتھ نہیں ہے، البتہ سورۂ بقرہ میں ایک واقعہ مذکور ہے جس کے متعلق اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ اس میں جس ہستی کو سو سال تک مردہ رکھ کر

زندگی دی گئی ہے وہ حضرت عزیر علیہ السلام ہیں، قرآن کریم کے الفاظ میں وہ واقعہ کچھ اس طرح ہے: أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَلْ لَبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ وَانْظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِلنَّاسِ وَانْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ.(۱) ”یا (تم نے) اس جیسے شخص (کے واقعے) پر (غور کیا) جس کا ایک بستی پر ایک ایسے وقت گزر ہوا جب وہ چھتوں کے بل گری پڑی تھی، اس شخص نے (دل میں) کہا کہ اللہ اس بستی کو اس کے مرنے کے بعد کیسے زندہ کرے گا (آباد کرے گا) پھر اللہ نے اس کو سو سال تک کے لئے موت دی، پھر اس کے بعد اس کو زندہ کیا، (پھر) پوچھا کہ تم کتنے عرصے تک (اس حالت میں) رہے ہو، اس نے کہا: ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ، اللہ نے کہا: نہیں بل کہ تم سو سال تک اسی حالت میں رہے ہو، اب تم اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو وہ ذرا نہیں سڑیں، اور (دوسری طرف) اپنے گدھے کو دیکھو (کہ گل سڑ کر اس کا کیا حال ہو گیا ہے) اور یہ ہم نے اس لئے کیا تاکہ ہم تمہیں لوگوں کے لئے (اپنی قدرت کا) ایک نشان بنا دیں، اور (اب اپنے گدھے کی) ہڈیوں کو دیکھو ہم کس طرح انہیں اٹھاتے ہیں، پھر ان کو گوشت کا لباس پہناتے ہیں، چناں چہ جب حقیقت کھل کر اس کے سامنے آ گئی تو وہ بول اٹھا کہ مجھے یقین ہے کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے“۔(۱)

سو سال کے بعد زندہ کئے گئے:

اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ اس آیت کریمہ میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے اس کا تعلق یروشلم سے ہے، اور اس میں جس شخصیت کو موت دی گئی، پھر سو سال کے بعد اس کو زندہ کیا گیا اس سے مراد حضرت عزیر علیہ السلام ہیں، اگر چہ بعض لوگوں نے حضرت ارمیا علیہ السلام کو اس کا مصداق قرار دیا ہے، اور بعض حضرات اس شخصیت کو متعین نہیں کرتے، بل کہ یہ کہتے ہیں کہ جس ہستی کو اور جس بستی کو اللہ نے مجہول رکھا ہو ہمیں اس کو مشخص کرنے

(۱) البقرہ:۲۵۹۔

کی ضرورت نہیں ہے، لیکن حضرت عمرؓ کے ایک واقعے سے جس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے، ان حضرات مفسرین کی تائید ہوتی ہے جنھوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اس واقعے کا مصداق ٹھہرایا ہے۔

اس واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ بخت نصر نامی بادشاہ نے ۵۸۶ ق م میں یروشلم کو تباہ و برباد کردیا تھا، اس کے باشندے قتل کردئے گئے تھے یا نقل مکانی کر گئے تھے اور اس کے مکانات چھتوں کے بل گرادئے گئے تھے، پوری بستی کھنڈرات میں تبدیل ہوگئی تھی، بخت نصر نے جب یروشلم پر حملہ کیا تھا تو وہ اپنے ساتھ بنی اسرائیل کے کچھ اہم لوگوں کو قیدی بنا کر بھی لے گیا تھا، ان میں ایک قیدی پیغمبر حضرت عزیر علیہ السلام بھی تھے، ان کی خصوصیت یہ تھی کہ ان کو پوری تورات حفظ یاد تھی، جب حضرت عزیر علیہ السلام بخت نصر کی قید سے رہا ہوکر واپس آئے تو انھوں نے اس تباہ حال بستی کو دیکھا تو ان کے دل میں یہ خیال آیا کہ پوری بستی کھنڈر میں تبدیل ہوچکی ہے، کوئی ذی نفس یہاں زندہ نہیں ہے، اللہ تعالیٰ اس بستی کو دوبارہ کیسے آباد کریں گے، یہ خیال آنا تھا کہ ملک الموت کو حکم ہوا کہ ان کی روح فوراً قبض کرلی جائے، موت کے فرشتے نے حکم کی تعمیل کی، حضرت عزیر علیہ السلام گدھے پر سوار تھے، ان کا گدھا بھی وہیں مرگیا، سوسال تک دونوں مردہ حالت میں اسی جگہ پڑے رہے، اس عرصے میں بخت نصر بھی مرکھپ گیا، حکومتیں تبدیل ہوگئیں، یہ شہر اور دوسرے شہر بھی آباد ہوگئے، سوسال بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو دوبارہ زندہ کردیا، حضرت عزیر علیہ السلام زندہ ہوکر سوچنے لگے کہ میں سوکر اٹھا ہوں، یہ خیال انھیں اس لئے آیا کہ جس وقت ان کی روح قبض کی گئی تھی اس وقت آفتاب طلوع ہورہا تھا اور جس وقت زندہ ہوئے سورج چھپ رہا تھا، اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے ان سے سوال کیا کہ تم اس حالت پر کتنی دیر تک رہے، انھوں نے جواب دیا کہ میں ایک دن تک یا دن کے کچھ حصے تک اس حالت پر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ نے کہا کہ تم سوسال تک اس حالت پر رہے ہو، یہ محض ہماری قدرت ہے کہ ہم نے سوسال تک تمھیں مردہ رکھ کر زندہ کردیا، یہی نہیں کہ تم سوسال تک مردہ رہ کر اپنی حالت پر آگئے بل کہ ہماری قدرت کاملہ کا دوسرا مظہر یہ ہے کہ تمھارے ساتھ کھانے پینے کا جو سامان تھا وہ جوں کا توں باقی ہے، اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود اس میں کسی طرح

کا کوئی تغیر پیدا نہیں ہوا، وہ نہ کم ہوا اور نہ سڑا گلا، دوسری طرف تم اپنے گدھے کو دیکھو کہ وہ گل سڑ گیا ہے اور اس کی صرف ہڈیاں باقی رہ گئی ہیں، جس طرح ہم نے تمہیں دوبارہ زندگی دی ہے اسی طرح اب ہم تمہارے گدھے کو بھی زندہ کریں گے، چناں چہ پہلے گدھے کی بکھری ہوئی ہڈیاں ایک جگہ جمع ہوئیں پھر ان پر گوشت چڑھا پھر کھال درست ہوئی، پھر جان پڑی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ کھڑا ہوکر آوازیں نکالنے لگا، قدرت خداوندی کے یہ سارے مناظر دیکھ کر حضرت عزیر علیہ السلام بول اٹھے کہ خدایا! مجھے تیری قدرت کاملہ پر یقین کامل ہے، بلاشبہ تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

یروشلم کی طرف کوچ:

بہ ہر حال حضرت عزیر علیہ السلام زندہ ہوکر اپنے گدھے پر سوار ہوئے اور یروشلم پہنچے، شہر کا نقشہ بدلا ہوا تھا، جانی پہچانی صورتیں غائب ہوچکی تھیں، نئے چہرے نظر آرہے تھے، لوگوں سے ملے تو انہیں بتلایا کہ میں عزیر ہوں، لوگوں کو یقین ہی نہیں آیا، کہنے لگے کہ سو سال بعد عزیر کہاں سے آگئے، اگر تم واقعی عزیر ہو تو ہمیں تورات پڑھ کر سناؤ، عزیر تو پوری تورات کے حافظ تھے، سو سال پہلے جب بخت نصر نے شہر پر حملہ کیا تھا اس نے تورات کے تمام نسخے جلا دئے تھے، اور اب ہمارے پاس تورات باقی نہیں ہے، نہ کوئی شخص اس کا جاننے والا ہے، حضرت عزیر علیہ السلام نے پوری تورات ان کو سنادی، تب جاکر لوگوں کو یقین آیا کہ یہ اللہ کے نبی عزیر ہیں، یہودیوں کی انتہا پسندی دیکھئے یا تو وہ انہیں عزیر بھی ماننے کے لئے تیار نہیں تھے اور جب مان لیا تو کہنے لگے کہ تم تو اللہ کے بیٹے ہو، تورات کا حافظ ہونے کی وجہ سے یہودیوں کے دل میں ان کی قدر ومنزلت اس قدر بڑھی کہ گمراہی تک جا پہنچی، وہ لوگ انھیں اللہ کا بیٹا کہنے لگے اس دلیل کے ساتھ کہ انہوں نے بغیر کسی لوح وقلم کے پوری تورات حرف بہ حرف ہمیں سنادی اور اس کو دوبارہ تحریری شکل دیدی، یہ قدرت ان کے اندا سی لئے پیدا ہوئی کہ یہ اللہ کے بیٹے ہیں، حضرت عزیر علیہ السلام نے جب یہ سنا تو فرمایا نعوذ باللہ، یہ تو بہتان عظیم ہے، اللہ کی ذات اس عیب سے بالکل پاک ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ کا ایک واقعہ بہت مشہور ہے کہ کسی عیسائی بادشاہ نے چار سوال لکھ کر انہیں بھیجے تھے کہ ان کا جواب آسمانی کتابوں کی مدد سے دیا جائے، ان میں ایک سوال یہ تھا کہ وہ دو کون سے آدمی ہیں جو ایک ہی دن اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے اور دونوں نے ایک ہی دن وفات پائی، مگر ان میں سے ایک بھائی اپنے دوسرے بھائی سے سو سال چھوٹا ہے، حضرت عمر فاروقؓ نے اس سوال کا یہ جواب لکھوا کر بھیجا کہ وہ دو آدمی حضرت عزیر علیہ السلام اور ان کے بھائی عزیز ہیں، حضرت عزیر کو اللہ تعالیٰ نے سو سال تک مردہ رکھ کر زندہ کیا، قرآن کریم کی سورۂ بقرہ میں اس کا ذکر موجود ہے۔

بہ ہر حال حضرت عزیر علیہ السلام زندہ ہوکر اپنے گھر پہنچے، اس وقت تک ان کے بھائی عزیز حیات تھے، کچھ دن دونوں بھائی زندہ رہے، پھر دونوں بھائیوں نے ایک ہی دن وفات پائی۔

حضرت زکریا علیہ السلام

ایک عظیم پیغمبر:

آپ حضرت یونس علیہ السلام کے بعد یروشلم میں مبعوث ہوئے، انبیاء بنی اسرائیل میں سے ہیں، سلسلۂ نسب حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام سے ملتا ہے، آپ پیغمبر کے ساتھ ساتھ کاہن بھی تھے، اسرائیلیوں میں یہ ایک بڑا روحانی منصب تھا، اور اس سے مختلف تھا جو اسلام کے دور اول میں معروف تھا کہ کاہن ہاتھ وغیرہ دیکھ کر مستقبل کے حالات بتلاتے تھے، بیت المقدس کی تولیت آپ ہی کے سپرد تھی، حدیث شریف میں ہے کہ زکریا علیہ السلام پیشے سے بڑھئی تھے، کار نبوت اور ہیکل کی خدمت سے وقت بچتا تو رزق حاصل کرنے کے لئے لکڑی کی چیزیں بنا کر فروخت فرماتے، قرآن کریم میں آپ کا تذکرہ چار سورتوں میں ہے، سورۂ الانعام میں صرف نام ہے، سورۂ آل عمران، سورۂ مریم اور سورۂ الانبیاء میں کچھ تفصیلات بھی ہیں، مگر کسی بھی جگہ کچھ زیادہ بیان نہیں کیا گیا ہے۔

حضرت مریم کے مربی اور اتالیق:

حضرت مریم علیہا السلام کے ذکر کے ساتھ حضرت زکریا علیہ السلام کا تذکرہ ناگزیر ہے، حضرت مریم کی والدہ حنہ نے منت مانی تھی کہ اگر ان کے یہاں کوئی بچہ پیدا ہوا تو وہ اس کو ہیکل (عبادت گاہِ یہود) کے سپرد کردیں گی، اتفاق سے ان کے یہاں بچی پیدا ہوئی جس کا نام انہوں نے مریم رکھا، حنہ کو بڑا صدمہ ہوا، اور یہ خیال آیا کہ میں نے تو منت مانی تھی کہ میں بچے کو ہیکل میں دے دوں گی، اب کیا کروں، انھوں نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا، اے پروردگار! میں نے تو لڑکی جنی ہے، پھر خیال آیا کہ لڑکی ہو یا لڑکا جو نذر مانی تھی وہ تو پوری کرنی ہی ہے، جب وہ بچی تین برس کی ہوگئی تو اس کی والدہ حنہ اور والد عمران بن ناشی اُن کو لے کر ہیکل میں حاضر ہوئے، ہیکل کے کئی خدام متمنی ہوئے کہ اس بچی کو ان کی کفالت اور سرپرستی میں دے دیا جائے، فیصلہ ہوا کہ قرعہ ڈال لیا جائے، جس کا نام نکلے گا بچی کو اس کے سپرد کردیا جائے گا، چناں چہ قرعہ ڈالا گیا، اور حضرت زکریا علیہ السلام کا نام نکل آیا، بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ قرعے کی یہ صورت اختیار کی گئی کہ تمام امیدوار تورات لکھنے کا قلم دریا میں ڈال دیں، جس کا قلم بہاؤ کے مخالف سمت اوپر کی طرف چڑھے وہی بچی کا حق دار ہوگا، بہ ہر حال قرعے کی جو شکل بھی اختیار کی گئی ہو نام حضرت زکریا علیہ السلام کا نکلا، حضرت مریم علیہا السلام کو ان کے سپرد کردیا گیا، حسن اتفاق دیکھئے کہ حضرت مریم کی والدہ حنہ اور حضرت زکریا علیہ السلام کی بیوی ایشاع دونوں بہنیں تھیں، اس طرح وہ ماں سے تو جدا ہوگئیں لیکن اپنی حقیقی خالہ اور خالو کی کفالت میں آگئیں، جنھوں نے انھیں بڑے ناز ونعم سے پالا، حضرت مریم کا رجحان نو عمری سے ہی کھیل کود کے بجائے عبادت وریاضت کی طرف تھا، وہ زیادہ تر وقت یاد الٰہی میں گزارتیں، جب ذرا بڑی ہوئیں تو حضرت زکریا علیہ السلام نے ان کے لئے ایک خاص حجرہ بنوا دیا، قرآن کریم میں اس کو محراب کہا گیا ہے، ان کا وقت اسی حجرے میں گزرنے لگا جب کبھی حضرت زکریا علیہ السلام حضرت مریم علیہا السلام سے ملنے کے لیے ان کی عبادت گاہ میں تشریف لے جاتے تو ان کے پاس انواع واقسام کے کھانے اور بے موسم کے پھل دیکھ کر حیران رہ جاتے، حیرت

اس بات پر تو تھی ہی کہ اس حجرے میں جہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا یہ پھل کون رکھ کر جاتا ہے، پھر پھل بھی ایسے جو بے موسم کے ہوتے، سردی کے پھل گرمی میں اور گرمی کے پھل سردی میں نظر آتے، انھوں نے حضرت مریم سے پوچھا کہ اے مریم! تمہارے پاس یہ پھل اور کھانے کی چیزیں کہاں سے آتی ہیں، انھوں نے عرض کیا کہ یہ چیزیں اللہ کے پاس سے آتی ہیں اور اللہ جسے چاہتا ہے بے سان وگمان رزق پہنچاتا ہے، بہ ہر حال یہ حضرت مریم کا معجزہ تھا کہ بچپن ہی سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے مقربین میں شامل کرلیا تھا، فرشتوں کے ذریعے جنت کے پھل اور میوے بلا روک ٹوک ان تک پہنچا کرتے تھے۔

بیٹے کی پیدائش:

حضرت زکریا علیہ السلام اس وقت ستر برس کے ہو چکے تھے، ان کی بیوی بانجھ تھیں، اس لئے اولاد کی نعمت سے محروم تھے، تمنا تھی کہ میرے یہاں بھی کوئی بچہ پیدا ہوتا، جو میرے بعد میرا جانشین بنتا، اور قوم کی اصلاح کرتا، حضرت مریم کے پاس جب انھوں نے بے موسم کے پھل دیکھے اور یہ معلوم ہوا کہ یہ سب اللہ کی طرف سے آتے ہیں تو ان کے دل میں خیال آیا کہ جو اللہ مریم کو بے موسم کے پھل کھلا سکتا ہے، میری بیوی کا بانجھ پن دور کر کے مجھے بھی اس بڑھاپے میں اولاد کی نعمت عطا کر سکتا ہے، مجھے بارگاہ ایزدی میں دُعا کرنی چاہئے، میری دعا کو بھی اللہ شرف قبولیت عطا کرے گا، چناں چہ حضرت زکریا علیہ السلام نے دعا کی: اے میرے پروردگار مجھ کو اپنی طرف سے نیک اولاد عطا فرما، بے شک تو دُعا کا سننے والا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اپنے پیغمبر کی دُعا قبول فرمائی، ان کی بیوی میں استقرار حمل کی صلاحیت پیدا کر دی گئی، قرآن کریم نے اس پورے گھرانے کی تعریف کی ہے کہ یہ سب لوگ اچھے کاموں میں پیش پیش رہتے تھے، ہمیں خوف اور امید کے ساتھ پکارا کرتے تھے، اور ہمارے سامنے عاجزی کرنے والے تھے، ایک دن حضرت زکریا علیہ السلام مسجد میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے کہ فرشتوں نے انہیں آواز دی، اور کہا کہ اے زکریا! اللہ تعالیٰ آپ کو بچے کی بشارت دیتا ہے، وہ کلمۃ من اللہ یعنی حضرت عیسیٰ کی تصدیق کرنے والا ہوگا، سردار ہوگا، خواہشات نفس پر قابو یافتہ ہوگا اور نیک لوگوں کے

زمرے میں سے ایک نبی ہوگا، اس عمر میں نیک صالح اور پیغمبر بیٹے کی خوش خبری سن کر حضرت زکریا علیہ السلام کو خوشی بھی ہوئی اور تعجب بھی ہوا، اپنا استعجاب دور کرنے کے لئے انھوں نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا! الہ العالمین! میرے یہاں لڑکا کس طرح ہوگا جب کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بچہ جننے کی صلاحیت نہیں رکھتی، وحی آئی اے زکریا! ایسا ہی ہوگا، اللہ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے، حضرت زکریا علیہ السلام نے عرض کیا کہ میرے لئے کوئی علامت متعین فرمادیجئے تاکہ مجھے پتہ چل جائے کہ میری بیوی کے حمل قرار پاچکا ہے، فرمایا علامت یہ ہوگی کہ جب حمل ٹھہر جائے گا تو تم تین دن تک زبان سے بول نہ پاؤ گے، صرف اشارے سے بات کروگے، چناں چہ جب وہ وقت آیا تو زبان کلام سے رُک گئی، آپ خلوت گاہ سے نکل کر باہر تشریف لائے اور لوگوں کو اشارے سے سمجھایا کہ اللہ کی یاد میں مشغول ہو جاؤ، نمازیں پڑھو اور اس کی حمد و ثنا بیان کرتے رہو۔

باپ بیٹے دونوں نبی:

دونوں باپ بیٹے ایک ہی وقت میں ایک ہی قوم میں اور ایک ہی مقام پر دعوت الی اللہ کا فریضہ انجام دیتے رہے، حضرت زکریا علیہ السلام کی وفات کے متعلق دو قول مشہور ہیں ایک تو یہ کہ ان کی موت طبعی ہوئی ہے اور دوسری یہ کہ ان کو شہید کیا گیا ہے، مفسرین کا رجحان اسی طرف ہے کہ ان کو شہادت کی موت نصیب ہوئی ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ یہود اپنی کمینی فطرت کی بنا پر اپنے محسنوں کے بھی دشمن بنتے رہے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں آپ بہت کچھ پڑھ چکے ہیں، حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت یحیٰ علیہ السلام دونوں اس قوم کے محسن تھے، مگر یہ قوم ان کی بھی دشمن بن گئی، پہلے انھوں نے حضرت یحیٰ علیہ السلام کو شہید کیا، پھر حضرت زکریا علیہ السلام کی طرف بڑھے، آپ ان کے شر سے بچنے کے لئے جنگل کی طرف بھاگے، ایک درخت نے آواز دی کہ میرے اندر آکر پناہ لے لیں، وہ درخت بیچ میں سے شق ہوگیا اور آپ بھاگ کر اس میں چھپ گئے، شیطان جو انبیاء کا ازلی دشمن رہا ہے آیا اور اس نے تلاش میں سرگرداں لوگوں کو بتلایا کہ تم جسے ڈھونڈ رہے ہو وہ اس درخت کے اندر چھپا ہوا ہے، لوگوں کو یقین نہیں آیا، اتفاق سے ذرا سا کپڑا

درخت سے باہر نکلا ہوا رہ گیا تھا، شیطان نے چیخ کر کہا دیکھو اس کا کپڑا ابھی نظر آرہا ہے، یہ سنتے ہی یہود درخت کی طرف دوڑ پڑے اور اسے آرے سے کاٹنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ آرہ سر تک پہنچ گیا، آپ نے اف تک نہیں کی اور راہ حق میں جام شہادت نوش فرمالیا، آپ کا مزار دمشق کی جامع مسجد میں مرجع عام وخاص بنا ہوا ہے۔

حضرت یحیٰ علیہ السلام

حضرت مریم کے خالہ زاد بھائی:

حضرت یحیٰ علیہ السلام: پیغمبر خدا حضرت زکریا علیہ السلام کے فرزند، حضرت مریم علیہا السلام کے خالہ زاد بھائی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماموں ہیں، ان کی والدہ بانجھ تھیں اور والد کی عمر نوے برس ہو چکی تھی، دونوں کی دلی تمنا تھی کہ ان کے آنگن میں بھی پھول کھلے، والد ماجد نے دعا کی کہ اے اللہ! مجھے بھی نیک صالح اولاد عطا فرما، دُعا قبول ہوئی، وحی آئی کہ اے زکریا ہم تمہیں ایک ایسے لڑکے کی خوش خبری دیتے ہیں جس کا نام یحیٰ ہوگا، اس سے پہلے اس نام سے ہم نے کسی کو پیدا نہیں کیا، بہ ہر حال ایک بیٹا پیدا ہوا، جو نہایت اعلا صفات کا حامل تھا، قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ: مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَحَصُورًا وَنَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ.(۱) ''وہ کلمۃ اللہ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کرنے والا ہوگا، سردار ہوگا، خواہشات نفس سے رُکنے والا ہوگا اور نیک وصالحین میں سے ایک نبی ہوگا''۔ آیت میں کلمۃ اللہ کی تفسیر کرتے ہوئے مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات گرامی ہے، ان کو کلمۃ اللہ اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ تخلیق کے روایتی مرحلوں سے گزرنے کے بعد پیدا نہیں ہوئے بل کہ محیر العقول طریقے پر دنیا میں تشریف لائے کہ اللہ تعالیٰ نے کلمہ کن ارشاد فرمایا اور وہ اپنی والدہ کے پیٹ میں موجود تھے، بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ جس طرح لوگ اللہ کے کلام سے

(۱) آل عمران:۳۹۔

رہ نمائی حاصل کرتے ہیں، اسی طرح وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کلام سے بھی رہ نمائی حاصل کرتے تھے، لیکن ترجیح پہلے ہی قول کو ہے۔

قرآن کریم میں ذکر:

قرآن کریم کی جن چار سورتوں میں حضرت زکریا علیہ السلام کا ذکر ہے انہی سورتوں میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کا تذکرہ بھی ہے، مفسرین لکھتے ہیں کہ وہ بچپن سے ہی نیک دل، خدا ترس اور عبادت گزار تھے، جب بچے ان سے کھیلنے کے لئے کہتے تو آپ ان سے فرماتے کہ مجھے کھیلنے کودنے کے لئے پیدا نہیں کیا گیا ہے، جوان ہوئے تو تنہائی پسند ہو گئے، زیادہ وقت جنگلوں میں عبادت کرتے ہوئے گزارتے، درختوں کے پتے، شہد اور ٹڈی وغیرہ جنگلی غذاؤں پر گزارا کرتے، ایک مرتبہ جب کئی دن تک یحییٰ علیہ السلام اپنے گھر واپس نہیں پہنچے تو ان کے والد انہیں تلاش کرتے ہوئے جنگل میں پہنچ گئے، دیکھا تو وہاں یحییٰ عبادت میں مشغول تھے، والد نے فرمایا: بیٹا ہم تو تیری یاد میں بے چین ہو رہے ہیں اور تو یہاں گریہ وزاری کر رہا ہے، یحییٰ نے جواب دیا: ابا جان آپ ہی نے تو مجھ سے فرمایا تھا کہ جنت اور دوزخ کے درمیان ایک لق ودق صحرا ہے جو اللہ کے خوف سے آنسو بہائے بغیر طے نہیں ہوتا، اور جنت تک رسائی حاصل نہیں ہوتی، یہ سن کر حضرت زکریا علیہ السلام بھی رونے لگے، حدیث شریف میں ہے کہ یحییٰ علیہ السلام خدا کے خوف سے اتنا روتے تھے کہ ان کے رخساروں پر رونے کی وجہ سے نالیاں سی بن گئیں تھیں، قرآن کریم میں ان کے کچھ اوراوصاف یہ بیان فرمائے گئے ہیں، ارشاد فرمایا: يَا يَحْيٰى خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكَاةً وَكَانَ تَقِيًّا وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا.(۱) اے یحییٰ! کتاب (تورات) کو پوری قوت کے ساتھ پکڑے رکھنا، ہم نے اس کو بچپن ہی میں دین کی سمجھ، اور اپنے پاس سے رحم دلی اور پاکیزگی عطا کر دی تھی، وہ بہت پرہیز گار اور اپنے والدین کا انتہائی خدمت گزار تھا، وہ سرکشی کرنے والا اور نافرمانی کرنے والا نہ تھا"۔ ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے، علامہ شبیر احمد عثمانی رقم طراز ہیں: "اللہ تعالیٰ نے ان کو ذوق وشوق، رحمت وشفقت، رقت ونرم دلی، محبت اور

(۱) مریم:۱۲،۱۳۔

محبوبیت عنایت فرمائی تھی اور صاف ستھرا، پاکیزہ رو، پاکیزہ خو، مبارک وسعید، متقی اور پرہیزگار بنایا تھا، حدیث میں ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے نہ کبھی گناہ کیا اور نہ گناہ کا ارادہ کیا، (ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ) قرآن کریم میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کے جو اوصاف بیان کئے گئے ہیں ان میں ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ ''حصور'' تھے، تفسیر ابن کثیر میں اس لفظ کے مختلف معنی مذکور ہیں یعنی وہ شخص جو عورت کے قریب تک نہ گیا ہو، جو ہر قسم کی معصیت سے محفوظ ہو، اور اس کے دل میں معصیت کا خیال بھی نہ آتا ہو، جو شخص اپنے نفس پر پوری طرح قابو رکھتا ہو اور خواہشات نفس کو روکتا ہو۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے چھ ماہ بڑے تھے، دونوں کا زمانہ ایک ہی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے یحییٰ علیہ السلام کو یہ ذمہ داری سپرد کی گئی تھی کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کریں اور ان کے کام کے لئے زمین ہموار کریں، لوگوں کا ذہن بنائیں، چناں چہ وہ اس کام میں بھی مشغول رہتے تھے، اور لوگوں کو ان کی نبوت کی خبر دیا کرتے تھے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی دعوت دین:

حضرت حارث اشعریؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کے متعلق ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو خصوصیت کے ساتھ پانچ باتوں کا حکم فرمایا کہ وہ خود بھی ان پر عمل کریں اور بنی اسرائیل کو بھی اس پر عمل کرنے کی تلقین کریں، یحییٰ کو اس حکم پر عمل کرنے میں کچھ تاخیر ہوگئی، عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے فرمایا اگر تم مناسب سمجھو تو میں بنی اسرائیل کو ان پانچ باتوں کی تلقین کردوں، تم تو اس میں تاخیر کرتے جارہے ہو، یحییٰ علیہ السلام نے کہا کہ اگر میں تمہیں اجازت دے دوں گا اور خود یہ کام نہیں کروں گا تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں مجھ پر عذاب الٰہی نازل نہ ہوجائے اور مجھے زمین میں دھنسا دیا جائے، میں خود ہی تلقین کروں گا، چناں چہ انھوں نے بنی اسرائیل کو بیت المقدس میں جمع کیا، جب مسجد بھر گئی تو ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو پانچ باتوں کا حکم فرمایا ہے کہ میں خود بھی ان پر عمل کروں اور تمہیں بھی ان پر عمل کرنے کی تلقین کروں، وہ پانچ باتیں یہ ہیں (۱) یہ

کہ تم اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو، اور نہ کسی کو اس کا شریک ٹھہراؤ، جب اللہ ہی نے تم کو پیدا کیا اور وہی تم کو رزق دیتا ہے تو تم بھی صرف اسی کی پرستش کرو اور اس کا کسی کو شریک نہ بناؤ، (۲) یہ کہ تم خشوع وخضوع کے ساتھ نماز ادا کرو کیوں کہ جب تم نماز میں کسی دوسری جانب متوجہ نہ ہوگے تو اللہ تعالیٰ برابر تمہاری جانب خوشنودی اور رحمت کے ساتھ متوجہ رہے گا (۳) یہ کہ تم روزہ رکھو (۴) یہ کہ مال میں سے صدقہ نکالا کرو (۵) یہ کہ دن رات میں کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کرتے رہا کرو، اس کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ سے ارشاد فرمایا کہ میں بھی تم کو پانچ باتوں کا حکم کرتا ہوں جن کا اللہ نے مجھ کو حکم دیا ہے، لزوم جماعت، سمع وطاعت، ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ، پس جو شخص جماعت سے ایک بالشت باہر نکل گیا اس نے بلاشبہ اپنی گردن سے اسلام کی رسّی کو نکال دیا۔(۱)

پیغمبر کا قتل:

ہم نے اس سے پہلے بھی لکھا ہے کہ یہود بڑے بدبخت ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح کے لئے سینکڑوں نبی بھیجے، لیکن انھوں نے کسی نبی کو تسلیم نہیں کیا، ہر نبی کے خلاف ہمیشہ سرکشی اور بغاوت پر آمادہ رہے، تاریخ میں ایسے بہت سے نبیوں کا تذکرہ ملتا ہے جو یہود کی اصلاح کے لئے مبعوث ہوئے اور انہی کے ہاتھوں قتل بھی ہوگئے، یا ان کے ہاتھوں سخت اذیت میں مبتلا ہوئے، ان میں ایک نام حضرت یحییٰ علیہ السلام کا بھی ہے، مفسرین لکھتے ہیں کہ جب یحییٰ علیہ السلام نے اپنے دین کی تبلیغ شروع کردی اور لوگوں کو یہ بتلانے کی کوشش کی کہ میں اللہ کا نبی ہوں اور اللہ کا ایک اور نبی عنقریب آنے والا ہے تو بنی اسرائیل ان کے دشمن بن گئے، ایک دن ان کے پاس جمع ہو کر آئے اور کہنے لگے کہ تو مسیح ہے؟ انھوں نے کہا نہیں، کہا تو ایلیا نبی ہے انھوں نے جواب دیا نہیں، انھوں نے کہا پھر تو کون ہے جو اس طرح وعظ ونصیحت کرتا پھرتا ہے، حضرت یحییٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ میں جنگل میں پکارنے والے کی ایک آواز ہوں جو حق کے لئے بلند کی گئی ہے، یہ سن کر یہودی بھڑک اٹھے اور ان کو شہید کر ڈالا، دمشق کی امیہ مسجد میں مزار واقع ہے۔

(۱) مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ وغیرہ۔

حضرت لقمان علیہ السلام

نبی تھے یا بزرگ:

حضرت لقمان علیہ السلام کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے، اہل عرب میں ان کی شخصیت حکیم و دانا کے طور پر مشہور رہی ہے، قرآن کریم نے بھی ان کا تذکرہ کیا ہے بل کہ ایک پوری سورت ان کے نام سے نازل فرمائی ہے، مشہور مؤرخ محمد ابن اسحاق نے اپنی کتاب المغازی میں ان کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے، لقمان بن باعور بن باحور بن تارخ، بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ یہ حضرت ایوب علیہ السلام کے بھانجے تھے، بعض نے ان کو حضرت ایوب علیہ السلام کا خالہ زاد بھائی بھی لکھا ہے، انھوں نے ایک ہزار برس کی عمر پائی، حضرت داؤد علیہ السلام سے علم حاصل کیا، آپ بنی اسرائیل کے سرکردہ عالم اور مفتی بھی رہے ہیں، محققین علماء کا قول یہ ہے کہ حضرت لقمان علیہ السلام بنی اسرائیل کے بہت ہی نیک لوگوں میں سے ایک تھے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں بہ طور خاص حکمت ودانائی سے نوازا تھا، حضرت عکرمہؓ اور امام شعبیؒ کی رائے یہ ہے کہ وہ نبی بھی تھے، تفسیر فتح الرحمٰن میں ہے کہ حضرت لقمان علیہ السلام کی قبر مبارک صرفند میں ہے جو رملہ (فلسطین) کے قریب واقع ہے، حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں کہ ان کی قبر رملہ میں مسجد اور بازار کے درمیان میں ہے اور اس جگہ ستر انبیاء اور بھی مدفون ہیں، حضرت لقمان علیہ السلام کا مزار مبارک اب بھی مرجع عام وخاص بنا ہوا ہے اور لوگ دور دور سے اس کی زیارت کے لئے حاضر ہوتے ہیں، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ لکھتے ہیں کہ ’’اگر چہ ایک روایت میں یہ کہا گیا ہے کہ حضرت لقمان رضی اللہ عنہ نبی تھے لیکن قرآن عزیز کا اسلوب بیان اس کی موافقت نہیں کرتا، اور کسی ایک جملے میں بھی ایسا اشارہ نہیں پایا جاتا کہ جو ان کی نبوت پر دلالت کرتا ہو، اسی لئے جمہور کی رائے یہ ہے کہ لقمان رضی اللہ عنہ اللہ کے ولی اور حکیم ودانا تھے‘‘۔(۱)

(۱) قصص القرآن۔

مشہور مفسر حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ جمہور سلف کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ نبی نہیں تھے، صرف حضرت عکرمہؓ سے ان کا نبی ہونا نقل کیا جاتا ہے مگر اس کی سند ضعیف ہے، امام بغویؒ نے فرمایا ہے کہ وہ فقیہ اور حکیم تھے نبی نہیں تھے۔(۱)

حافظ ابن کثیرؒ کی رائے:

حافظ ابن کثیرؒ نے حضرت لقمان علیہ السلام کے متعلق ایک عجیب واقعہ لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اختیار دیا تھا کہ وہ نبوت لے لیں یا حکمت لے لیں، انھوں نے حکمت لینا پسند کیا، بعض روایات میں ہے کہ ان کو نبوت کا اختیار دیا گیا تو انھوں نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا کہ اگر نبوت قبول کرنے کا حکم ہے تب تو مجھے انکار کی طاقت نہیں اور اگر اختیار ہے تو میں یہ ذمہ داری قبول کرنے سے معذرت کرتا ہوں، کسی نے ان سے دریافت کیا کہ آپ نے نبوت پر حکمت کو ترجیح کیوں دی تو فرمایا کہ نبوت بڑی ذمہ داری کا منصب ہے، اگر یہ ذمہ داری مجھے بغیر اختیار کے سپرد کی جاتی تو حق تعالیٰ خود میری مدد فرماتے کہ میں اس ذمہ داری کو کما حقہ ادا کرسکوں اور اگر میں اسے اپنے اختیار سے طلب کرتا تو ذمہ داری مجھ پر ہی ہوتی۔(۲)

صاحب معارف القرآن نے لکھا ہے کہ حضرت لقمان علیہ السلام کا نبی نہ ہونا جمہور کے نزدیک مسلّم ہے، اب رہی یہ بات کہ قرآن میں ان سے اس طرح خطاب کیا جارہا ہے جس طرح انبیاء علیہم السلام سے خطاب ہوتا ہے تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ یہ خطاب وحی کے ذریعے نہیں کیا گیا بلکہ الہام کے ذریعے ہوا جو اولیاء اللہ کو حاصل ہوتا ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت لقمان علیہ السلام دونوں کا زمانہ ایک ہی ہے، حضرت داؤد علیہ السلام کو نبوت ملنے سے قبل وہ بنی اسرائیل کو شرعی مسائل بھی بتلایا کرتے تھے، جب اللہ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو نبوت عطا کی تو حضرت لقمان علیہ السلام نے یہ کہہ کر فتویٰ دینا چھوڑ دیا کہ اب قوم کو میری ضرورت نہیں رہی، البتہ حکمت ودانائی کی باتیں بتلاتے رہے، اور کیوں کہ انھوں نے لمبی عمر پائی اس لئے ان سے بے شمار اقوال حکمت اور ہزاروں پند ونصائح منقول ہیں، حضرت وہب بن منبہؒ کہتے ہیں کہ میں نے

(۱) تفسیر مظہری۔(۲) تفسیر ابن کثیر۔

حضرت لقمان علیہ السلام سے منقول حکمت کے دس ہزار سے زیادہ ابواب پڑھے ہیں۔

قرآن کریم میں حضرت لقمان کا تذکرہ:

قرآن کریم میں حضرت لقمان علیہ السلام کا ذکر کچھ اس طرح آیا ہے کہ ''اور ہم نے لقمان کو دانش مندی عطا فرمائی'' اس آیت میں لفظ حکمت ذکر کیا گیا ہے، اور یہ لفظ خود قرآن کریم میں متعدد معانی کے لئے آیا ہے، جیسے علم، عقل، حلم، بردباری، نبوت، اصابت رائے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہاں حکمت سے مراد عقل وفہم اور فراست ہے، بعض حضرات فرماتے ہیں کہ علم کے مطابق عمل کرنا حکمت ہے، ابوحیانؒ کی رائے یہ ہے کہ حکمت سے مراد وہ کلام ہے جس سے لوگ نصیحت حاصل کریں، ان کے دلوں میں وہ کلماتِ حکمت مؤثر ہوں اور وہ ان کو محفوظ کر کے دوسروں تک پہنچائیں، جو فہم وفراست دانائی اور دانش مندی حضرت لقمان علیہ السلام کو عطا کی گئی تھی، اس کی وجہ سے وہ اپنی قوم میں بے حد مقبول تھے، ایک مرتبہ وہ کسی بڑے مجمع میں حکمت کی باتیں بتلا رہے تھے کہ ایک شخص آیا اور اس نے پوچھا کہ کیا تم وہ ہی نہیں ہو جو میرے ساتھ فلاں جنگل میں بکریاں چرایا کرتے تھے، انھوں نے فرمایا ہاں میں وہی ہوں، اس شخص نے سوال کیا کہ پھر تمہیں یہ مقام کیسے حاصل ہوا کہ لوگ تمہارا اس قدر کا احترام کرتے ہیں اور تمہاری باتیں سننے کے لئے دور دور سے آتے ہیں، حضرت لقمان علیہ السلام نے جواب دیا کہ میرے دو کام ایسے ہیں جس نے مجھے اس مقام تک پہنچایا ہے ایک ہمیشہ سچ بولنا، دوسرے فضول باتوں سے اجتناب کرنا''۔(۱)

یہ منصب حکمت اللہ کے نزدیک کتنا بڑا تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت لقمان علیہ السلام کو حکم دیا کہ اس نعمت پر تم میرا شکر ادا کرتے رہا کرو، مفسرین نے لکھا ہے کہ شکر کرتے رہنے کا حکم اس لئے نہیں دیا گیا کہ اس میں کچھ منعم حقیقی کا فائدہ تھا، اسے کسی کے شکر کی چنداں ضرورت نہیں ہے، بل کہ یہ حکم اس لئے دیا گیا کہ اس کا فائدہ شکر کرنے والے کو پہنچتا ہے، کیوں کہ قرآن کریم میں ہے کہ جو شخص ہماری نعمت کا شکر ادا کرتا ہے ہم اس کی نعمت میں اور زیادتی کر دیتے ہیں۔

(۱) تفسیر ابن کثیر۔

قرآن کریم نے حضرت لقمان علیہ السلام کے کچھ اقوال حکمت نقل بھی کئے ہیں، ان اقوالِ حکمت کا اوّلین مخاطب خود ان کا اپنا بیٹا ہے، چناں چہ ارشاد ربانی ہے کہ: وَإِذْ قَالَ لُقْمَانُ لِابْنِهِ وَهُوَ يَعِظُهُ.(۱) ''اور جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے یہ کہا'' اس کے بعد قرآن کریم نے کچھ نصیحتیں جو حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو کی تھیں نقل کی ہیں جن میں سے پہلی نصیحت کا تعلق عقائد کی درستگی سے ہے، اور عقائد میں بھی سب سے پہلے شرک سے اجتناب اور اللہ کی وحدانیت کا اعتراف ہے، ان نصیحتوں کا اگر خلاصہ کیا جائے تو یہ چند باتیں سامنے آتی ہیں جو ہر شخص کے لئے نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔

پندِ لقمانی:

ایک تو یہ کہ اللہ سارے عالم کا خالق اور مالک ہے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا چاہئے، اس دنیا میں اس سے بڑھ کر ظلم کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا کہ انسان غیر اللہ کو شریک عبادت کرے، دوسری بات یہ ہے کہ ہر انسان کو یہ عقیدہ رکھنا چاہئے کہ آسمان وزمین کے اندر جو کچھ ہے اس کے ایک ایک ذرّہ کو اللہ تعالیٰ کا علم محیط اور وسیع ہے اور وہ ہر ہر ذرے پر قدرت بھی رکھتا ہے خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو کہ عام نظروں میں نہ آسکتا ہو، اور کتنی ہی دور کیوں نہ ہو کہ انسانوں کی رسائی اس تک نہ ہوسکتی ہو، اور کتنے ہی اندھیروں اور پردوں میں کیوں نہ ہو، اللہ تعالیٰ سے وہ چیز چھپ نہیں سکتی، عقیدے کے بعد اعمال کا ذکر ہے، اور اعمال میں سب سے پہلے نماز کا تذکرہ ہے کہ نماز قائم کرو، اور اس کی وجہ بھی بیان فرمادی کہ نماز برائیوں سے روکنے والا عمل ہے، قرآن میں نماز کا ذکر جہاں بھی آیا ہے اقیموا الصلوٰۃ کے ساتھ آیا ہے یعنی نماز قائم کرو، اقامت صلوٰۃ کا مفہوم یہ ہے کہ صرف نماز پڑھنا کافی نہیں ہے بل کہ اس کو تمام ارکان وآداب کے ساتھ پڑھنا، اوقات میں ادا کرنا اور اس پر مداومت کرنا یہ اقامت صلوٰۃ ہے، حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو چوتھی وصیت یہ کی کہ اقامت صلوٰۃ کے ساتھ ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بھی انجام دیتے رہو، کیوں کہ صرف فرد کی اصلاح کافی نہیں ہے بل کہ جماعت کی اصلاح بھی ضروری ہے اور جماعت کی اصلاح اسی وقت ممکن ہے جب لوگوں کو اچھی باتوں کا حکم دیا

(۱) لقمان:۱۳۔

جائے جو امر بالمعروف ہے اور ان کو بری باتوں سے روکا جائے جو نہی عن المنکر ہے، اور کیوں کہ اس فریضے کی ادائیگی میں ناگوار حالات و واقعات بھی پیش آسکتے ہیں اس لئے حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو صبر کا دامن پکڑے رکھنے کی تلقین بھی فرمائی اور اسے یہ بھی بتلا دیا کہ اصل عزیمت صبر کرنا ہے، اس کے بعد کچھ ایسی نصیحتیں ہیں جن کا تعلق معاشرتی زندگی سے ہے، مثلاً یہ کہ لوگوں سے ہم کلام ہونے پر اپنی گردن کو نخوت اور تکبر سے مت موڑو، زمین پر اکڑ کر اور اترا کر مت چلو، اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو، اپنی آواز کو پست رکھو، حضرت مفتی محمد شفیع عثمانیؒ نے لکھا ہے کہ ”یہاں آداب معاشرت میں چار چیزیں ذکر کی گئی ہیں اول لوگوں سے گفتگو اور ملاقات میں متکبرانہ انداز سے رُخ پھیر کر بات کرنے کی ممانعت، دوسرے زمین پر اترا کر چلنے کی ممانعت، تیسرے درمیانی چال چلنے کی ہدایت، چوتھے بہت زور سے شور مچا کر بولنے کی ممانعت“۔(۱)

اصحاب السبت

سنیچر کے دن والے:

قرآن کریم کی متعدد سورتوں میں اصحاب السبت (سنیچر والوں) کا قصہ بیان کیا گیا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے ہفتے کے سات دنوں میں سے ایک دن اللہ عزوجل کی عبادت کے لئے مخصوص کر دیا تھا اور وہ دن جمعہ کا تھا، لوگ ہفتے کے چھ دن کام کرتے اور جمعہ کے دن اللہ کی عبادت کرتے، اس دن کوئی دوسرا کام کرنا ان کے لئے حرام کر دیا گیا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ آیا تو ان کی قوم کے لوگوں نے اپنے پیغمبر سے عرض کیا کہ اگر جمعہ کے بجائے سنیچر کا دن عبادت کے لئے مخصوص کر دیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو سمجھایا کہ جمعہ ایک مبارک دن ہے، اللہ تعالیٰ نے کسی مصلحت کی بنا پر ہی تمہارے لئے یہ دن عبادت کے دن کے طور پر مخصوص کیا ہے، اور ہم سب کے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے جمعہ کا دن

(۱) معارف القرآن۔

عبادت کے لئے متعین ہے، تم اس کو بدلوانے کی کوشش نہ کرو، اور اس معاملے کو اسی طرح رہنے دو، لیکن کیوں کہ یہود کی سرشت میں ضد ہے، اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ نصیحت کارگر نہ ہوئی، اور وہ اپنی ضد پر ڈٹے رہے کہ ہم تو سنیچر کے دن ہی عبادت کرنا چاہتے ہیں اور اسی دن عبادت کیا کریں گے، مجبور ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے باری تعالیٰ سے دُعا کی، دعا قبول ہوئی، اللہ تعالیٰ نے جمعہ کی برکات واپس لے لیں اور ان کے لئے سنیچر کا دن عبادت کے لئے خاص کر دیا گیا، ساتھ ہی یہ حکم بھی دے دیا گیا کہ وہ سنیچر کے دن کی عظمت و تقدس کا خیال رکھیں، اس دن کو اللہ کی عبادت میں گزاریں، آج کے دن حصول معاش کے لئے کی جانے والی ہر جدو جہد حرام ہے، خواہ وہ خرید و فروخت ہو، زراعت ہو، شکار وغیرہ ہو، وہ لوگ مچھلیوں کا شکار کر کے اپنا پیٹ پالتے تھے، مچھلیوں کا شکار کرنا ان کا محبوب مشغلہ بھی تھا، وہ لوگ مچھلیوں کی تجارت بھی کرتے تھے، اور مچھلی ہی ان کی غذا بھی تھی، اس حکم کے بعد وہ ہفتے کے چھ دن اپنے اس محبوب مشغلے میں گزارتے، اور سنیچر کے دن عبادت الٰہی میں منہمک رہتے، یہ سلسلہ عرصۂ دراز تک چلتا رہا، یہاں تک کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ قریب آ گیا، بنی اسرائیل کے کچھ لوگ بحر قلزم کے کنارے آباد ہو گئے، اس دریا میں مچھلیوں کی فراوانی تھی، اس لئے انہیں اپنا شکار آسانی سے ہاتھ آ جاتا تھا، کچھ دنوں کے بعد ہفتے کے چھ دن مچھلیاں سطح آب سے غائب ہونے لگیں، وہ پانی کی تہہ میں جا بیٹھتیں، شکاری سارا سارا دن جال ڈالے بیٹھے رہتے، مشکل ہی سے کوئی بھولی بھٹکی مچھلی ان کے جال میں پھنستی، شام کو اکثر لوگ ناکام واپس جاتے، سنیچر کے دن مچھلیاں تہہ آب سے نکل کر سطحِ آب پر تیرتی نظر آتیں، اور اتنی کثرت سے نظر آتیں کہ شکاریوں کے منہ میں پانی بھر آتا، مگر کیا کرتے، سنیچر کے دن شکار کرنا حرام تھا، ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کریں، یقینی طور پر اللہ تعالیٰ نے ان کو آزمانے کے لئے مچھلیوں کو حکم دیا ہوگا کہ وہ ہفتے کے چھ دن پوشیدہ رہیں اور سنیچر کے دن سطح آب پر دندناتی پھریں، کچھ دنوں تک یہود اس صورت حال کو دیکھتے رہے اور کڑھتے رہے، بالآخر ان کو ایک تدبیر سوجھ ہی گئی، وہ لوگ جمعہ کے دن شام کو پانی میں جال ڈال کر چھوڑ دیا کرتے تھے تاکہ سنیچر کی صبح کو مچھلیاں اوپر آئیں تو جال میں پھنس جائیں، بعض لوگ یہ حیلہ کرتے کہ دریا کے کنارے

گڑھے کھود لیتے اور ایک نالی کے ذریعے ان گڑھوں کو دریا سے مربوط کردیتے، جب مچھلیاں دریا کی سطح پر تیرتیں تو پانی کے بہاؤ کے ساتھ گڑھوں میں آگرتیں جب گڑھے مچھلیوں سے بھر جاتے تو وہ لوگ پانی کے آنے کا راستہ بند کردیتے، مچھلیاں سنیچر کے پورا دن گڑھوں میں پڑی رہتیں اتوار کی صبح کو وہ لوگ خوشی خوشی گڑھوں میں اترتے اور مچھلیاں پکڑ لیتے، اپنی ان تدبیروں اور حیلوں پر وہ خوشی سے جھومتے، ان میں سے جو لوگ اللہ سے ڈرنے والے تھے انہیں یہ طریقہ پسند نہیں تھا، وہ چاہتے تھے کہ لوگ اپنی ان حرکتوں سے باز آجائیں اور اللہ نے جو دن ان کے لئے مقرر کئے ہیں اسی میں شکار کریں، ان میں بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو دل میں تو شرمندگی محسوس کرتے، مگر زبان سے وہ یہ کہتے کہ ہمارا یہ حیلہ اللہ تعالیٰ کو ضرور پسند آئے گا اور وہ ہم سے باز پرس نہیں کرے گا۔

قوم کے نیک لوگ:

اس قوم میں جو نیک لوگ تھے وہ دل سے چاہتے تھے کہ قوم یہ حیلے نہ کرے، اس کے لئے وہ نصیحت بھی کرتے اور اللہ کے عذاب سے بھی ڈراتے، مگر یہود کچھ زیادہ ہی شقی القلب تھے، کج روی ان کے مزاج کا حصہ بن چکی تھی ان پر کوئی نصیحت اثر نہ کرتی اور نہ اللہ کا خوف انہیں ان حیلوں سے باز رکھتا، مجبور ہو کر اللہ کے نیک بندوں نے ان لوگوں سے اپنا تعلق منقطع کرلیا، ان کے ساتھ کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، خریدنا بیچنا، سب کچھ ختم کردیا، انھوں نے اپنی بستی بھی الگ بسالی، کیوں کہ انھیں پتہ تھا کہ یہ بغاوت اور سرکشی ہے اور اس کی سزا ہر حال میں ملنی ہے، پچھلی قوموں کا انجام ان کی آنکھوں کے سامنے تھا، جس نے بھی اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی اس پر آسمان سے عذاب ضرور نازل ہوا۔

سرکشی اور تمرد کا انجام:

ان لوگوں کا انجام بھی یہی ہوا، ان کی صورتیں مسخ کردی گئیں اور ان کو بندر اور خنزیر بنادیا گیا، جس وقت ان پر یہ عذاب نازل ہوا رات کا وقت تھا، صبح نیک لوگوں کی بستی میں حسب معمول چہل پہل تھی، جب کہ باغیوں اور سرکشوں کی آبادی میں سناٹا چھایا ہوا تھا، جب ان نیک لوگوں نے اُدھر جاکر دیکھا تو انسانوں کے بجائے بندر اور خنزیر ٹہلتے اور

پھرتے نظر آئے، انھیں دیکھ کر وہ ان کے قدموں میں لوٹنے لگے، اور رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگے مگر انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے، ہم نے پہلے ہی تمھیں منع کیا تھا عذاب الٰہی سے بھی ڈرایا تھا مگر تمہارے دل پتھر کے ہو چکے تھے، قرآن کریم نے متعدد آیات میں اس عذاب کا ذکر کیا ہے، ایک آیت میں ہے: وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ. فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ.(١) ’’اے یہود! بلاشبہ تم ان لوگوں کو اچھی طرح جانتے ہو جو سبت کے بارے میں احکام الٰہی سے متجاوز ہو گئے تھے اور ہم نے ان کے لئے کہہ دیا کہ تم ذلیل بندر ہو جاؤ، ہم نے اس بستی کے ان بد بخت لوگوں کو گرد و پیش کے لوگوں کے لئے عبرت اور خدا سے ڈرنے والوں کے لئے نصیحت و موعظت بنا دیا‘‘۔

مسخ صورت:

یہ بستی جہاں مسخ کا واقعہ پیش آیا کہاں ہے؟ اور وہ زمانہ جس میں یہ عذاب نازل ہوا کونسا ہے؟ اس سلسلے میں مؤرخین و مفسرین نے مختلف اقوال نقل کئے ہیں، قرآن کریم نے تو سورۂ اعراف میں صرف اتنا کہا ہے کہ یہ بستی دریا کے کنارے آباد تھی، مگر مفسرین نے اس بستی کی تعیین میں متعدد نام لئے ہیں، زیادہ تر مفسرین لکھتے ہیں کہ اس بستی کا نام ایلہ تھا اور یہ بحر قلزم کے ساحل پر آباد تھی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے قصص القرآن میں لکھا ہے کہ جب کوئی شخص طور سینا سے گزر کر مصر کو روانہ ہو تو طور سینا کی جانب ساحل بحر پر یہ بستی ملتی تھی، زمانۂ عذاب کے بارے میں عام مفسرین کا خیال ہے کہ یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانۂ نبوت کے قریب یا ان کے دور نبوت میں تقریباً ١١٠٠ سال قبل مسیح پیش آیا، اس وقت ایلہ بستی میں کوئی نبی موجود نہیں تھے، صرف نیک لوگوں کی ایک جماعت تھی جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے رہی تھی، صحیح احادیث میں ہے کہ جن قوموں کو مسخ صورت کے عذاب میں گرفتار کیا جاتا ہے وہ تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہتیں، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا ارشاد ہے کہ اس قوم کے نوجوان بندر بنا دئے گئے تھے اور بوڑھوں کو خنزیر بنا دیا گیا تھا۔

(١) سورۂ بقرہ: ٦٥-٦٦۔

سکندر ذو القرنینؒ

چار بڑے بادشاہوں میں سے ایک:

قرآن کریم کی سورۂ کہف میں ایک ایسے بادشاہ کا ذکر کیا گیا ہے جس نے مشرق سے مغرب تک فتوحات کیں، اس دوران وہ ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں کے رہنے والوں نے بادشاہ سے یہ شکایت کی کہ سامنے جو دو پہاڑ ہیں ان کے درمیانی خلاء سے یاجوج ماجوج نامی مخلوق نکلتی ہے، ہم پر حملے کرتی ہے، ہماری کھیتیوں کو نقصان پہنچاتی ہے، اور ہمیں تباہ وبرباد کر کے پھر واپس پہاڑوں کے پیچھے چلی جاتی ہے، اس بادشاہ کا نام سکندر اور لقب ذو القرنین تھا، قرآن کریم نے اس کا لقب ذکر کیا ہے، سکندر کا تذکرہ توریت اور انجیل میں بھی ملتا ہے، ذو القرنین کے نام سے دنیا میں متعدد آدمی گزرے ہیں اور انھوں نے شہرت بھی حاصل کی ہے، اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ان میں سے ہر شخص کا نام سکندر اور لقب ذو القرنین تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تین سو سال قبل ایک بادشاہ سکندر کے نام سے گزرا ہے، اس کو سکندر یونانی، مقدونی، رومی وغیرہ کی نسبت سے بھی یاد کیا جاتا ہے، اس کا وزیر ارسطو تھا، اس کی جنگ دارا سے ہوئی، جس کے نتیجے میں دارا قتل ہوا اور اس کا ملک سکندر کے زیر نگیں آیا، یہ شخص مصر کے مشہور شہر اسکندریہ کا بانی تھا، روم کی تاریخ کا آغاز بھی اسی سے ہوتا ہے، بعض مفسرین کو وہم ہوا ہے اور انھوں نے اسی سکندر کو قرآن کریم کا ذو القرنین قرار دیا ہے، حالاں کہ یہ غلط ہے، کیوں کہ یہ شخص آتش پرست تھا، قرآن کریم میں جس ذو القرنین کا ذکر ہے وہ ایک نیک صالح انسان تھے، بعض لوگوں نے تو ان کو نبی بھی کہا ہے، جب کہ ان کے مرد صالح ہونے پر تو سب کا اتفاق ہے، مشہور مؤرخ حافظ ابن کثیر نے اپنی کتاب البدایہ والنہایہ میں حافظ ابن عساکر کے حوالے سے سکندر آتش پرست کا پورا شجرۂ نسب بھی لکھا ہے جو اوپر جا کر حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے مل جاتا ہے، قرآن کریم میں جس سکندر ذو القرنین کا تذکرہ ہے وہ اس سکندر سے دو ہزار سال قبل پیدا

ہوئے، یہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا زمانہ ہے البدایہ والنہایہ میں ہے کہ ذوالقرنین پیدل حج کے لئے تشریف لے گئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ مکرمہ سے باہر نکل کر ان کا استقبال کیا، ان کے لئے دُعا بھی کی اور ان کو پند ونصائح سے بھی نوازا، تفسیر ابن کثیر میں یہ بھی لکھا ہے کہ انھوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ طواف بھی کیا اور طواف کے بعد قربانی بھی کی، البیرونی نے اپنی کتاب ''الآثار الباقیۃ عن القرون الخالیہ'' میں لکھا ہے کہ سکندر ذوالقرنین کا پورا نام ابوبکر بن سمّی بن عمر بن افریقس حمیری ہے جس نے مشارق ومغارب کو فتح کیا، تبّع حمیری یمنی نے اپنے اشعار میں اس بات پر فخر کیا ہے کہ اس کا دادا سکندر ذوالقرنین تھا جس نے ساری دنیا کو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے روند ڈالا، بعض مؤرخین کہتے ہیں ذوالقرنین یمن کا سب سے پہلا تُبّع ہے (معارف القرآن ملخصاً) حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے اپنی کتاب قصص القرآن میں لکھا ہے کہ ذوالقرنین فارس کا وہ بادشاہ ہے جس کو یہودی فورس، یونانی سائرس، فارسی گورش اور عرب کیخسرو کہتے ہیں، ان کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بہت بعد انبیاء بنی اسرائیل میں سے حضرت دانیال علیہ السلام کا زمانہ بتلایا جاتا ہے، بہ ہر حال سکندر ذوالقرنین کسی بھی زمانے سے تعلق رکھتے ہوں اس پر تمام مؤرخین اور مفسرین کا اتفاق ہے کہ وہ ایک نیک بادشاہ تھے، بعض لوگوں نے تو ان کو نبی بھی کہا ہے، ابن کثیر کے نزدیک ان کا نبی ہونا راجح ہے، لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے کہ وہ نہ نبی تھے اور نہ فرشتے تھے، بل کہ ایک نیک صالح مسلمان تھے، بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام ان کے وزیر تھے۔

ذوالقرنین کون تھے:

ساری دنیا کو چار لوگوں نے فتح کیا ہے، اور ان چاروں کی حکومت کا دائرہ مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوا تھا، ان میں سے دو مشرک تھے اور دو مسلمان، مشرک فاتحینِ عالَم نمرود اور بخت نصر ہیں، اور مؤمن حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت ذوالقرنین ہیں، قرآن کریم میں ذوالقرنین کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ دراصل ایک سوال

کے جواب کی صورت میں ہے، مشرکین مکہ نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی نبوت اور حقانیت کا امتحان لینے کے لئے تین سوالات کئے تھے، ایک سوال روح کے متعلق تھا کہ یہ کیا ہوتی ہے، اس کی حقیقت اور ماہیت کیا ہے، دوسرا سوال اصحاب کہف کے متعلق تھا کہ وہ نوجوان کون تھے جو اپنے زمانے کے ظالم بادشاہ کے خوف سے کسی پہاڑ کی کوہ میں جا چھپے تھے، اور تیسرا سوال ذوالقرنین کے بارے میں تھا کہ وہ کون تھا اور اس کو کیا حالات پیش آئے۔

قریش کے سوالات:

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ قریش مکہ نے اپنے مشورے میں یہ طے کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) برابر یہ دعوی کر رہے ہیں کہ میں اللہ کا نبی اور اس کا رسول ہوں، ہمارے پاس ان کے دعوے کی صداقت اور ان کی نبوت کی حقانیت کو آزمانے کا کوئی طریقہ بجز اس کے نہیں ہے کہ ہم علماء یہود سے اس سلسلے میں رابطہ کریں اور ان سے پوچھیں کہ اس دعوئ نبوت کے بارے میں ان کی کتاب میں کیا ہدایات موجود ہیں، اس مشورے کے بعد قریش مکہ نے نضر ابن حارث اور عقبہ بن معیط کو اپنا نمائندہ بنا کر یہود کے پاس بھیجا، اور ان کے ذریعے یہ کہلوایا کہ تم خود کو اہل کتاب کہتے ہو اور تم یہ دعویٰ بھی کرتے ہو کہ تمہارے پاس انبیاء سابقین کے متعلق وہ معلومات ہیں جو ہمارے پاس نہیں ہیں، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ہمیں بتلاؤ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں تمہاری معلومات کیا ہیں، تمہاری کتابوں میں ان کا کوئی تذکرہ موجود ہے یا کچھ ایسی علامات بیان کی گئی ہیں جن کو سامنے رکھ کر ہم ان کے دعوے کی تصدیق یا تکذیب کر سکیں، یہ پیغام لے کر قریش کا وفد یثرب پہنچا، اور وہاں کے علماء یہود سے ملا، انھوں نے جواب دیا کہ اگر تم اس نئے نبی کا امتحان لینا چاہتے ہو تو علامات وغیرہ کے چکّر میں مت پڑو، ہم تمہیں تین سوالات بتلاتے ہیں، اگر انھوں نے ان سوالات کا صحیح جواب دے دیا تو سمجھ لینا کہ وہ سچے نبی ہیں، تم پر ان کی اطاعت واجب ہے، اور اگر انھوں نے صحیح جواب نہیں دیا تو ان کے جھوٹا ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، اس صورت میں تم ان کے ساتھ جو چاہے سلوک کرنا،

وہ تین سوالات یہ ہیں۔

۱- اس شخص کا حال بیان کیجئے جو مشرق سے مغرب تک کے تمام علاقے فتح کرتا چلا گیا۔

۲- ان چند نوجوانوں پر کیا گزری جو کافر بادشاہ کے خوف سے غار میں جا چھپے تھے۔

۳- روح کے متعلق بیان کیجئے۔

یہ تین سوالات لے کر قریش کا وفد مکہ واپس آیا اور اعیان مکہ کو علماء یہود کے ساتھ اپنی بات چیت سے آگاہ کیا، قریش نے کہا کہ اب ہمارے لئے محمد کے دعوے کی صداقت کے بارے میں فیصلہ کرنا آسان ہو گیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ان سوالات کا جواب عام انسان نہیں دے سکتا، صرف وہی شخص دے سکتا ہے جس پر وحی نازل ہوتی ہو، قریش نے تینوں سوالات سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کئے، انہی سوالات کے جوابات کے لئے سورۂ کہف کا نزول ہوا۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ یہود کسی اور شخصیت کے متعلق بھی سوال کر سکتے تھے، مگر انھوں نے ذوالقرنین کا انتخاب کیا اور انہی کے متعلق سوال کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ذوالقرنین کی شخصیت یہودیوں کے نزدیک انتہائی محترم اور مقدس سمجھی جاتی ہے، ان ہی کی بہ دولت یہودیوں نے بابل کی غلامی سے نجات پائی، یروشلم جو ان کا مرکز، ان کا قبلہ اور ان کا مقدس مقام ہے بابل کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گیا تھا، ذوالقرنین نے اس کو دوبارہ آباد کیا اور یہودوں کے جو آثار مقدسہ یروشلم سے منتقل ہو کر نینوا پہنچ گئے تھے، ذوالقرنین انھیں وہاں سے واپس لائے، اس لئے یہود ذوالقرنین کو اپنا محسن اور نجات دہندہ سمجھتے ہیں اور ان کا نام نہایت ادب واحترام کے ساتھ لیتے ہیں۔

ذوالقرنین کی امتیازی شخصیت:

ذوالقرنین کی شخصیت تمام مذاہب کے ماننے والوں کے لئے قابل احترام شخصیت رہی ہے، قرآن کریم سے پہلے نازل ہونے والی آسمانی کتابوں میں بھی ان کا ذکر

موجود ہے، انبیاء بنی اسرائیل میں حضرات یسعیاہ، یرمیاہ، دانیال اور زکریا علیہم السلام کی پیشین گوئیوں میں بھی ان کا تذکرہ ملتا ہے، ان پیشین گوئیوں میں ذوالقرنین کو اللہ کا مسیح، بنی اسرائیل کا نجات دہندہ اور اللہ کا چرواہا کہا گیا ہے، قرآن کریم کی سورۂ بنی اسرائیل میں بنی اسرائیل کے شر وفساد کے واقعات اور ان واقعات کے نتیجے میں ملنے والی سزاؤں کا ذکر ان الفاظ میں ہے کہ ''ہم تمہارے فساد کی سزا میں تم پر اپنے کچھ ایسے بندے مسلط کردیں گے جو بڑی قوت والے ہوں گے وہ تمہارے گھروں میں گھس پڑیں گے'' تمام مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آیت کریمہ میں جس شان وشوکت اور طاقت وقوت والے لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے ان سے مراد بخت نصر اور اس کے اعوان وانصار ہیں، اس بادشاہ نے بیت المقدس میں گھس کر تباہی مچائی، مال ودولت لوٹا، ستر ہزار یہودیوں کو قتل کیا اور ایک لاکھ سے زائد لوگوں کو غلام باندی بنا کر بابل لے گیا جو اس کی راجدھانی تھی، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کو ان کی حالت زار پر رحم آیا، اور ان کی کھوئی ہوئی طاقت وشوکت پھر ان کو لوٹا دی، قرآن کریم کی اسی سورت میں ہے، ''پھر ہم نے ان کا غلبہ ان کو لوٹا دیا'' یہاں بھی تمام مؤرخین ومفسرین اس امر پر متفق ہیں کہ جو بادشاہ بنی اسرائیل کا نجات دہندہ ثابت ہوا، اسی کو خورس اور کیخسرو کہتے ہیں، اور اسی کا نام ذوالقرنین ہے، اس نے بخت نصر کا مقابلہ کیا، اس کے قبضے سے یہودیوں کو نکال کر دوبارہ فلسطین میں آباد کیا، بخت نصر نے بیت المقدس کو برباد کردیا تھا، اور اس کے تمام خزانے لوٹ لئے تھے، ذوالقرنین نے وہ تمام خزانے اور مقدس چیزیں بخت نصر سے واپس لیں اور ان کو بیت المقدس تک پہنچایا، یہی وجہ ہے کہ یہودی اپنے نسلی تعصب کے باوجود غیر قوم اور غیر مذہب کے اس بادشاہ کو اس قدر احترام اور عقیدت سے یاد کرتے ہیں کہ شاید ہی وہ اپنے انبیاء کو اتنے احترام اور عقیدت سے یاد کرتے ہوں۔

ذوالقرنین کی وجہ تسمیہ:

اب رہا یہ سوال کہ ذوالقرنین کا نام ذوالقرنین کیوں ہوا، اس کے معنی ہیں دو سینگوں والا، کیا واقعی ان کے سر پر دو سینگ تھے، اس سلسلے میں مفسرین نے متعدد اقوال

نقل کئے ہیں، کسی نے کہا کہ ان کی دو زلفیں تھیں کسی نے کہا کہ انھوں نے مغرب و مشرق کے ملکوں پر حکومت کی اس لئے ان کا نام ذوالقرنین پڑ گیا، کسی نے کہا کہ انھوں نے اس زمانے کی دو بڑی طاقتوں اور دو بڑی حکومتوں بابل اور نینوا کا خاتمہ کر کے دونوں کو ایک کیا اس لئے ان کو ذوالقرنین کا لقب دیا گیا، یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کے سر پر کچھ ایسے نشانات تھے جو سینگ کے ہوتے ہیں، کسی نے کہا کہ ان کے سر کے دونوں جانب چوٹ کے نشانات تھے، یہ نام قرآن کریم کا دیا ہوا نہیں ہے بل کہ بنی اسرائیل کے آسمانی صحیفوں میں ایسی شخصیت کا ذکر ہے جس کو دو سینگوں والا کہا گیا ہے۔

قرآن کریم میں ذوالقرنین کا واقعہ اس تفصیل کے ساتھ نہیں ہے جس تفصیل کے ساتھ دوسرے آسمانی صحائف میں ہے، قریش مکہ کے سوال کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنا فرمایا کہ میں ان کے واقعات میں سے کچھ باتیں تمہارے سامنے بیان کرتا ہوں، قرآن کریم نے ذوالقرنین کے جو واقعات بیان کئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ بہت شان و شوکت والے بادشاہ تھے، ساتھ ہی وہ نیک دل اور انصاف پرور بھی تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر طرح کے سامان حکومت سے نوازا تھا، انھوں نے سب سے پہلے مغرب کی طرف سفر کیا، اور چلتے چلتے ایسی جگہ جا پہنچے جس کے آگے کوئی آبادی نہیں تھی، بل کہ گدلے پانی کا ایک چشمہ تھا، اور شام کے وقت وہاں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے آفتاب اس چشمے کے اندر ڈوب رہا ہو، مؤرخین نے لکھا ہے کہ یہ مقام ایران سے جانب مغرب میں واقع ہے، سمرنا کے قریب بحر ایجین کا ساحل ہی ایسا علاقہ ہے جو اپنے اندر بہت سے چھوٹے چھوٹے جزیرے رکھنے کی وجہ سے جھیل بن گیا ہے، اس کا پانی بہت گدلا رہتا ہے، قرآن کریم نے اس جھیل کو عین حمئۃ سے تعبیر کیا ہے، شام کے وقت جب سورج غروب ہوتا ہے تو ایسا لگتا ہے گویا سورج سیاہ دلدل میں اتر گیا ہو۔

ذوالقرنین کا عدل وانصاف:

بہ ہر حال جب سکندر ذوالقرنین اس جگہ پہنچے جہاں آبادی ختم ہو رہی تھی اور جہاں حد نظر تک پانی ہی پانی تھا تو وہاں انھوں نے ایک قوم کو دیکھا جو اپنی عادات اور طور

طریقوں کے اعتبار سے مشرک معلوم ہورہی تھی، اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کو اختیار دیا کہ آپ چاہیں تو اس قوم کو اس کی سرکشی (کفروشرک) کی وجہ سے سزا دیں اور چاہے تو ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرتے ہوئے ان کو وعظ ونصیحت کریں، ذوالقرنین نے دوسری صورت اختیار کی اور کہا کہ ہم پہلے ان کو سمجھائیں گے، اس کے بعد بھی اگر کچھ لوگ کفر وشرک پر قائم رہے تو ان کو سزا دیں گے اور جو لوگ نیک بن جائیں گے ان کو اچھا بدلہ بھی دیں گے، قرآن کریم نے ان کا یہ ارشاد ان الفاظ میں نقل کیا ہے: ''ہم ناانصافی کرنے والے نہیں ہیں، جو سرکشی کرے گا اسے ضرور سزا دیں گے، پھر اسے اپنے پروردگار کی طرف لوٹنا ہے، وہ بداعمالوں کو سخت عذاب میں مبتلا کرے گا اور جو ایمان لائے گا اور اچھے کام کرے گا تو اس کے بدلے میں اس کو بھلائی ملے گی اور ہم اس کو ایسی ہی باتوں کا حکم دیں گے جس میں اس کے لئے آسانی اور راحت ہو''۔

مغرب سے مشرق کی طرف:

مغرب سے نکل کر ذوالقرنین نے مشرق کا قصد کیا، قرآن کریم کے الفاظ میں ''اس کے بعد اس نے پھر تیاری کی اور مشرق کی طرف نکلا یہاں تک کہ سورج نکلنے کی آخری حد تک پہنچ گیا، اس نے دیکھا کہ سورج ایک ایسی قوم پر طلوع ہو رہا ہے جس سے ہم نے کوئی آڑ نہیں رکھی''، یعنی وہ قوم کھلے میدان یا لق ودق صحرا میں پڑی ہوئی تھی، دھوپ سے بچنے کے لئے نہ ان کے پاس کوئی مکان تھا، نہ انھوں نے خیمے گاڑ رکھے تھے، پردے لباس وغیرہ کچھ بھی ان کے پاس نہ تھا جس کے ذریعے وہ خود کو سورج کی دھوپ سے محفوظ رکھتے، مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ لوگ بھی کافر تھے اور ذوالقرنین نے ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو مغرب کی سمت ساحل سمندر پر رہنے والوں کے ساتھ کیا تھا، یعنی ان کو وعظ ونصیحت کی، جو تائب ہوئے ان کو مال ودولت سے نوازا اور جو کفر وشرک پر قائم رہے ان کو سزا دی، مؤرخین نے اس جگہ کا تعین مکران کے علاقے سے کیا ہے، جہاں کچھ قبائل آباد تھے، یہ علاقہ ایران کے مشرق بعید میں واقع ہے اس کے بعد کوہستانی سلسلہ ہے جس نے آگے جانے کا راستہ مسدود کر رکھا ہے، ان وحشی اور صحرا نشین قبائل نے سرکشی اختیار کی تھی

جس کی سرکوبی کے لئے ذوالقرنین نے اتنا لمبا سفر کیا، اور ان کی بغاوت کا قلعہ قمع کر کے اپنے دارالحکومت واپس ہوا۔

سد سکندری کی تعمیر:

مشرق ومغرب کی ان فتوحات کے بعد بادشاہ ذوالقرنین شمال کی جانب متوجہ ہوئے، قرآن کریم نے اگرچہ اس مہم کی سمت اور محل وقوع کا ذکر نہیں کیا مگر دو پہاڑوں کے درمیان آہنی دیوار کی تعمیر کا ذکر ضرور کیا ہے، اس دیوار کی کھوج کرتے کرتے مؤرخین اور محققین نے وہ جگہ تلاش کر لی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مہم ایران سے شمال کی جانب پیش آئی، اس مہم میں ذوالقرنین بحر کاسپین کو دائیں جانب چھوڑتے ہوئے کاکیشیا کے پہاڑی سلسلے تک پہنچ گئے، یہاں انھیں دو پہاڑ ملے جن کے درمیان ایک بڑا خلاء تھا، پہاڑوں سے اِدھر رہنے والے اگرچہ ذوالقرنین کی زبان نہیں جانتے تھے اور نہ ذوالقرنین ان کی زبان سے واقف تھے مگر انھوں نے اشاروں ہی اشاروں میں اپنا منشأ ذوالقرنین پر واضح کر دیا کہ ان پہاڑوں کے دوسری طرف جو قوم آباد ہے وہ نہایت ظالم وجابر اور وحشی قوم ہے، یہ لوگ اس خلاء سے باہر نکل کر ہم پر حملہ آور ہوتے ہیں اور ہمیں نقصان پہنچا کر واپس چلے جاتے ہیں، قرآن کریم میں یہ واقعہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: حَتّٰٓى إِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا قَالُوْا يَا ذَا الْقَرْنَيْنِ إِنَّ يَأْجُوْجَ وَمَأْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْأَرْضِ.(۱) ’’یہاں تک کہ جب ذوالقرنین دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا تو ان دونوں کے اِس طرف اس نے ایک ایسی قوم کو پایا جن کی بات وہ پوری طرح نہیں سمجھتا تھا، وہ کہنے لگے اے ذوالقرنین! بلاشبہ یاجوج ماجوج اس زمین میں فساد مچاتے ہیں‘‘ اس شکایت کا مقصد یہ تھا کہ بادشاہ کوئی تدبیر کرے اور ہمیں ان مفسدین کے شر وفساد سے مامون ومحفوظ کر دے، وہ تدبیر بھی ان لوگوں نے خود ہی بتلا دی کہ ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار بنا دی جائے تاکہ یہ لوگ ادھر نہ آسکیں، کیوں کہ دیوار کی تعمیر پر معقول رقم خرچ ہوتی، اس کے لئے انھوں نے یہ پیش کش

(۱) الکہف: ۹۳، ۹۴۔

بھی کی کہ اس کام کے لئے ہم کچھ چندہ وغیرہ کر کے آپ کو دے سکتے ہیں، اس کے جواب میں ذوالقرنین نے کہا کہ: قَالَ مَا مَكَّنِّي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا. (۱) ''جس مال میں میرے رب نے مجھے تصرف کرنے کا اختیار دیا ہے وہ بہت کچھ ہے (اس لئے چندے وندے کی ضرورت نہیں ہے) البتہ تم ہاتھ پاؤں کی طاقت سے میری مدد کرو تو میں تمہارے اور ان کے درمیان ایک موٹی دیوار بنادوں''۔

اس آیت سے واضح ہے کہ انھوں نے مالی تعاون کی پیش کش تو ٹھکرادی البتہ جسمانی مدد مانگی کہ دیوار بنانے میں میرا ساتھ دو، اور جو کچھ اپنی جسمانی طاقت سے میری مدد کر سکتے ہو کرو، تم جو دیوار بنوانا چاہتے وہ بن جائے گی، اور یہ دیوار کوئی معمولی دیوار نہیں ہوگی کہ اینٹ گارے سے بنادوں گا، بلکہ لوہے اور تابنے سے بناؤں گا، چناں چہ انھوں نے لوگوں سے کہا کہ تم میرے پاس لوہے کی چادریں لاؤ جب چادریں آگئیں تو اس عظیم الشان آہنی دیوار کی تعمیر کا کام شروع کردیا گیا، چادریں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جوڑی گئیں کہ ایک دیوار بن کر کھڑی ہوگئی جو سطح زمین سے پہاڑوں کی چوٹیوں تک جا پہنچی، جب لوہے کی یہ دیوار بن کر تیار ہوگئی تو ذوالقرنین نے لوگوں سے کہا کہ اب اس دیوار کو آگ سے دہکاؤ، چناں چہ آگ جلا کر دیوار کو دہکایا گیا یہاں تک کہ پوری دیوار سرخ انگارا بن گئی، اور لوہے کی چادریں ایک دوسرے میں پوری طرح پیوست ہوگئیں، اس کے بعد ذوالقرنین نے حکم دیا کہ اب میرے پاس پگھلا ہوا تانبا لے کر آؤ، حکم کے مطابق تانبا پگھلا کر لایا گیا، ذوالقرنین نے مزدوروں کو حکم دیا کہ وہ اس تانبے کو دیوار کے اوپر ڈال دیں تا کہ لوہا اور تانبا ایک جان ہو جائے، ذوالقرنین چاہتے تھے کہ ایسی دیوار بن جائے جس پر چڑھا نہ جا سکے اور نہ اس میں کوئی سوراخ وغیرہ کیا جا سکے، لوہے اور تانبے کو ملا کر ایسی دیوار بنادی گئی، اس پر ذوالقرنین نے اللہ کا شکر ادا کیا اور کہا کہ یہ مجھ پر میرے رب کی رحمت ہے کہ میرے ذریعے اتنا بڑا اور حیرت انگیز کام ہوگیا، اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا کہ فی الوقت تو یہ دیوار انتہائی مضبوط بن گئی ہے، مگر میرے ربّ کے سامنے اس کی مضبوطی

(۱) الکہف: ۹۵۔

اور بلندی کوئی معنیٰ نہیں رکھتی، جب وقت آئے گا اللہ اس کو ریزہ ریزہ کر کے زمین کے برابر کر دے گا، یہ میرے رب کا وعدہ ہے اور میرے رب کا وعدہ برحق ہے۔

دیوار کے جغرافیائی پہلو:

سدّ ذوالقرنین کے متعلق قرآنی تفصیلات صرف اتنی ہی ہیں، البتہ مفسرین اور مؤرخین نے اس دیوار کے جغرافیائی پہلوؤں پر کافی لمبی چوڑی بحثیں کی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ یاجوج ماجوج کے ظلم وتشدد کا صرف یہی لوگ شکار نہیں تھے، بل کہ ان کی دہشت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی، کاکیشیا سے لے کر چین تک ہر طرف یہ قوم تباہی پھیلاتی رہتی تھی، ان سے بچنے کے لئے مختلف ادوار میں اور مختلف جگہوں پر دیواریں تعمیر کی گئیں جن میں چار زیادہ مشہور ہیں، ایک دیوار چین ہے جس کی لمبائی مشہور مؤرخ ابوحیان کے بہ قول بارہ سو میل ہے، اس کی تعمیر حضرت آدم علیہ السلام کے وصال سے تین ہزار چار سو ساٹھ سال بعد فغفور بادشاہ نے کرائی، اس دیوار کا کچھ حصہ ابھی تک موجود ہے، دوسری دیوار وسط ایشیاء میں بخارا اور ترمذ کے درمیان بنائی گئی، مشہور فاتح تیمور لنگ کے زمانے تک یہ دیوار موجود تھی، تیسری دیوار روسی علاقے داغستان میں ہے، یہ دربند اور باب الابواب کے نام سے مشہور ہے، چوتھی دیوار کاکیشیا کے بالائی علاقے کوہ قاف کے پاس ہے اور دو اونچے پہاڑوں کے درمیان ہے، کیوں کہ یہ تمام دیواریں ایک ہی مقصد کے تحت تعمیر کی گئیں ہیں اگر چہ ان کا زمانۂ تعمیر الگ الگ ہے اس لئے مؤرخین ومفسرین کے لئے یہ متعین کرنا مشکل ہو گیا کہ قرآن کریم نے جس دیوار کا ذکر سورۂ کہف میں کیا ہے درحقیقت وہ کون سی دیوار ہے، جہاں تک دیوار چین کا تعلق ہے کوئی مفسر یا مؤرخ اس کو سدّ سکندری نہیں مانتا کیوں کہ یہ دیوار مشرق اقصیٰ میں واقع ہے جب کہ ذوالقرنین نے یہ کارنامہ اپنے شمال کے سفر میں انجام دیا، اب باقی تین دیواروں کا معاملہ رہ جاتا ہے جو سب کی سب شمال میں واقع ہیں، عام مؤرخین اس دیوار کو سدّ ذوالقرنین بتلاتے ہیں جو داغستان یا کاکیشیا کے علاقہ باب الابواب کے دربند میں بحر خزر پر واقع ہے۔

بہ ہر حال اس دیوار کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ قرآن کریم میں اس

کا ذکر موجود ہے، اہل یورپ اگر چہ اس کا وجود تسلیم نہیں کرتے، مگر ان کے تسلیم کرنے یا نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، دائرۃ المعارف میں ہے کہ قدیم زمانے میں شمال کی وحشی قومیں اسی طرف سے جنوب کی طرف غارت گری کرتی تھی، ان حملوں کو روکنے کے لئے ایک نہایت مضبوط دیوار بنائی گئی جو 50 میل لمبی اور 290 فٹ بلند اور دس فٹ چوڑی ہے، مسلمان مؤرخین اور جغرافیہ نویس اسی کو سدّ ذوالقرنین کہتے ہیں، اس کی تعمیر کی جو کیفیت قرآن کریم میں بیان کی گئی ہے اس کے آثار اب بھی وہاں پائے جاتے ہیں، بہ ہر حال روئے زمین پر اس دیوار کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا، البتہ اس کے محلّ وقوع میں اختلاف رائے کی گنجائش ہے، قرآن کریم کی تصریح کے مطابق یہ دیوار انتہائی مضبوط ہے مگر اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی مضبوطی کوئی معنی نہیں رکھتی، وہ جب چاہے گا اسے ریزہ ریزہ کر کے زمین کے برابر کر دے گا، اس سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ یہ دیوار قیامت تک باقی رہے گی، بعض نے اس نظریئے کی تردید کی ہے، ان کا کہنا ہے کہ یہ دیوار کب تک باقی رہے گی اور کب اللہ کے حکم سے یہ گر جائے گی اس کے زمانے کی کوئی تعیین قرآن کریم یا حدیث میں نہیں ہے، ہو سکتا ہے یہ واقعہ ہو بھی چکا ہو، یا ہونے والا ہو، یا قیامت کے قریب واقع ہو، سارے احتمالات موجود ہیں، بعض روایات میں ہے کہ یاجوج ماجوج اس دیوار کو دن بھر چاٹتے رہتے ہیں رات آتے آتے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیوار میں سوراخ ہونے ہی والا ہے یاجوج ماجوج اسے آنے والے کل پر چھوڑ کر واپس چلے جاتے ہیں، اگلی صبح دیوار پھر اسی حالت میں ملتی ہے جیسی وہ تعمیر کی گئی تھی، قیامت تک یہ سلسلہ چلتا رہے گا یہاں تک کہ قیامت کے قریب چاٹنے سے دیوار آر پار ہو جائے گی، اور یاجوج ماجوج اس میں سے نکل کر روئے زمین پر پھیل جائیں گے، اس حدیث سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ دیوار ابھی تک اپنی حالت پر قائم ہے، یاجوج ماجوج اس کو گرانے یا اس میں سوراخ کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، مگر اللہ انہیں کامیاب نہیں ہونے دیتا، قیامت کے قریب وہ اس کو توڑنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے اور ساری دنیا میں پھیل کر وہ تباہی مچائیں گے کہ الامان والحفیظ۔

یاجوج اور ماجوج

قرآن کریم کی دوسورتوں میں یاجوج ماجوج کا ذکر ہے اور وہ بھی نہایت اختصار کے ساتھ، ایک تو اس سورت میں ہے جو اس وقت ہمارے سامنے ہے، اس میں یہ کہا گیا ہے کہ: إِنَّ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ.(۱) ''بلاشبہ یاجوج ماجوج زمین میں فساد پھیلانے والے ہیں'' دوسرے سورۂ انبیاء میں ہے: حَتَّىٰ إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوجُ وَمَأْجُوجُ وَهُم مِّن كُلِّ حَدَبٍ يَنسِلُونَ.(۲) ''یہاں تک کہ وہ وقت آجائے جب یاجوج اور ماجوج کھول دئے جائیں گے اور وہ ہر بلندی سے نکل پڑیں گے'' اس سے پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ ذوالقرنین اپنی شمالی مہم کے دوران جب ایسے دو پہاڑوں کے قریب پہنچے تھے جن کے درمیان ایک بڑا خلاء تھا، اور اُدھر سے یاجوج ماجوج نامی قومیں اِدھر آ کر تباہی مچاتی تھیں، قرآن کریم نے یاجوج ماجوج کے متعلق صرف اتنا ہی بتلایا ہے، البتہ حدیث کی کتابوں میں کچھ اور بھی تفصیلات ہیں جن کی روشنی میں یاجوج ماجوج کی حقیقت، ان کے نکلنے کا وقت، اور ان کے ذریعے ہونے والی تباہی وبربادی کی کیفیت کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔

یاجوج ماجوج کون ہیں:

یہ بات طے شدہ ہے کہ یاجوج اور ماجوج غیر انسانی اقوام نہیں ہیں، بلکہ ان کا تعلق اسی نسلِ انسانی سے ہے جو طوفانِ نوح کے بعد باقی رہ گئی تھی اور جس کے متعلق قرآن کریم میں ارشاد فرمایا: وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِينَ.(۳) ''ہم نے نوح ہی کی نسل کو باقی رہنے دیا''۔ مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ یاجوج اور ماجوج نوح کے بیٹے یافث کی اولاد ہیں، علامہ قرطبی نے مشہور مفسّر سُدّی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ یاجوج اور ماجوج کے بائیس قبیلے تھے، ان میں سے اکیس قبیلوں کو ذوالقرنین نے دیوار کے پیچھے بند کردیا تھا،

(۱) الکہف: ۹۴۔ (۲) الانبیاء: ۹۶۔ (۳) الصافات: ۷۷۔

صرف ایک قبیلہ باقی رہ گیا تھا اس قبیلے کے لوگ ترک ہیں، قرطبی چھٹی صدی ہجری میں ہیں، ان کے زمانے میں جو فتنۂ تاتار برپا ہوا اس کو وہ فتنۂ یاجوج ماجوج سے مشابہ مانتے ہیں، بلکہ یہاں تک کہتے ہیں کہ ان مغلوں کے جو مشرک اقوام میں سے ہیں اسلامی خلافت پر حملہ آور ہونے کی نوعیت سے ایسا لگتا ہے کہ یہی لوگ یاجوج اور ماجوج ہیں یا کم از کم ان کا مقدمہ ہیں۔(۱) مگر علامہ آلوسی بغدادیؒ نے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے کہا ہے کہ تاتاریوں کو یاجوج اور ماجوج قرار دینا غلط ہے بلکہ کھلی گم راہی ہے، کیوں کہ اس سے نصوص حدیث کی کھلی مخالفت لازم آتی ہے، اگرچہ فتنۂ تاتار یاجوج اور ماجوج کے فتنے سے مشابہ ہے مگر یاجوج اور ماجوج بالکل الگ اقوام ہیں جو قیامت کے قریب حضرت عیسیٰ کی تشریف آوری کے بعد باہر نکلیں گے،(۲) اس سے معلوم ہوا کہ یاجوج اور ماجوج کے سلسلے میں قیاس آرائیوں کا سلسلہ نیا نہیں ہے، بلکہ ان اقوام کا مصداق متعین کرنے میں اس سے پہلے بھی عجلت سے کام لیا گیا ہے، اور ذخیرۂ حدیث کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اگرچہ اس کی تردید بھی کی گئی ہے، قرطبی کے بیان سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ خود انھیں یہ یقین نہیں تھا کہ یاجوج اور ماجوج مغول ترک ہیں، اسی لئے انھوں نے فتنۂ تاتار کو فتنۂ یاجوج ماجوج کا مقدمہ قرار دیا ہے، اور یہ قرطبی جیسے مفسّر سے بعید ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سلسلے میں جمہور مفسّرین کے خلاف کوئی رائے دیں جب کہ احادیث سے بھی اس رائے کی موافقت نہ ہو رہی ہو۔

روایات میں یاجوج ماجوج کا کردار:

یاجوج اور ماجوج کے سلسلے میں متعدد روایات موجود ہیں، ان میں سب سے زیادہ تفصیلی روایت حضرت نواس بن سمعان کی ہے جو صحیح مسلم سمیت تمام مستند کتب حدیث میں موجود ہے، اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے دجال کا خروج ہوگا، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے، پھر یاجوج اور ماجوج نکلیں گے، اس ترتیب کے ساتھ یہ پوری تفصیل مذکورہ بالا حدیث میں موجود ہے، ہم اس کا صرف وہ حصہ نقل کرتے ہیں جو

(۱) تفسیر قرطبی: ۵۸/۱۱۔ (۲) تفسیر روح المعانی: ۴۴/۱۶۔

یاجوج اور ماجوج کے سلسلے میں ہے، حضرت نواس بن سمعان روایت کرتے ہیں کہ ایک دن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کے وقت دجال کا تذکرہ فرمایا (اس کے بعد راوی نے دجال کے حلئے اور اس کی آمد، اور اس کے فتنہ وفساد کی تفصیل بیان فرمائی ہے جو انھوں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی اسی ضمن میں یہ بھی فرمایا کہ)۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول:

''اسی دوران اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نازل فرمائیں گے چنانچہ وہ دو رنگ کی چادریں پہنے ہوئے دمشق کی مشرقی جانب کے سفید مینار پر اس طرح اتریں گے کہ ان کے دونوں ہاتھ فرشتوں کے بازوؤں پر رکھے ہوئے ہوں گے، جب حضرت عیسی علیہ السلام اپنا سر جھکائیں گے تو پسینہ ٹپکے گا اور جب سر اٹھائیں گے تو موتی کی لڑیوں کی طرح قطرے ٹپکیں گے، کسی کافر کے لیے ممکن نہ ہوگا کہ وہ ان کی خوشبو محسوس کرنے کے بعد زندہ رہ جائے، ان کی خوشبو وہاں تک پہنچے گی جہاں تک ان کی نگاہ پہنچے گی، (اس کے بعد) حضرت عیسیٰؑ دجال کو تلاش کریں گے یہاں تک کہ اسے بابِ لُدّ پر جا پکڑیں گے (یہ بستی بیت المقدس کے قریب اسی نام سے موجود ہے) اور وہاں اس کو قتل کر دیں گے، پھر حضرت عیسی علیہ السلام ایسے لوگوں کے پاس آئیں گے جن کو اللہ نے دجال سے محفوظ رکھا، حضرت عیسی علیہ السلام ان کے چہروں پر ہاتھ پھیریں گے اور جنت میں ان کے جو درجات ہوں گے ان کے بارے میں بتلائیں گے، اتنے میں حکم الٰہی ہوگا کہ میں اپنے بندوں میں سے ایسے لوگوں کو نکالوں گا جن کا مقابلہ کرنے کی کسی کے پاس طاقت نہ ہوگی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام مسلمانوں کو جمع کر کے کوہِ طور پر لے جائیں گے، اس وقت اللہ تعالیٰ یاجوج اور ماجوج کو کھول دیں گے وہ تیز رفتاری کی وجہ سے ایسے نکلیں گے جیسے بلندی سے نیچے کی طرف پھسلتے آرہے ہوں، یاجوج اور ماجوج کی اگلی صفوں کے لوگ بحیرہ الطبریہ سے گزرتے ہوئے اس کا سارا پانی پی جائیں گے، پیچھے آنے والے گیلا پن دیکھ کر کہیں گے یہاں کبھی پانی رہا ہوگا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے رفقا کوہ طور پر ہوں گے، دوسرے مسلمان بھی اپنے قلعوں میں اور دوسری محفوظ جگہوں میں پناہ گزیں

ہوں گے، کھانے پینے کا تمام سامان ختم ہو جائے گا، اس وقت ایک بیل کے سر کی قیمت سو دینار سے زیادہ ہو جائے گی، (ان حالات میں) حضرت عیسیٰ علیہ السلام دُعا فرمائیں گے، ایک وبا طاری ہوگی جس سے یاجوج اور ماجوج ہلاک ہو جائیں گے حضرت عیسیٰؑ اور ان کے رفقاء کوہِ طور سے نیچے اتر کر دیکھیں گے تو ایک بالشت جگہ بھی ایسی نظر نہیں آئے گی جہاں یاجوج اور ماجوج کی لاشیں موجود نہ ہوں (لاشوں کے سڑنے کی وجہ سے) سخت تعفن پھیل جائے گا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دُعا سے نہایت لحیم شحیم پرندے جن کی گردنیں اونٹ کی گردن جیسی ہوں گی نکلیں گے اور ان لاشوں کو اٹھا کر کہیں پھینک دیں گے یا سمندر میں ڈال دیں گے، پھر پوری دنیا میں بارش ہوگی جس سے روئے زمین شیشے کی طرح صاف شفاف ہو جائے گی، پھر اللہ کے حکم سے زمین کی پیداوار بڑھ جائے گی ایک انار ایک جماعت کے لیے کافی ہو جائے گا، انار کا چھلکا اتنا بڑا ہوگا کہ لوگ اس کے سائے میں آرام کریں گے، ایک اونٹنی کا دودھ ایک بہت بڑی آبادی کے لئے ایک گائے کا دودھ پورے قبیلے کے لئے اور ایک بکری کا دودھ پوری برادری کے لئے کافی ہوگا، چالیس سال اسی خیر و برکت کے گزریں گے، پھر ایک خوش گوار ہوا چلے گی جس کے اثر سے مسلمانوں کی بغل کے نیچے کوئی (گلٹی جیسی) بیماری پیدا ہوگی، اس بیماری کی وجہ سے تمام مسلمان وفات پا جائیں گے، روئے زمین پر صرف کافر اور شر پسند لوگ رہ جائیں گے جو جانوروں کی طرح حرام کاری میں مصروف رہیں گے، ایسے لوگوں پر قیامت برپا ہوگی۔" (۱)

"حضرت عبدالرحمٰن بن یزید نے اس واقعے کی کچھ اور تفصیل بھی بیان فرمائی ہے کہ یاجوج اور ماجوج بحیرہ طبریہ سے گزرنے کے بعد بیت المقدس کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ جبل الخمر پر چڑھ جائیں گے، اور کہیں گے کہ ہم نے سب زمین والوں کو قتل کر دیا ہے اب آسمان والوں کو ختم کرنا ہے، چنانچہ وہ آسمان کی طرف تیر برسائیں گے اور یہ تیر خون آلود ہو کر ان کی طرف واپس آئیں گے تاکہ یہ احمق یقین کر لیں کہ انھوں نے آسمان والوں کو ختم کر دیا ہے۔" (۲)

(۱) صحیح مسلم: ۲۲۵۰/۴، رقم الحدیث: ۲۹۳۷۔ (۲) صحیح مسلم: ۲۲۵۰/۴، رقم الحدیث: ۲۹۳۷۔

کچھ اور روایات:

اس سلسلے کی کچھ روایات اور بھی ہیں جن سے اس مضمون کی تائید بھی ہوتی ہے اور کچھ نئے حقائق بھی سامنے آتے ہیں، مثال کے طور پر:

(۱) ام المؤمنین حضرت زینب بنت جحشؓ فرماتی ہیں کہ ایک دن سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اس حالت میں نیند سے بیدار ہوئے کہ چہرۂ مبارک سُرخ ہو رہا تھا اور آپ کی زبان پر دل دہلا دینے والے کلمات تھے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

''ام المؤمنین حضرت زینب بنت جحشؓ فرماتی ہیں کہ ایک دن سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اس حال میں باہر تشریف لائے کہ آپ پر گھبراہٹ طاری تھی اور چہرۂ انور سُرخ تھا، (آپ اس وقت) یہ ارشاد فرما رہے تھے، اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، خرابی ہے اہل عرب کے لئے اس شر سے جو قریب آچکا ہے، آج یاجوج اور ماجوج کے ردم (دیوار میں) اتنا بڑا سوراخ کھل گیا ہے، سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے انگوٹھے اور انگشت شہادت ملا کر ایک حلقہ بنا کر دکھلایا، ام المؤمنین حضرت زینب فرماتی ہیں کہ یہ سُن کر ہم نے عرض کیا کہ کیا ہم ایسی حالت میں ہلاک ہوسکتے ہیں جب کہ ہمارے درمیان نیک وصالح لوگ موجود ہوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہاں ہلاک ہوسکتے ہیں جب کہ شر کی کثرت ہوجائے۔'' (۱)

اسی طرح کی ایک روایت بخاری ومسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی مروی ہے، (۲) حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ ذوالقرنین کی تعمیر کردہ دیوار میں اتنے بڑے سوراخ کا ہوجانا حقیقی معنی پر بھی محمول ہوسکتا ہے اور مجازی معنی پر بھی کہ سوراخ تو نہیں ہوا لیکن دیوار کمزور ہوگئی۔

(۲) ''حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یاجوج اور ماجوج ہر روز سد ذوالقرنین کو کھودتے رہتے ہیں یہاں تک کہ اس آہنی دیوار کے آخری حصے تک اتنے قریب پہنچ جاتے ہیں کہ دوسری طرف کی روشنی نظر

(۱) بخاری: ۱۱/۳۳۳، رقم الحدیث: ۳۰۹۷۔ مسلم: ۱۴/۴۸، رقم الحدیث: ۵۱۲۸۔ (۲) بخاری: ۱۱/۳۴۴، رقم الحدیث: ۳۰۹۸، مسلم: ۱۴/۵۰، رقم الحدیث: ۵۱۳۰۔

آنے لگتی ہے، اس وقت یہ کہتے ہوئے واپس چل دیتے ہیں کہ باقی کام کل کریں گے، اللہ تعالیٰ اس دیوار کو پھر ایسا ہی مضبوط کر دیتے ہیں، یاجوج ماجوج اگلے دن پھر از سرِ نو محنت کرتے ہیں، ان کی طرف سے یہ سلسلہ محنت کا اور اللہ کی طرف سے اصلاح و درستگی کا اسی طرح چلتا رہے گا جب تک یاجوج اور ماجوج کو بند رکھنے کا ارادہ ہے، جب اللہ تعالیٰ ان کو کھولنے کا ارادہ فرمائیں گے تو وہ یوں کہیں گے کہ اگر اللہ نے چاہا کل ہم اس دیوار کو پار کرلیں گے تو اگلے روز دیوار کا باقی ماندہ حصہ اپنی حالت پر ملے گا اور وہ اس کو توڑ کر پار کرلیں گے اور لوگوں پر نکلیں گے، سارا پانی پی جائیں گے، لوگ ان کے شر سے بچنے کے لیے قلعہ بند ہو جائیں گے، یاجوج ماجوج اپنے تیر آسمان کی طرف چلائیں گے جو خون آلودہ ہو کر ان کی طرف لوٹ جائیں گے تب وہ کہیں گے کہ ہم نے زمین والوں کو ہلاک کر ڈالا، ہم آسمان والوں پر غالب آچکے ہیں، تب اللہ تعالیٰ ان کی گدیوں میں ایک کیڑا پیدا کریں گے جو ان کو ہلاک کر ڈالے گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے زمین کے جانور موٹے ہو جائیں گے اور ان کا گوشت حاصل کرنے پر اللہ کا شکر ادا کریں گے"۔(۱)

حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اس حدیث کو عبد بن حمید اور ابن حبان کے حوالے سے بھی نقل کیا ہے، اور کہا ہے کہ ان میں سے بعض کی سند کے رجال صحیح بخاری کے رجال ہیں، حافظ ابن حجر نے ابن عربی کا یہ بیان بھی نقل کیا ہے کہ اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کی تین نشانیاں مخفی ہیں، ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے یاجوج اور ماجوج کے ذہنوں کو اس طرف متوجہ نہیں ہونے دیا کہ وہ رات دن لگ کر دیوار توڑنے کا کام مکمل کرلیں، بلکہ جب دیوار ٹوٹنے کے قریب ہوتی ہے اور دوسری طرف کی روشنی نظر آنے لگتی ہے تو وہ باقی ماندہ کام کو اگلے دن پر معلق چھوڑ کر واپس چلے جاتے، دوسری بات یہ کہ ان کے ذہنوں میں دیوار پر چڑھنے کا خیال ہی نہیں آیا، حالاں کہ وہ لوگ صنعت پیشہ ہیں اور بڑی بڑی کرینیں یا سیڑھیاں لگا کر دیوار پر چڑھ سکتے ہیں، تیسری بات یہ ہے کہ آخری مرتبہ ان شاء اللہ کہنے سے پہلے ان کے دل میں یہ خیال نہیں آئے گا کہ وہ اپنی زبان سے یہ کلمہ ادا کر کے کام بند کریں۔

(۱) سنن ابن ماجہ ص:۲۹۹ مطبوع دارالکتاب دیوبند۔

(۳) حضرت ابوسعید الخدریؓ سے مروی ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ اپنی اولاد میں سے دوزخیوں کو اٹھا لیجیے، وہ عرض کریں گے: اے اللہ! وہ کون کون ہیں، فرمائیں گے ہر ایک ہزار میں سے نو سو ننانوے جہنمی ہیں، صرف ایک جنتی ہے، یہ سن کر صحابۂ کرام ڈر گئے، انھوں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ ایک جنتی کون سا ہوگا، آپ نے فرمایا غم نہ کرو، ایک ہزار میں سے نو سو ننانوے یاجوج اور ماجوج میں سے ہوں گے اور تم میں سے ایک ہوگا، حدیث شریف کا متن یہ ہے:

عن أبي سعيد الخدري قال قال النبي صلى الله عليه وسلم يقول الله عزوجل يومَ القيامة يا آدم يقول لبّيک رَبنا وسعديک فيُنَادى بصوتٍ إن الله يأمر أن تخرج من ذريّتِکَ بعثًا إلى النار قال يا ربِّ وما بعثُ النار قال من کُل ألفٍ أراه قال تسع مِائَةٍ وتسعة وتسعين.(۱)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ یاجوج اور ماجوج اتنا زیادہ ہوں گے کہ ایک مسلمان کے مقابلے میں ان کی تعداد نو سو ننانوے ہوگی، اسی طرح کی ایک روایت یہ ہے:

"حضرت عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق کو دس حصوں پر تقسیم کیا ہے نو حصے ملائکہ ہیں اور ایک حصے میں باقی مخلوق ہے، پھر ملائکہ کو دس حصوں میں تقسیم فرمایا ہے ان میں سے نو حصے ملائکہ کے وہ ہیں جو رات دن اللہ کی تسبیح کرتے رہتے ہیں کبھی تھکتے نہیں ہیں اور ایک حصہ اپنا پیغام پہنچانے کے لیے خاص کیا ہے، باقی مخلوق کو بھی دس حصوں پر منقسم فرمایا ہے، نو حصوں میں جن ہیں اور ایک حصہ انسانوں پر مشتمل ہے، پھر انسانوں کے بھی دس حصے کیے ہیں، نو حصوں میں یاجوج ماجوج ہیں اور ایک حصے میں باقی تمام لوگ ہیں"۔(۲)

واقعات کی ترتیب:

یاجوج اور ماجوج کے واقعات کی ترتیب کے ساتھ اگر حدیث کی کتابوں میں سے روایات جمع کی جائیں تو کچھ اس طرح ہوں گی (ا) لوگ امن چین کی زندگی بسر کر رہے

(۱) بخاری: ۱۴/۳۸۳، رقم الحدیث: ۴۳۷۲۔ (۲) المستدرک: ۴/۵۳۶، رقم الحدیث: ۸۵۰۶۔

ہوں گے کہ یاجوج ماجوج کی دیوار ٹوٹ جائے گی، (۱) (۲) اور یاجوج ماجوج نکل پڑیں گے، (۲) (۳) اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوگا کہ وہ مسلمانوں کو طور پر لے جائیں کیوں کہ یاجوج اور ماجوج کا مقابلہ کسی کے بس میں نہ ہوگا (۳) (۴) یاجوج ماجوج اتنی بڑی تعداد میں تیزی سے نکلیں گے کہ ہر بلندی سے پھسلتے ہوئے معلوم ہوں گے (۴) (۵) وہ شہروں کو روند ڈالیں گے، زمین میں تباہی مچادیں گے اور جس پانی پر گزریں گے اسے پی کر ختم کردیں گے، (۵) (۶) ان کی ابتدائی جماعت جب بحیرۂ طبریہ سے گزرے گی تو اس کا پورا پانی پی جائے گی اور جب ان کی آخری جماعت وہاں سے گزرے گی تو اسے دیکھ کر کہے گی یہاں کبھی پانی موجود تھا (۶) (۷) بالآخر یاجوج اور ماجوج کہیں گے کہ اہل زمین پر تو ہم غلبہ پاچکے آؤ اب آسمان والوں سے جنگ کریں (۷) (۸) حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی اس وقت محصور ہوں گے جہاں غذا کی سخت قلت کے باعث لوگوں کو ایک بیل کا سر سو دینار سے بہتر معلوم ہوگا (۸) (۹) لوگوں کی شکایت پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام یاجوج اور ماجوج کے لئے بد دعا فرمائیں گے، (۹) (۱۰) اللہ تعالیٰ ان کے کانوں میں ایک کیڑا اور گردنوں میں ایک پھوڑا نکال دے گا (۱۰) (۱۱) اس بیماری سے سب کے جسم پھٹ جائیں گے اور وہ سب دفعۃً ہلاک ہوجائیں گے (۱۱) (۱۲) اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی زمین پر اتریں گے مگر پوری زمین یاجوج اور ماجوج کی لاشوں کی بدبو سے بھری ہوگی، (۱۲) (۱۳) حضرت عیسیٰ علیہ السلام دُعا کریں گے، اللہ تعالیٰ لمبی گردنوں والے بڑے بڑے پرندے بھیج دیں گے جو ان کی لاشیں اٹھا کر جہاں اللہ چاہے گا پھینک دیں گے، (۱۳) (۱۴) پھر اللہ تعالیٰ ایسی بارش برسائے گا جو زمین کو دھو کر آئینے کی طرح صاف کردے گا (۱۴) (۱۵) اور زمین اپنی اصل حالت پر ثمرات و برکات سے بھر جائے گی (۱۵)۔ (۱۶)

---

(۱) مستدرک حاکم، السیوطی فی الحاوی۔ (۲) مسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، طبرانی، حاکم، ابن عساکر، ابن ابی شیبہ۔ (۳) مسلم۔ (۴) مسلم، مسند احمد بن حنبل۔ (۵) احمد، ابن ابی شیبہ، حاکم، الحاوی۔ (۶) مسلم، حاکم ابن عساکر۔ (۷) حاکم، ابن عساکر۔ (۸) مسلم۔ (۹) مسلم، احمد۔ (۱۰) مسلم، حاکم، ابن عساکر، السیوطی فی الحاوی۔ (۱۱) مسلم، احمد، حاکم، السیوطی فی الحاوی۔ (۱۲) مسلم، احمد، حاکم، سیوطی۔ (۱۳) مسلم، حاکم ابن عساکر۔ (۱۴) مسلم، احمد۔ (۱۵) مسلم۔ (۱۶) علامات قیامت اور نزول مسیح مؤلفہ حضرت مولانا رفیع عثمانی، ۱۵۷ تا ۱۶۰۔

اصحابِ کہف

اصحاب کہف کا قصہ:

مشہور مفسر علامہ طبری حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں کہ مکہ مکرمہ میں جب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کی شہرت ہوئی تو قریش کے سر برآوردہ لوگوں نے نضر بن الحارث اور عقبہ بن ابی معیط کو اپنا نمائندہ بنا کر یثرب کے علمائے یہود کے پاس بھیجا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نبی ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں ان کے دعوے کی سچائی کا پتہ کس طرح لگائیں، اس سلسلے میں آپ حضرات کی رہ نمائی چاہئے، علمائے یہود نے ان دونوں کو تین سوالات لکھ کر دئے اور کہا کہ اگر انھوں نے ان تینوں سوالات کا جواب ہماری کتابوں کے مطابق دیا تو وہ سچے ہیں، اس صورت میں ان پر ایمان لانا اور ان کی اطاعت کرنا ضروری ہے، اور اگر نہیں دیا تو تم ان کے ساتھ جو چاہے سلوک کرنا، ان تین سوالات میں سے ایک سوال اصحابِ کہف کے متعلق تھا کہ وہ کون تھے، اور ان کا کیا قصہ ہے، چناں چہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا گیا، اس کے جواب میں قرآن کریم کی سورۂ کہف نازل ہوئی، اس سورت کے شروع ہی میں چند آیات کے بعد اصحاب کہف والرقیم کا قصہ بیان کیا گیا ہے، مگر اس تنبیہ کے ساتھ کہ تمہارے نزدیک اصحاب الکہف والرقیم کا قصہ کچھ زیادہ ہی حیرت انگیز ہے، حالاں کہ حق کی معرفت کے لئے اس سے بھی بڑھ کر عجائبات ہیں، بس وہ آنکھیں چاہئیں جو ان عجائبات کا مشاہدہ کرسکیں، مثال کے طور پر زمین وآسمان اور کائنات کی دوسری چیزوں کی تخلیق بجائے خود بڑی حیرت انگیز ہے، اصحابِ کہف تو پہلے سے موجود تھے، ہم نے دو تین سو سال تک ان کو سلائے رکھا، پھر ان کو ویسا ہی جوان وتندرست جگا کر اٹھا دیا، زمین وآسمان اور کائنات کی ساری چیزیں تو پہلے سے موجود ہی نہیں تھیں، ہم نے ان کو عدم سے وجود بخشا، ظاہر ہے معدوم سے موجود کرنا، موجود میں تصرف کرنے سے زیادہ مشکل اور عجیب وغریب ہے۔

اصحاب کہف کون تھے:

قصہ بیان کرنے سے پہلے یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ قرآن کریم نے اس قصے کا آغاز اصحاب الکہف والرقیم سے کیا ہے، یعنی غار اور پہاڑ والے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غار اور پہاڑ والے دو الگ الگ جماعتوں کے نام ہیں یا دونوں ایک ہی ہیں، عام طور پر مفسرین نے ان کو ایک ہی مانا ہے، کیوں کہ احادیث میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے کہ یہ دونوں الگ الگ ہیں، البتہ امام بخاری اپنی کتاب میں اصحاب الرقیم کے تحت وہ حدیث لائے ہیں جس میں بارش کی وجہ سے تین افراد کسی غار میں چٹان گر جانے کی وجہ سے پھنس گئے تھے، پھر ان کے اعمال صالحہ کی برکت سے وہ چٹان اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھی اور غار کا دہانہ کھل گیا تھا، بخاری کے شارح حافظ ابن حجرؒ نے واضح کیا ہے کہ کسی حدیث میں اس کی تصریح نہیں ہے کہ اصحاب الرقیم سے یہ تین افراد مراد ہیں، قرآن کریم کے سیاق سے بہ ظاہر ایسا لگتا ہے کہ اصحاب الکہف والرقیم کا مصداق ایک ہی جماعت ہے، چناں چہ تمام مفسرین اسی کے قائل ہیں۔

قصے کا تاریخی پہلو:

اس قصے کا ایک پہلو تو تاریخی ہے کہ یہ کہاں پیش آیا، اور کب پیش آیا، وہ کافر بادشاہ کون تھا جس کے زمانے میں یہ واقعہ ہوا، اصحاب کہف کتنے افراد تھے، وہ کتنی مدت تک سوئے رہے، ان کا مذہب کیا تھا، کس کے زمانے میں بیدار ہوئے وغیرہ وغیرہ، دوسرا پہلو روحانی ہے کہ اصل مقصد قصہ بیان کرنا نہیں ہے بل کہ مشرکین کے اس سوال کا جواب دینا ہے جو انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا، ویسے بھی قرآن کریم پرانے قصوں کی کتاب نہیں ہے، جو قصے بھی اس میں بیان کئے گئے ہیں وہ ضمنی طور پر اور موقع ومحل کی مناسبت سے اختصار کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، اور اس میں بھی ان پہلوؤں کو لیا گیا ہے جو مخاطبین کے لئے سودمند اور نفع بخش ہوں، اصحاب کہف کا قصہ بھی مختصراً بیان کیا گیا ہے، اور اس میں بھی سارا زور قصے کی اصل روح یعنی مشرکین مکہ کی فہمائش پر دیا گیا ہے، یہی وجہ ہے قرآن کریم نے نہ یہ بتلایا کہ یہ قصہ کب پیش آیا، کتنے لوگ تھے، کتنی مدت

سوتے رہے، کس بادشاہ کے دور میں سوئے اور کس کے زمانے میں بیدار ہوئے، قرآن کریم نے ان سوالوں کا کوئی حتمی جواب نہیں دیا بل کہ اس کو علم الٰہی کے حوالے کردیا، البتہ مفسرین نے صحابۂ کرامؓ اور تابعین کے اقوال کی روشنی میں اور قدیم آسمانی کتابوں سے اخذ کر کے اس قصے کے تاریخی اور جغرافیائی پہلوؤں پر بہت کچھ لکھا ہے۔

کہف کہاں واقع ہے:

مشہور مفسر علامہ قرطبی نے اپنی تفسیر میں کچھ چشم دید اور کچھ سنے سنائے واقعات کی روشنی میں ان جگہوں کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے جن کے متعلق یہ مشہور ہے کہ ان میں سے کسی ایک جگہ اصحاب کہف کا واقعہ پیش آیا، علامہ قرطبیؒ نے تین مقامات کا ذکر کیا ہے جن کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ اصحاب کہف کی آرام گاہ ان تین شہروں میں سے کسی ایک میں واقع ہے۔

(۱) ضحاک کہتے ہیں کہ رقیم شام کے ایک شہر کا نام ہے جس کے ایک غار میں اکیس آدمی لیٹے ہوئے ہیں جو سوئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، امام تفسیر ابن عطیہ کہتے ہیں کہ میں نے بہت سے لوگوں سے سنا ہے کہ ملک شام میں ایک غار ہے جس کے اندر کچھ مردہ اجسام ہیں، وہاں کے مجاورین کا کہنا ہے کہ یہی اصحاب کہف ہیں اس غار کے پاس ایک مکان اور ایک مسجد بھی ہے جس کو رقیم کہا جاتا ہے، ان نعشوں کے ساتھ ایک کتے کا ڈھانچہ بھی موجود ہے، بعض نعشوں پر گوشت پوست موجود ہے اور بعض صرف خالی ہڈیوں کا ڈھانچہ ہیں، ابن عطیہ کہتے ہیں کہ یہ سن کر میں خود ۵۰۴ھ میں وہاں پہنچا، جو کچھ سنا تھا وہی دیکھا۔

(۲) غرناطہ (اندلس) کے بالائی حصے میں ایک قدیم شہر کے نشانات پائے جاتے ہیں جو رومیوں کے طرز کے ہیں اس شہر کا نام رقیوس بتلایا جاتا ہے، امام قرطبی کہتے ہیں کہ ہم نے ان کھنڈرات میں بہت سے عجائبات اور قبریں دیکھی ہیں، ابوحیان اندلسی جو خاص غرناطہ میں پیدا ہوئے اور وہیں رہے سہے، وہ اپنی تفسیر البحر المحیط میں لکھتے ہیں کہ تاریخی واقعات اور مشاہدات کی روشنی میں زیادہ راجح یہی ہے کہ یہ واقعہ غرناطہ میں پیش آیا، میں

جب اندلس میں تھا تو بہت لوگ اس غار کی زیارت کے لئے جایا کرتے تھے اور واپس آکر بتلاتے تھے، وہ نعشیں اگرچہ اب تک موجود ہیں اور شمار کرنے والے انہیں شمار بھی کرتے ہیں مگر ہمیشہ تعداد بتلانے میں غلطی کر جاتے ہیں، میں خود بے شمار مرتبہ ادھر سے گزرا ہوں اور میں نے وہاں غیر معمولی بڑے بڑے پتھر دیکھے ہیں۔

(۳) ابن جریر طبری اور ابن ابی حاتم وغیرہ مفسرین نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ رقیم ایک وادی کا نام ہے جو فلسطین اور ایلہ (عقبہ) کے درمیان واقع ہے، ابن عباسؓ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہودی عالم کعب احبار نے میرے پوچھنے پر بتلایا کہ اصحاب کہف غار میں جانے سے پہلے جس بستی میں رہا کرتے تھے اس کا نام رقیم ہے، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ یہ بھی بیان فرماتے ہیں کہ غزوۃ المضیق کے موقع پر حضرت معاویہؓ کے ساتھ جب ہم رومیوں سے مقابلہ کرنے گئے تو اصحاب کہف پر سے بھی ہمارا گزر ہوا، حضرت معاویہؓ نے غار کے اندر جانے کا ارادہ کیا، مگر میں نے انھیں یہ کہہ کر روکنے کی کوشش کی آپ اس کی جرأت کیسے کر سکتے ہیں جب کہ قرآن کریم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ: لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا.(۱) ''جب آپ انھیں دیکھیں گے تو بھاگ کھڑے ہوں گے اور دہشت زدہ ہو جائیں گے'' مگر حضرت معاویہؓ نے میری بات نہیں مانی اور کہنے لگے کہ آیت میں اصحاب کہف کی جس ہیبت کا ذکر ہے وہ ان کی زندگی سے تعلق رکھتی ہے کیا ضروری ہے کہ اب بھی ان کی یہی حالت ہو، حضرت معاویہؓ نے اپنے کچھ آدمیوں کو دیکھنے کے لئے بھیجا، مگر جب انھوں نے غار میں داخل ہونا چاہا تو ایک سخت آندھی آئی جس کی وجہ سے وہ غار کے اندر داخل نہیں ہو سکے۔

مولانا محمد تقی عثمانی نے اپنے سفرنامے ''جہان دیدہ'' میں بہت سی تاریخی تحقیقات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اردن کے مشہور تاریخی شہر پٹرا کا اصل نام رقیم تھا جسے رومی حکومت نے بدل کر پٹرا کر دیا، یہ جگہ شرق اردن میں عمان سے سات کلومیٹر دور ہے، اور اردن کی مرکزی شاہ راہ جو عقبہ سے عمان تک گئی ہے اس سے اس کا فاصلہ ۳ کلومیٹر ہے،

(۱) الکہف: ۱۸۔

مولانا لکھتے ہیں کہ ”بہ ہر کیف اتنے پرانے واقعے کے محل وقوع کے بارے میں حتمی طور پر سو فی صد یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ اب تک جتنے مقامات کے بارے میں مقام اصحاب کہف ہونے کی رائے ظاہر کی گئی ہے ان سب میں جتنے زیادہ قرائن وشواہد اس غار کے حق میں ہیں کسی اور غار کے حق میں اتنے قرائن موجود نہیں ہیں“۔

اصحاب کہف کی جرأت ایمانی:

حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ سورۂ کہف میں جن نوجوانوں کا قصہ مذکور ہے، وہ قوم کے سرداروں کے بیٹے یعنی شاہ زادے تھے، یہ نوجوان موحّد تھے، جب کہ ان کی قوم بت پرست تھی، ایک مرتبہ شہر سے باہر کسی مذہبی میلے کا انعقاد ہوا، جس میں بتوں کی پوجا کی گئی، بادشاہ خود بھی بت پرست تھا اور اپنی قوم کو بھی بت پرستی کی ترغیب دیتا تھا، بل کہ جو لوگ بت پرستی سے اجتناب کرتے ان پر ظلم وتشدد کرتا اور انہیں مجبور کرتا کہ وہ بھی اس کی طرح بتوں کی پوجا کریں، شہر کے چند نوجوان بھی میلے میں پہنچے، وہاں کے شرکیہ مناظر دیکھ کر انہیں سخت مایوسی ہوئی، شہر سے یہ نوجوان اکٹھے ہو کر نہیں آئے تھے، اور نہ پہلے سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ کوئی واقفیت رکھتے تھے، ایک نوجوان بت پرستی کے مناظر دیکھ کر اس قدر غم زدہ ہوا کہ میلے سے نکل کر ایک درخت کے نیچے آبیٹھا، شدہ شدہ کئی نوجوان آئے اور اس درخت کے نیچے بیٹھ گئے، یہ سب وہ لوگ تھے جن کے دل نور توحید سے جگمگا رہے تھے، انہیں اپنے بادشاہ اور قوم کی بت پرستی سے سخت تکلیف پہنچی تھی، حافظ ابن کثیرؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ پہلے سے ان میں باہم کوئی تعارف نہیں تھا، محض ہم خیال اور ہم فکر ہونے کی وجہ سے یہ لوگ غیر شعوری طور پر یکجا ہو گئے، شروع شروع میں یہ لوگ اپنے خیالات کے اظہار میں احتیاط بھی کرتے ہوں گے کہ کہیں ان میں کوئی شخص دوسرے خیال کا ہو اور وہ بادشاہ سے جا کر کہہ دے، مگر کچھ وقت ساتھ رہے تو اندازہ ہوا کہ سب لوگ ایک ہی شمع کے پروانے ہیں، اور سب کے دلوں میں توحید کی قندیلیں روشن ہیں، آہستہ آہستہ وہ لوگ ایک دوسرے سے گھل مل گئے، بل کہ ایک دوسرے کے ساتھ وقت

گزارنے لگے، یہاں تک کہ انھوں نے اپنی عبادت گاہ تک بنالی، یہ واقعہ چھپنے والا نہیں تھا، پہلے ایک کو اور ایک سے دوسرے کو یہاں تک کہ پورے شہر کو ان کی سرگرمیوں کا علم ہوگیا، بادشاہ تک بھی بات پہنچی، انہیں دربار میں طلب کیا گیا، ان سے پوچھا گیا کہ وہ لوگ قوم سے الگ راستہ کیوں اپنائے ہوئے ہیں، انہیں تو بادشاہ کے مذہب پر ہونا چاہئے تھا، ان کے دلوں میں بتوں کی جو ہمارے معبود ہیں اس قدر نفرت کیوں ہے؟ نوجوانوں نے جرأت وہمت کا مظاہرہ کیا، اور پوری بے خوفی کے ساتھ اپنے عقیدۂ توحید کا اعلان کردیا، قرآن کریم نے اس کی ان الفاظ میں منظر کشی کی ہے: وَرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ إِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَ مِنْ دُوْنِهٖ إِلٰهًا.(۱) ''ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کردیا جب انھوں نے کھڑے ہوکر یہ اعلان کیا کہ ہمارا رب آسمان وزمین کا رب ہے اس کے علاوہ کسی کو پکارنا غلط ہے''۔ ان نوجوانوں نے اس اعلان پر ہی اکتفا نہیں کیا بل کہ بادشاہ اور درباریوں کو بھی ایک اللہ کو ماننے اور اس کی عبادت کرنے کی دعوت دے ڈالی، یہ سن کر بادشاہ کو سخت غصہ آیا مگر فوری طور پر کوئی جسمانی سزا دینے کے بجائے اس نے یہ کیا کہ ان کے جسموں سے وہ کپڑے اتر والئے جو وہ شاہی گھرانے کا فرد ہونے کے ناطے پہنا کرتے تھے، پھر ان کو کچھ دنوں کی مہلت دی اور کہا کہ وہ مہلت کے اس وقفے میں اپنے خیالات پر نظر ثانی کریں، اگر تمہارا یہی حال رہا تو ہم سختی سے پیش آئیں گے اور جو سزا بھی اس بغاوت کی ہوگی وہ دی جائے گی۔

یہ جوان دربار شاہی سے غور وفکر کی مہلت کے ساتھ اپنے ٹھکانے پر واپس پہنچے تو سب کی رائے یہی ہوئی کہ عقیدۂ توحید سے انحراف کرنا تو مشکل ہی نہیں ناممکن ہے، اور عقیدہ پر قائم رہ کر بادشاہ کے عذاب سے بچنا بھی ممکن نہیں ہے، اگر جان بچانی ہے تو صرف ایک ہی راستہ باقی بچتا ہے کہ وطن کو خیر باد کہا جائے اور کسی ایسی جگہ کو اپنا ٹھکانہ بنایا جائے جہاں تک بادشاہ کی رسائی نہ ہوسکے۔

اصحاب کہف کا مذہب:

مفسرین نے اس موقع پر یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ ان جوانوں کا مذہب کیا تھا، آیا یہ

(۱) الکہف: ۱۴۔

یہودی تھے یا عیسائی تھے، عام مفسرین کا خیال یہ ہے کہ یہ جوان دین مسیح پر تھے، ابن کثیرؒ اس رائے کو قبول نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ لوگ دین عیسوی پر ہوتے تو یہودی ان کی ذات میں اس قدر دلچسپی نہ لیتے اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے متعلق کوئی سوال کراتے، مگر یہ کوئی مضبوط بنیاد نہیں ہے ان کو یہودی قرار دینے کی، علماء یہود نے ان کے متعلق جو سوال کیا تھا وہ صرف اس لئے کیا تھا کہ اصحاب کہف کی لمبی نیند اور بیداری کا واقعہ تاریخ کا حیرت انگیز واقعہ ہے، آنے والے نبی کو اس واقعے کا علم تو ہونا ہی چاہئے، تفسیر مظہری میں حافظ ابن اسحاقؒ کی یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ یہ جوان عیسوی مذہب پر موحّد تھے، یہ زمانہ عیسائیت کا تھا، اگر چہ بہت کم لوگ اس مذہب پر باقی رہ گئے تھے، جب یہ نوجوان بیدار ہوئے تو اس وقت شہر میں ایک عیسائی بادشاہ کی حکومت تھی۔

یہ نوجوان تعداد میں کتنے تھے، قرآن کریم نے اس کو مبہم رکھا ہے، عیسائی مذہب کے پیروکار اس واقعے کا ذکر تو کرتے تھے، لیکن صحیح تعداد ان کو بھی نہیں معلوم تھی، کوئی کہتا تھا کہ وہ تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا، کوئی پانچ بتلاتا اور کوئی سات کہتا، قرآن کریم نے اس اختلاف کو بیان کرنے کے بعد اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلوایا کہ: قُلْ رَّبِّیۡۤ اَعۡلَمُ بِعِدَّتِہِمۡ مَّا یَعۡلَمُہُمۡ اِلَّا قَلِیۡلٌ فَلَا تُمَارِ فِیۡہِمۡ اِلَّا مِرَآءً ظَاہِرًا وَّلَا تَسۡتَفۡتِ فِیۡہِمۡ مِّنۡہُمۡ اَحَدًا۔(۱) ''آپ ان سے فرمادیجئے کہ میرا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنے تھے اور کم ہی لوگ ان کی صحیح تعداد جانتے ہیں، پس آپ اس معاملے میں سرسری بحث سے آگے نہ بڑھئے اور نہ اس سلسلے میں کسی سے کچھ پوچھئے'' مفسرین نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ نجران سے عیسائیوں کا ایک وفد آیا اور اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اصحاب کہف کی تعداد کے متعلق استفسار کیا، وہ لوگ آپ سے صحیح تعداد معلوم کرنا چاہتے تھے، ان میں خود شدید اختلاف تھا بل کہ اختلاف کرنے والوں کے تین فرقے بن گئے تھے، ایک فرقہ ملکانیہ تھا جس کے نزدیک اصحاب کہف کی تعداد تین تھی، یعقوبیہ فرقہ ان کی تعداد پانچ کہتا تھا، جب کہ نسطوریہ فرقہ سات کا قائل تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کی گئی کہ آپ ان سے بات تو کیجئے، مگر سرسری طور پر، کسی ایک تعداد پر نہ خود زور دیجئے، اور نہ اس سلسلے

(۱) الکہف:۲۲۔

میں کسی سے کچھ پوچھیے اس لئے کہ واقعے کا یہ پہلو اہم نہیں ہے کہ وہ کتنے تھے، بل کہ اہم بات یہ ہے کہ کچھ نوجوان ایسے بھی تھے جنھوں نے کفر وشرک کے ماحول میں بے خوف ہوکر اپنے ایمان کی حفاظت کی، بل کہ پوری جرأت کے ساتھ اس کا اعلان بھی کیا۔

مولانا تقی عثمانی نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ عصر حاضر کے بیشتر محققین کا کہنا یہ ہے کہ وہ مشرک بادشاہ جس کے ظلم وستم سے تنگ آکر اصحاب کہف نے غار میں پناہ لی تھی، جان پٹرا تھا جو ۹۸ء سے ۱۱۷ء تک اس علاقے کا حاکم رہا ہے، اس کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ وہ بت پرستی سے انکار کرنے والوں پر سخت ظلم ڈھاتا تھا، تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ جان پٹرا نے ۱۰۶ء میں شرق اردن کا علاقہ فتح کرلیا تھا، غار دریافت ہونے کے بعد صفائی وغیرہ کے دوران جو سکّے یہاں پڑے ہوئے ملے اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ زمانہ جان پٹرا کا تھا، وہ بادشاہ جس کے عہد میں اصحاب کہف بیدار ہوئے اس کا نام جدید محققین نے تھیوڈ ڈیس بتلایا ہے جو پانچویں صدی کے آغاز میں گزرا ہے، جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا ہے کہ اس بستی کا نام جس میں اصحاب کہف رہتے تھے رقیم تھا، بادشاہ وقت نے اس علاقے پر قبضہ کرنے کے بعد اس کا نام تبدیل کردیا تھا، آج بھی جس جگہ یہ غار واقع ہے وہاں سے سو میٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی بستی ہے جس کا نام رجیب ہے، ہوسکتا ہے یہ رقیم ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہو، یہاں بدو اکثر قاف کو جیم سے اور میم کو باء سے بدل کر بولتے ہیں، حکومت اردن نے اس بستی کا نام سرکاری طور پر رقیم ہی کردیا ہے۔

عقیدہ ایمان کی سلامتی مقدم ہے:

بہ ہر حال یہ چند نوجوان دربار شاہی سے اپنے ٹھکانے پر واپس آئے تو فطری طور پر یہ سوال ان کے دلوں میں بھی تھا اور ان کی زبانوں پر بھی کہ اب کیا کیا جائے؟ بادشاہ کی بات مان کر عقیدۂ توحید ترک کر کے بت پرستی اور شرک وکفر اختیار کرلیا جائے یا صاف کہہ دیا جائے کہ ہمیں بادشاہ کی بات منظور نہیں ہے؟ اگر قوم کے رنگ میں رنگنا ہے تو اس میں دنیا کی بھلائی ہے، عزت ودولت سب کچھ ہے، یہ بھی طے ہے کہ آخرت میں اس کا برا انجام ہوگا اور وہاں بخشش کی کوئی صورت نہیں ہوگی اور اگر ہم بادشاہ کا مطالبہ ماننے سے

صاف انکار کر دیتے ہیں تو ہمیں اس کی سزا ضرور ملے گی، یہ سزا قید بامشقت بھی ہو سکتی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمیں عبرت کا نمونہ بنا کر پھانسی پر لٹکا دیا جائے یا سنگسار کر دیا جائے، دونوں صورتیں ہی تباہی اور بربادی کی ہیں، ان میں سے کسی نے تجویز پیش کی کہ اگر جسم و جان اور عقیدہ و ایمان کی سلامتی چاہتے ہو تو راہِ فرار اختیار کر لو اور کسی ایسی جگہ جا کر چھپ جاؤ جہاں بادشاہ یا اس کے آدمی کی نظر ہم پر نہ پڑے اور ہم جان کی سلامتی کے ساتھ ایمان کے راستے پر چلتے رہیں، یہ مشورہ سب کے دلوں کی آواز بن گیا اور طے پایا کہ پہاڑوں کی طرف چلتے ہیں اور کسی غار کو اپنی پناہ گاہ بنا لیتے ہیں، راستے میں ایک کتا ان کے ساتھ لگ گیا انھوں نے بڑی کوشش کی کہ کتا واپس چلا جائے ان کا پیچھا چھوڑ دے مگر وہ کسی طرح ان سے الگ نہ ہوا، پہاڑوں پر پہنچے، تلاش کے بعد ایک بڑا سا غار پسند آ گیا، غار اندر سے بڑا کشادہ ہے، ایک طرف دہانہ ہے، دوسری طرف روشنی اور ہوا کے لئے قدرتی طور پر کچھ سوراخ ہیں، جن سے ہر وقت تازہ ہوا اندر آتی جاتی رہتی ہے، غار کا دہانہ شمال وجنوب رویہ ہے، اس لئے طلوع آفتاب یا غروب آفتاب کے وقت دھوپ کی تپش سے محفوظ رہتا ہے، مگر ہلکی ہلکی روشنی برابر پہنچتی ہے، غار کی اندر سے کچھ ایسی کیفیت ہے کہ نہ اس قدر تاریکی ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے اور نہ اتنی روشنی ہے کہ کھلے میدان کا گمان ہو، یہ نوجوان غار کے اندر داخل ہوئے، ذہنی طور پر پریشان تھے اور جسمانی طور سے تھکے ہوئے تھے اس لئے لیٹتے ہی نیند کی آغوش میں چلے گئے، ان کا رفیق کتا اپنے ہاتھ پھیلائے غار کے دہانے کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا، پہاڑوں کے ہیبت ناک مناظر اور غار کی اندرونی کیفیت نے کچھ ایسی صورت حال پیدا کر دی ہے کہ اگر کوئی غار کے اندر جھانک کر دیکھے تو خوف و دہشت سے لرز جائے اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہو۔

برسوں تک یہ لوگ اسی حالت میں پڑے رہے، قرآن کریم نے یہ مدت تین سو نو سال بتلائی ہے، اگرچہ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ قرآن کے اسلوب کو سامنے رکھا جائے تو اصحاب کہف کی مدت قیام کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جا سکتی، تین سو نو سال قرآن کا بیان نہیں ہے بل کہ لوگوں کے گمان اور قیاس کی حکایت ہے، اصحاب کہف کتنے عرصے تک محوِ خواب رہے قرآن کریم نے اس کو بھی نوجوانوں کی تعداد کی طرح مبہم ہی رکھا

ہے، بہ ہر حال وہ ایک لمبی مدت تک غار کے اندر پڑے سوتے رہے، غار کی حالت اور اصحابِ کہف کے سونے کی کیفیت کا نقشہ قرآن کریم نے کچھ اس طرح کھینچا ہے: وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَزَاوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَإِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِي فَجْوَةٍ مِّنْهُ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ۔ (۱) ''اے پیغمبر! تم سورج کو دیکھو گے کہ وہ نکلتے وقت ان کے غار سے دائیں جانب بچ کر نکل جاتا ہے اور غروب کے وقت غار سے کترا کر بائیں جانب کو ہو جاتا ہے اور وہ کشادہ غار میں ہیں، یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے، ہم ان کی کروٹیں بدلتے رہتے ہیں دائیں طرف بھی اور بائیں جانب بھی اور ان کا کتا غار کے منہ پر اپنے ہاتھ پھیلائے بیٹھا ہوا ہے''۔

اصحابِ کہف کی طویل نیند سے بیداری:

ایک لمبا عرصہ گزرا، بل کہ صدیاں بیت گئیں، غار کے منظر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، شہر میں انقلابات اور تغیرات کا سلسلہ جاری رہا، ۴۴۷ء میں وہ اچانک بیدار ہو گئے، جس وقت وہ غار کی پناہ میں آئے تھے تو ملک میں بت پرست مشرک بادشاہ جان پڑا کی حکومت تھی، بیدار ہوئے تو قیصر تھیوڈیسس کی حکومت شروع ہو چکی تھی، قیصر عیسائی مذہب کا سچا پیرو کار تھا، اس نے ملک سے بت پرستی ختم کر دی تھی، لوگ ایک خدا کو ماننے لگے تھے، البتہ وہ اپنی قوم کو یہ باور کرانے میں ناکام تھا کہ موت کے بعد بھی ایک زندگی ہوگی، حشر و نشر، جزا و سزا، جنت و جہنم کے تصورات اس زمانے کے رومی باشندوں کے مابین بحث و تمحیص کا موضوع بنے ہوئے تھے، اور اکثریت ان کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھی، قیصر دعا کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ایسی نشانی ظاہر ہو جائے جس سے لوگوں کو بعث بعد الموت کا یقین آجائے۔

اتفاق کی بات ٹھیک اسی زمانے میں یہ نوجوان جاگ اٹھے، اور ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ ہم کتنی دیر سوئے ہوں گے، کسی نے کہا دن بھر، کسی نے کہا دن کا کچھ حصہ، پھر یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ہم کتنی دیر تک سوتے رہے، لمبی نیند سے بیدار ہوئے تو سب کو بھوک پیاس کا احساس ہوا، انھوں نے اپنے ایک ساتھی کو جس کا نام

(۱) الکہف: ۱۷۔

جین تھا چاندی کے چند سکے دیئے اور بازار جا کر کھانا وغیرہ لانے کے لئے کہا، ساتھ ہی یہ بھی تاکید کی کہ احتیاط کے ساتھ جانا، ایسا نہ ہو لوگ تمہیں پہچان لیں اور ہمارا راز فاش ہو جائے، اگر ہمارا معاملہ لوگوں پر منکشف ہو گیا تو وہ ہمیں سنگسار کر دیں گے یا اپنی ملت میں واپسی پر مجبور کر دیں گے، اگر ایسا ہوا تو ہم کبھی فلاح نہ پا سکیں گے۔

اہل شہر کی حیرت:

جین چھپتے چھپاتے شہر پہنچا، وہاں کے حالات دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں، سب کچھ بدل چکا تھا، سڑکیں، عمارتیں، بازار سب تبدیل ہو چکے تھے، بت پرستی کے مناظر بھی غائب تھے، اپنی حیرانگی پر قابو پاتے ہوئے وہ ایک ہوٹل پر رکا، وہاں سے چند روٹیاں خریدیں اور دوکان دار کو چاندی کا ایک سکہ دیا، جس پر ایک ایسے بادشاہ کی تصویر تھی جس کو مرے ہوئے صدیاں گزر گئیں تھیں، دوکان دار سکّہ دیکھ کر تعجب میں پڑ گیا، اس نے پوچھا تمہیں یہ سکّہ کہاں سے ملا، جین نے کہا کہ یہ میرا ہی سکّہ ہے، میں نے چرایا نہیں ہے اور نہ مجھے کسی جگہ پڑا ملا ہے، دونوں میں تکرار ہو گئی، بحث بڑھی تو بھیڑ جمع ہو گئی، نوبت کوتوال شہر تک پہنچی، کوتوال کو خیال ہوا کہ یقیناً اس نوجوان کو کہیں سے کوئی دفینہ ملا ہے، یہ سکّہ اسی دفینے کا ہے، کوتوال کا اصرار تھا کہ وہ ابھی میرے ساتھ چلے اور اس جگہ کی نشاندہی کرے جہاں سے یہ دفینہ ملا ہے، جین نے اسے یقین دلانے کی بڑی کوشش کی کہ یہ میرا سکہ ہے، میں کسی دفینے وفینے کو نہیں جانتا، کوتوال نے کہا تمہاری یہ بات کوئی بھی نہیں مانے گا، یہ سکّہ صدیوں پرانا ہے، ہم نے کبھی یہ سکہ نہیں دیکھا اور نہ اب اس طرح کے سکّوں کا چلن ہے، اس لئے صاف صاف بتلا دو کہ تم کون ہو اور اس سکّے کا کیا راز ہے، جین کے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ سب کچھ صحیح صحیح بتلا دے، چناں چہ اس نے آہستہ سے کہا کہ کل ہی تو میں اور میرے چھ ساتھی اس شہر سے بھاگ کر گئے تھے اور ہم نے ظالم بادشاہ کے ظلم وستم سے بچنے کے لئے ایک غار میں پناہ لی تھی، یہ سن کر کوتوال حیران رہ گیا، وہ جین کے ساتھ غار کی طرف چلا، لوگوں کی بھیڑ بھی ساتھ تھی، غار پر پہنچ کر یہ بات پوری طرح محقق ہو گئی کہ یہ لوگ واقعی جان پٹرا نامی بادشاہ کے زمانے کے ہیں، موجودہ حکمراں

قیصر تھیوڈیسس کو اس واقعہ کی خبر دی گئی وہ خود آ کر ان سے ملا، اور ان سے برکت حاصل کی، اس کے بعد یہ سب جوان غار میں جا کر لیٹ گئے اور وفات پا گئے، اس واقعے کو دیکھ کر لوگوں کو یقین آ گیا کہ واقعی زندگی کے بعد موت اور موت کے بعد زندگی برحق ہے، پھر بادشاہ کے حکم سے وہاں ایک معبد (ہیکل) تعمیر کر دیا گیا یہ بازنطینی طرز کا ایک معبد تھا، عبدالملک بن مروان کے زمانے میں اسے مسجد میں تبدیل کر دیا گیا۔

قومِ سبا اور سیل عرم

قوم سبا کا محل وقوع:

قرآن کریم میں اقوام وملل کے جو واقعات بھی بیان کئے گئے ہیں وہ ان کے عروج وزوال کی داستانیں ہیں، ہر واقعے سے یہ سبق ملتا ہے کہ انسان کو ہر حال میں اپنے خالق ومالک کے بتلائے ہوئے راستے پر چلنا چاہئے، اس کی دی ہوئی نعمتوں کی قدر کرنی چاہئے اور اُن پر شکر گزار ہونا چاہئے، جو قومیں نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتیں بل کہ بغاوت اور سرکشی کے راستے پر چلتی ہیں ان کا انجام نہایت دردناک اور عبرت انگیز ہوتا ہے، قوم سبا کا حال بھی یہی تھا، اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر انعامات کی بے پناہ بارشیں کیں، ایک لمبے عرصے تک یہ قوم ہر طرح کے سامانِ عیش وعشرت سے مالا مال رہی اور یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہا جب تک یہ قوم اپنے منعم حقیقی کا شکر ادا کرتی رہی اور اس کے بتلائے ہوئے راستے پر چلتی رہی، ترفہ اور خوش حالی نے ان میں اللہ سے غفلت پیدا کر دی اور یہ غفلت اس کی ذات سے انکار تک پہنچی تو اللہ رب العزت نے ان کی اصلاح کے لئے پے در پے تیرہ نبی بھیجے جنھوں نے ان کو سمجھانے اور راہِ راست پر لانے کی پوری کوشش کی، مگر انھوں نے حق بات سے اپنے کان بند کر لئے اور مشاہدۂ حق سے اپنی آنکھیں موند لیں، جب ان کا کفر وعناد اپنے عروج کو پہنچ گیا تو سیلاب بلا خیز نے ان کو گھیر لیا، کھیتیاں، باغات، مکانات سب پانی کے خوف ناک ریلوں میں بہہ گئے، جو قوم دنیا کی متمدن اور ترقی یافتہ اقوام میں

سرفہرست تھی وہ ایک ہی رات میں دانے دانے کو محتاج ہوگئی۔

قوم سبا یمن میں آباد تھی، ایک زمانے میں اس کے بادشاہوں کا لقب تبع بھی رہا ہے، ملکہ بلقیس کا تعلق بھی اسی قوم سے تھا، حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصے میں ان کا ذکر ہو چکا ہے، سبا کا عروج یمن کا ایک روشن باب ہے، تمام قدیم وجدید مؤرخین اس کی بے مثال تمدنی ترقیات پر انگشت بدنداں نظر آتے ہیں اور اس سے زیادہ حیرت ان کو اس وقت ہوتی ہے جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اس قوم کی تمام ترقیات چشم زدن میں تاریخ کا حصہ بن گئیں، مؤرخین نے قوم سبا کی عمارتوں کا بہ طور خاص تذکرہ کیا ہے، ان کا قصر غمدان بے مثال کاریگری اور صناعی کا نمونہ تھا، اس قصر کی بیس منزلیں تھیں اور آخری منزل بیش قیمت آب گینوں سے بنائی گئی تھی، سبا کی حدود حکومت میں سونے اور جواہرات کی کانیں تھیں، حضرموت اور یمن کا علاقہ خوشبودار اشیاء کی پیداوار کے لئے شہرت رکھتا تھا، عمان اور بحرین کے سمندروں سے جو موتی نکلتے تھے پوری دنیا میں ان کی مثال نہیں ملتی تھی، اس ملک کے ساحل پورے علاقے کی پیداوار کے لئے منڈی کی شکل اختیار کر گئے تھے، شام، مصر، حبشہ، ہندوستان اور یورپ سے تجارت کے واحد اجارہ دار سبا کے تاجر تھے۔

قوم سبا کا تعارف:

قوم سبا کے واقعات ذکر کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ اس قوم کا کچھ تعارف ہو جائے، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے لکھا ہے کہ مؤرخین کے اعتبار سے سبا کی حکومت دو طبقات میں منقسم رہی ہے، پھر دونوں طبقات کے بھی دو دو دور الگ الگ ہوئے ہیں، طبقہ اولیٰ کا پہلا دور تقریباً ۱۱۰۰ برس قبل مسیح سے شروع ہو کر ۸۵۰ قبل مسیح تک پھیلا ہوا ہے، یہ ان کے عروج کا زمانہ ہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے کی ملکہ سبا کا تعلق بھی اسی زمانے سے ہے، اس طبقے کا دوسرا دور ۸۵۰ قبل مسیح سے شروع ہو کر ۱۱۵ قبل مسیح تک رہا ہے، قرآن کریم نے اس قوم کے عروج وزوال کی جو داستان سورۂ سبا میں بیان کی ہے اس کا تعلق اسی دور سے ہے، اس تباہی وبربادی کے بعد بھی یہ قوم باقی رہی، طبقہ ثانی کا آغاز ۱۱۵ قبل مسیح سے ہوتا ہے اور ۵۲۵ء پر ختم ہوتا ہے، قرآن کریم کی

سورۂ دخان اور سورۂ ق میں جن اصحاب تبّع کا ذکر ہے ان کا تعلق طبقہ ثانی سے ہے، غرضیکہ اس قوم کی داستان پندرہ صدیوں کا احاطہ کرتی نظر آتی ہے۔

مسند امام احمد بن حنبلؒ میں حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ سے ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ ایک صحابی نے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ قرآن کریم میں سبا کا ذکر آیا ہے، یہ کسی مرد کا نام ہے یا عورت کا، یا زمین کے کسی حصے کا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ ایک مرد کا نام ہے، جس کے دس لڑکے تھے، جن میں سے چھ یمن میں آباد ہوئے، ان میں سے ہر ایک کے نام سے ایک قبیلہ وجود میں آیا، چار لڑکے شام میں جا کر آباد ہوئے وہاں بھی ان کی نسل چلی اور ان کے ناموں سے قبیلے وجود میں آئے، مؤرخین عرب کہتے ہیں کہ سبا لقب ہے اور نام عمرو یا عبد شمس ہے، دور حاضر کے مؤرخین اسی کو صحیح سمجھتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ سبا کے مفہوم میں تجارت کے معنی داخل ہیں، کیوں کہ قوم سبا تجارت پیشہ تھی اس لئے سبا کے نام سے مشہور ہوئی، مؤرخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ سبا عبد شمس نے اپنے زمانے میں نبی آخر الزماں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد اور نبوت کی بشارت سنائی تھی، ہوسکتا ہے ان کو اس کا علم قدیم آسمانی صحیفوں سے ہوا ہو یا نجومیوں اور کاہنوں نے ان کو اس کی خبر دی ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں انھوں نے کچھ اشعار بھی کہے تھے جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ذکر ہے اور اس آرزو کا اظہار بھی ہے کہ کاش میں وہ زمانہ پاؤں، خود بھی دولت ایمان سے سرفراز ہوں اور اپنی قوم کو بھی دائرۂ ایمان میں داخل کروں۔

قوم سبا کی معاشی اور تمدنی ترقی:

اب آیئے اس قوم کی تمدنی اور معاشی ترقی کی طرف، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ فرماتے ہیں کہ عرب میں مستقل دریا ناپید ہیں، اکثر ملکوں میں بارش کے پانی پر گزر ہے، کہیں کہیں پہاڑی چشمے بھی ہیں، بارش کا پانی ہو یا پہاڑی چشموں کا، تمام پانی بہہ کر وادی کے ریگستان میں جذب ہو کر ضائع ہوجاتا تھا، قوم سبا نے اس پانی کو کام میں لانے اور زراعت کو سیراب کرنے کے لئے بند بنانے کا منصوبہ بنایا، کہتے ہیں کہ اس

زمانے میں جب لوگ انجینئرنگ کی الف با سے بھی واقف نہیں تھا قوم سبا کے ماہر کاریگروں اور معماروں نے اپنی اعلا درجے کی دماغی اور فنی صلاحیتیں بروئے کار لاکر ملک کے مختلف حصوں میں سو بند تعمیر کیے جن کو آج کی اصطلاح میں ڈیم کہا جاتا ہے، ان میں سب سے بڑا ڈیم سد مآرب تھا، جو اس وقت کے دارالحکومت مآرب کے قریب بنایا گیا تھا، موجودہ جغرافیے کے اعتبار سے یہ ڈیم یمن کی راجدھانی صنعاء سے ڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر ہے۔

سدّ مآرب:

سدّ مآرب کا ذکر کرتے ہوئے تمام جدید وقدیم مؤرخین اس حقیقت کے اعتراف واظہار میں متفق نظر آتے ہیں کہ سبا کو انجینئرنگ اور فن تعمیر میں بڑا کمال حاصل تھا، اور اس زمانے میں کوئی ان کا ہم سر نہیں تھا، مآرب اس وقت کے دارالحکومت کا نام تھا، اس شہر کے جنوب میں دائیں بائیں دو پہاڑ تھے جو کوہ ابلق کے نام سے مشہور ہیں، ان پہاڑوں کے درمیان ایک لمبی چوڑی وادی ہے جسے وادیِ اذنیہ کہتے ہیں، جب طوفانی بارش ہوتی، یا پہاڑی چشموں سے پانی ابل کر گرتا تو پوری وادی جل تھل ہوجاتی، بسا اوقات یہ پانی شہر میں داخل ہوجاتا، مکانوں اور مکینوں کو سخت نقصان پہنچاتا، یہ حالات دیکھ کر ۸۰۰ برس قبل مسیح کے حکمرانوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ان دونوں پہاڑوں کے درمیان ایک بند باندھ دیا جائے تاکہ بارش اور چشموں کا زائد پانی وادی میں داخل نہ ہو، بل کہ محفوظ ہوجائے اور بہ وقت ضرورت اسے کام میں لایا جائے، مؤرخین نے لکھا ہے کہ بند کی تعمیر کا یہ محیّر العقول اور عظیم الشان واقعہ ملکۂ سبا کے دور حکومت کا ہے، انھوں نے ہی یہ فیصلہ کیا تھا کہ دونوں پہاڑوں کے درمیان ایک ایسا بند بنادیا جائے جو پانی کو آگے بڑھنے سے روک سکے، ارض القرآن کے مصنف علامہ سید سلیمان ندوی نے ایک یورپین سیّاح ازماؤ کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ ایک سو پچاس فٹ طویل اور پچاس فٹ چوڑی دیوار ہے جس کا بڑا حصہ منہدم ہوچکا ہے، کچھ حصہ باقی ہے جسے لوگ آج بھی دیکھنے جاتے ہیں اور اس زمانے کی کاریگری دیکھ کر دانتوں تلے انگلیاں دبالیتے ہیں۔

سدِّ مآرب کی تعمیر سے یہ فائدہ ہوا کہ بارش اور قدرتی پہاڑی چشموں کا جو پانی آئے دن تباہی مچاتا رہتا تھا وہ ایک جگہ جمع ہونے لگا، ڈیم کی تعمیر کچھ اس طرح کی گئی تھی کہ اس کی دیوار میں تین بڑے دروازے اور نوے چھوٹی چھوٹی آہنی کھڑکیاں بنائی گئیں تھیں اور اوپر تلے ان کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا، پہلے اوپر کے درجے کا دروازہ اور کھڑکیاں کھولی جاتیں، جب پہلے درجے کا پانی ختم ہو جاتا تب دوسرا درجہ کھولا جاتا، بالکل آخر میں تیسرے درجے کا نمبر آتا، دروازوں اور کھڑکیوں کا پانی نکل کر دیوار کے نیچے بنے ہوئے ایک بڑے تالاب میں جمع ہوتا، پھر اس پانی کو بارہ مختلف نہروں میں چھوڑا جاتا، جو شہر کے مختلف اطراف میں پھیلی ہوئی تھیں، ہر نہر سے کول اور راج بہے نکال کر ڈیم کے پانی کو دور دور تک پہنچانے کی کوشش کی گئی تھی۔

باغات، نہریں اور چشمے:

شہر کے اطراف میں باغات کا ایک طویل سلسلہ تھا، مؤرخین کے مطابق یہ سلسلہ تین سو میل تک پھیلا ہوا تھا، آب پاشی کا یہ نظام کچھ اس طرح بنایا گیا تھا کہ تمام باغات اس پانی سے مستفید ہوتے تھے، یہ پانی اس لمبے چوڑے علاقے میں بسنے والوں کی خانگی ضرورتیں بھی پوری کر رہا تھا، قرآن کریم نے باغات کے اس وسیع سلسلے کو دو جنتوں سے تعبیر کیا ہے جو شہر کی دائیں اور بائیں جانب میں واقع تھیں، ان باغات میں ہر طرح کے پھلوں، میووں اور خوشبودار چیزوں مثلاً دار چینی اور عود وغیرہ کے درخت لگے ہوئے تھے، اور یہ درخت اس کثرت سے پھل دیتے تھے کہ اگر کوئی شخص اپنے سر پر خالی ٹوکری رکھ کر ان درختوں کے نیچے سے گزرتا تو کچھ ہی دیر میں وہ ٹوکری خود بہ خود ٹوٹ کر گرنے والے پھلوں سے بھر جاتی، تین سو میل تک پھیلے ہوئے یہ باغات اس قدر گنجان تھے کہ ان کے نیچے سے گزرنے والوں کو دھوپ کا احساس تک نہ ہوتا، یمن سے شام اور مصر تک جانے والے تجارتی قافلے جب ان باغوں کے درمیان میں بنی ہوئی شاہ راہوں سے گزرتے تو انہیں سفر کی کلفت کا کچھ بھی احساس نہ ہوتا، اس طویل شاہ راہ پر جگہ جگہ کارواں سراؤں کا نظام تھا، لوگ ان سراؤں میں آرام کرتے، نہروں کا ٹھنڈا پانی پیتے، پھلوں اور خشک میوہ

جات سے شکم سیر ہوتے، پورے سفر میں مسافروں کو یہ خیال تک نہ آتا تھا کہ وہ حالت سفر میں ہیں، یا گھر میں ہیں، آس پاس کے ملکوں کے باشندے اس شہر کی خوش حالی اور باشندگان شہر کی خوش قسمتی پر رشک کیا کرتے تھے، شہر کی فضا نہایت معتدل، لطیف اور صحت افزا تھی، مچھر، مکھی، پسو، سانپ، بچھو جیسے موذی حشرات الارض اور جانوروں کا وجود تک نہ تھا، باہر سے کوئی مریض سفر کر کے اس شہر میں داخل ہوتا تو وہ صحت یاب ہو کر واپس جاتا، اس شہر کی خوبیوں کا کیا ٹھکانہ ہوگا جس کو خود رب کریم نے اپنی کتاب میں بلدۃ طیبہ (پاکیزہ شہر) کہا ہو، اور جس کے باغوں کو جنتان (دو جنتوں) سے تعبیر کیا ہو۔

جب یہ شہر اپنی مادّی ترقی میں نقطۂ عروج کو پہنچ گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے باشندوں سے کہا کہ: كُلُوا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهُ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَرَبٌّ غَفُورٌ. (۱) ''تم اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے اس رزق کو کھاؤ، اور اس کا شکر بھی ادا کرتے رہو، یہ پاکیزہ شہر ہے، اور تمہارا رب مغفرت کرنے والا ہے'' آخری دو جملوں میں دنیاوی نعمتوں پر شکر ادا کرنے کی صورت میں اخروی نعمتوں کا وعدہ بھی کیا گیا ہے، اور لفظ غفور سے یہ اشارہ بھی کر دیا گیا ہے کہ اگر کبھی اتفاقی طور پر شکر گزاری میں کمی یا کچھ غفلت اور کوتاہی ہو بھی گئی تو اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا بھی ہے۔

نعمتوں کی قدر دانی اور جذبۂ شکر گزاری:

اہل سبا ایک عرصے تک تو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ان نعمتوں کی قدر دانی کرتے رہے، عبادتِ الٰہی میں لگے رہے اور شکر بھی ادا کرتے رہے، لیکن اس خوش حالی اور فارغ البالی نے بہت جلد ان کے خیالات بدل دیئے، خیالات بدلے تو طرز عمل میں بھی تغیر پیدا ہوا، جو قوم ان نعمتوں کو عطیۂ الٰہی سمجھ کر ان پر شکر ادا کرتے نہیں تھکتی تھی وہ اسے اپنی محنتوں کا ثمر سمجھ کبر و غرور میں مبتلا ہو گئی، نوبت یہاں تک پہنچی کہ انھوں نے دین حق کو بھی خیر باد کہہ دیا، دین سے رشتہ منقطع ہوا تو پورا معاشرہ رذائل اور منکرات سے آلودہ ہو گیا، اللہ تعالیٰ نے فوراً ہی گرفت نہیں کی بل کہ ان کو سدھرنے کا موقع بھی دیا، ان کی اصلاح کے لئے وقتاً فوقتاً تیرہ نبی بھیجے، جنھوں نے پوری کوشش کی کہ یہ بھٹکے ہوئے لوگ پھر راہ راست پر

(۱) سبا:۱۵۔

آجائیں، جس دین پر یہ پہلے تھے اسی دین سے ان کا رشتہ پھر استوار ہو جائے، مگر یہ لوگ دولت وثروت کے نشے میں اس قدر بدمست تھے کہ انبیاء کی نصیحتیں ایک کان سے سنتے دوسرے کان سے نکال دیتے، ان کا مزاج بھی وہی بن گیا جو ان سے پہلی قوموں کا تھا کہ جب ان پر نعمتیں مکمل ہوگئیں تو کفر وانکار پر اتر آئے، قدرت کا قانون مہلت کا ہے، سو اہل سبا کو بھی مہلت دی گئی، اور جب مہلت کی مدت پوری ہوگئی تو ان پر وہ عذاب نازل ہوا جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔

پانی کا سیلاب:

اہل مآرب کو سدّ مآرب کی پختگی اور مضبوطی پر پورا یقین تھا، وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ جو دیوار ان کے ماہرین فن نے نہایت مضبوط اور پختہ بنائی ہے وہ پانی کے ایک ریلے میں خس وخاشاک کی طرح بہہ جائے گی، قرآن کریم نے اس عذاب کے متعلق کہا ہے کہ: فَأَعْرَضُوا فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ۔(۱) ''جب انھوں نے روگردانی کی تو ہم نے ان پر سیلِ عرم چھوڑ دیا'' عرم کے معنی بند کے ہیں، اس سیلاب کو عرم اس لئے کہا گیا ہے کہ جو بند ان کی خوش حالی کا ضامن تھا وہی ان کی تباہی وبربادی کا ذریعہ بن گیا، اس سیلاب کی کچھ تفصیلات حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ اور دوسرے مفسرین علماء سے کچھ اس طرح منقول ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے قوم سبا کو سزا دینے کے لئے سدّ مآرب کو توڑ کر سیلاب سے تباہ کرنے کا ارادہ کیا تو اس بند کے اردگرد ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں چوہے پیدا کردئے جنھوں نے دیوار کی جڑوں کو کھوکھلا کرنا شروع کردیا، جب بارش کے زمانے میں بند میں پانی جمع ہوگیا تو بند کی کمزور اور کھوکھلی دیواریں پانی کا دباؤ برداشت نہ کرسکیں اور جگہ جگہ سے گر گئیں، پانی ٹوٹی ہوئی دیواروں سے نکل کر مآرب شہر میں داخل ہوگیا، تمام مکانات منہدم ہوگئے، درخت جڑوں سے اکھڑ گئے، بعض سمجھ دار لوگ چوہوں کی چلت پھرت دیکھ کر سمجھ گئے تھے کہ قوم پر تباہی آنے والی ہے، مفسرین نے لکھا ہے کہ ان کی کتابوں میں یہ بات لکھی ہوئی تھی کہ اس بند کی تباہی چوہوں کے ذریعے ہوگی، جو لوگ یہ بات جانتے تھے وہ پہلے ہی ترک مکانی کرکے کسی اور طرف نکل گئے، جو باقی بچے تھے وہ

(۱) سبا:۱۶۔

سیلاب کی نظر ہوگئے، دیکھتے ہی دیکھتے پورا شہر ویران ہوگیا، باغات اجڑ گئے، نہریں خشک ہوگئیں، کچھ ہی دنوں میں ہرے بھرے درختوں کی جگہ خاردار اور بدمزہ و بدبودار پھلوں کے خودرو درخت اُگ آئے، قرآن کریم میں ہے: ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ.(۱) ''یہ سزا ہم نے ان کو اس لئے دی کہ انھوں نے کفر کیا، اور ہم بہت کفر کرنے والے کے سوا کسی کو سزا نہیں دیتے''۔

اہلِ سبا کو حاصل ایک اور نعمت:

قرآن کریم نے اس قصے کے آخر میں ایک اور نعمت کا ذکر کیا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ اہل سبا کے تجارت پیشہ لوگ شام کا سفر بہ کثرت کیا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے مآرب اور ملک شام کے درمیان کچھ ایسی بستیاں بسا دی تھیں جو لب سڑک تھیں، ان بستیوں کا فائدہ یہ تھا کہ تاجر حضرات اپنے گھروں سے نکل کر مسلسل سفر کرنے کی زحمت میں مبتلا نہ ہوتے بلکہ ان بستیوں میں آرام کرتے ہوئے گزرتے، یہ بستیاں اس قدر متوازی اور مساوی فاصلوں پر بنائی گئیں تھیں کہ ایک مقررہ وقت کے اندر لوگ ایک بستی سے دوسری بستی تک پہنچ جاتے مثلاً کوئی شخص صبح سویرے ایک جگہ سے نکلتا تو دوپہر تک دوسری جگہ پہنچ جاتا وہاں کھانے وانے سے فارغ ہوکر کچھ دیر آرام کرتا، پھر چلتا تو غروب آفتاب تک دوسری بستی میں پہنچ جاتا، پورا سفر آرام سے گزر جاتا، بالکل ایسا محسوس ہوتا کہ وہ سفر میں نہ ہوں بل کہ اپنے گھر میں ہوں، پھر یہ راستے محفوظ بھی تھے، کسی چور ڈاکو کا گزر نہ تھا، دن رات کے کسی بھی حصے میں لوگ بے جھجک سفر کیا کرتے تھے، اہل سبا کو یہ سہولتیں پسند نہ آئیں، کہنے لگے کہ یہ بھی کوئی سفر ہے، سفر تو وہ اچھا ہوتا ہے جس میں کلفتیں ہوں، پریشانیاں ہو، دُعا کرنے لگے کہ اے اللہ ہمارے سفر میں دوری پیدا کردے، قریب قریب کی بستیاں نہ رہیں، جنگل بیابان اور دشوار گزار راستے بنادے تاکہ کچھ تو سفر کی محنت اور مشقت کا ذائقہ چکھیں، ان کی یہ دُعا اس طرح قبول ہوئی کہ پوری قوم تباہ و برباد ہوگئی، کچھ ہلاک ہوگئے، کچھ دوسرے ملکوں میں جا کر بس گئے، بستیاں ویران ہوگئیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''قوم سبا کے عروج و زوال کی داستان میں اس شخص کے لئے بڑی نشانی اور عبرت ہے جو نہایت شکر کرنے والا اور انتہائی صبر کرنے والا ہے''۔

(۱) سبا:۱۷۔

اصحاب الاخدود

اہل ایمان کی آزمائش:

اخدود کہتے ہیں گڑھے کو، کیوں کہ اس واقعے میں بیان کیا گیا ہے کہ بادشاہِ وقت نے اہلِ ایمان کو نذرِ آتش کرنے کے لئے آگ جلائی تھی اور ان کو ایمان لانے کی پاداش میں زندہ جلا دیا تھا، اس لئے ان ظالموں کو اصحاب الاخدود یعنی گڑھے والے کہا گیا ہے، اس سورت کا نام جس میں یہ واقعہ مجملاً بیان کیا گیا ہے بروج ہے اور یہ قرآن کریم کے آخری پارے میں واقع ہے، اس واقعے کی تفصیل صحیح مسلم میں بھی ہے، اور مشہور مؤرخ محمد ابن اسحاق واقدیؒ نے بھی مفسر محمد بن کعب سے نقل کی ہے، یہ واقعہ شام اور حجاز کے درمیان واقع نجران میں پیش آیا، یہاں بت پرست اور مشرک رہتے تھے، قریب ہی ایک بستی میں ایک ساحر بھی تھا جو نجران کے لڑکوں کو سحر سکھلایا کرتا تھا، کچھ دنوں کے بعد ایک راہب نجران اور ساحر کی بستی کے درمیان کہیں سے آکر رہنے لگا، مؤرخین نے اس کا نام میمون لکھا ہے، یہ شخص دین عیسائیت پر تھا، جو لڑکے ساحر سے جادو سیکھتے تھے ان میں عبداللہ نامی ایک لڑکا بھی تھا، ایک دن عبداللہ راہب کے خیمے کے قریب سے گزرا تو میل ملاقات کے لئے اندر چلا گیا، اس وقت راہب نماز میں مشغول تھا، عبداللہ کو راہب کا یہ طریقۂ عبادت بے حد پسند آیا، وہ اس کے پاس آنے جانے لگا، اور اس سے دین سیکھنے لگا، عبداللہ کے شوق اور راہب کی توجہ سے وہ بہت جلد عیسائی مذہب کا عالم بن گیا، مگر ابھی تک یہ راز کسی پر ظاہر نہیں ہوا تھا کہ عبداللہ راہب سے اس کا دین سیکھ رہا ہے، بلکہ اس کا باپ تو مر تو یہ سمجھتا تھا کہ میرا بیٹا سحر سیکھنے کے لئے راہب کے پاس جاتا ہے، کچھ عرصے بعد عبداللہ نے راہب سے یہ درخواست کی کہ اسے اسم اعظم بتلا دیں، راہب نے کہا کہ میں تمہیں اسم اعظم بتلا تو سکتا ہوں، مگر تمہارے لئے اس کا سیکھنا ابھی مناسب نہیں ہے، تم اسے برداشت نہیں کر پاؤ گے اور اس کو غلط استعمال کرو گے، خود بھی پریشان ہو گے اور مجھے

بھی پریشانی میں مبتلا کروگے، ہوسکتا ہے کہ تمہاری نادانی سے پوری قوم ہی مصیبت کا شکار ہوجائے، لڑکے نے وعدہ بھی کیا کہ وہ اس راز کو اپنی ذات تک محدود رکھے گا لیکن جہاں دیدہ راہب نے لڑکے کی بات نہیں مانی۔

عبداللہ کو راہب کی معذرت کے پیچھے اس کا بخل نظر آیا، اس نے سوچا کہ راہب محض اپنی کنجوسی کی وجہ سے اُسے اسم اعظم نہیں سکھلا رہا ہے، اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خود ہی اسم اعظم کا علم حاصل کرے گا، اس کے بعد اس نے ایک گڑھے میں آگ جلائی، تیروں کا ایک گٹھا لیا، وہ ایک تیر پکڑتا اور اس پر اللہ کا کوئی نام پڑھ کر پھونکتا اور اسے آگ میں ڈالتا، تیر آگ میں پہنچتے ہی راکھ بن جاتا، اس طرح بہت سے تیر آگ میں پہنچے اور جل کر خاک ہوگئے، صرف ایک تیر ایسا بچا جو آگ میں پہنچنے کے بعد بھی سلامت رہا، عبداللہ سمجھ گیا کہ اللہ کا جو نام پڑھ کر میں نے تیر چلایا تھا وہی اسم اعظم ہے، عبداللہ نے اپنے استاذ راہب کو یہ بات بتلائی، استاذ نے نصیحت کی کہ تم اسم اعظم کی حفاظت کرنا اور اس کو خلق خدا کے نفع کے لئے استعمال کرنا۔

بادشاہ وقت درپئے آزار:

عبداللہ ذہین بھی تھا، عالم بھی تھا، موحد بھی تھا اور عیسائیت کا پیروکار بھی تھا، اسے اپنی بستی کے لوگوں کی بت پرستی اور شرک پسند نہیں تھا، وہ چاہتا تھا کہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائیں، بت پرستی ترک کردیں اور راہب کی طرح ایک اللہ کی عبادت کریں، اس نے فیصلہ کیا کہ میں اسم اعظم کے ذریعے دین حق کی تبلیغ کروں گا، اس کے بعد وہ مریضوں اور پریشان حال لوگوں کی تلاش میں رہنے لگا، بستی میں اسے کوئی بیمار یا مصیبت زدہ نظر آتا تو وہ اس سے کہتا کہ میں تمہاری بیماری ختم کردوں گا یا تمہیں اس مصیبت اور تکلیف سے چھٹکارا دلادوں گا، اس کے بدلے میں تمہیں بت پرستی چھوڑنی ہوگی اور اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان لانا ہوگا، پریشان حال لوگ عبداللہ کی بات مان لیتے، عبداللہ اسم اعظم پڑھ کر دُعا کرتا، لوگ تندرست ہونے لگے اور شرط کے مطابق دائرۂ ایمان میں بھی داخل ہونے لگے، ایمان لانے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا تو یہ بات پہلے بستی

کے لوگوں میں عام ہوئی، پھر بادشاہ تک پہنچی، بادشاہ نے عبداللہ کو بلاکر کہا کہ تم میرے باپ دادا کے دین کی مخالفت کر رہے ہو، اس جرم میں تمہیں قتل بھی کیا جاسکتا ہے، عبداللہ نے بے خوفی سے کہا کہ تم مجھے قتل کرنے پر قادر نہیں ہو چاہے کتنی بھی کوشش کرلو، بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے پہاڑ سے نیچے پھینک کر ہلاک کر دیا جائے، لوگوں نے پہاڑ پر لے جا کر نیچے گرادیا، لیکن عبداللہ کو خراش تک نہیں آئی، بادشاہ نے کہا کہ اسے دریا میں ڈبو دیا جائے، لوگوں نے بیچ سمندر میں لے جا کر پانی کے حوالے کر دیا، وہ وہاں سے بھی زندہ سلامت واپس آ گیا، بادشاہ نے حکم دیا کہ آگ دہکائی جائے اور اس لڑکے کو آگ کے حوالے کیا جائے، حکم کی تعمیل کی گئی، مگر عبداللہ آگ سے بھی زندہ نکل آیا، یہ دیکھ کر بادشاہ حیران بھی ہوا اور پریشان بھی، عبداللہ نے کہا کہ تم مجھے کبھی قتل نہیں کر سکتے ہاں اگر تم اللہ کا نام لے کر مجھے قتل کرو گے تو بے شک میں مارا جاؤں گا، بادشاہ نے ایسا ہی کیا اور عبداللہ قتل ہو گیا۔

نجران کے لوگوں نے یہ منظر دیکھا تو انہیں یقین ہو گیا کہ عبداللہ حق پر تھا اور اسی کا دین سچا ہے، تمام لوگ اسی وقت ایمان لے آئے، اس طرح نجران میں شرک کا خاتمہ ہو گیا اور نصرانیت غالب آگئی، یمن کے بادشاہ کو جو یہودی مذہب کا پیروکار تھا اس واقعے کی خبر ہوئی، اسے سخت غصہ آیا وہ ایک بڑا لشکر لے کر نجران کی طرف بڑھا، اس کا ارادہ تھا کہ وہ نجران کے لوگوں کو نصرانیت سے تائب ہو کر یہودی بننے کے لئے کہے گا، اگر انھوں نے اس کی بات نہیں مانی اور اس نئے دین پر ہی قائم رہے تو وہ ان کو قتل کر دے گا، شاہ یمن اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ نجران میں داخل ہوا، اور لوگوں سے کہا کہ وہ اسی وقت نصرانیت سے توبہ کریں اور یہودی مذہب قبول کرلیں ورنہ دردناک سزا کے لئے تیار ہو جائیں، نجران کے لوگوں نے دل سے نصرانیت قبول کی تھی اس لئے انھوں نے یہودی بننے سے صاف انکار کر دیا، بادشاہ نے اپنے لوگوں کو حکم دیا کہ گڑھے کھودے جائیں اور ان میں آگ دہکائی جائے، جب گڑھے کُھد گئے اور ان میں آگ دہکنے لگی تو بادشاہ نے پھر کہا کہ ان کے لئے زندہ رہنے کا آخری موقع ہے، نجران کے یہ لوگ ایمان پر ثابت قدم رہے، انھوں نے عارضی زندگی کے مقابلے میں دائمی زندگی اور اس کی راحتوں کو ترجیح دی،

بادشاہ کے لوگوں نے تمام بوڑھوں، جوانوں، عورتوں، بچوں کو پکڑ پکڑ کر آگ کے حوالے کر دیا اس طرح وہ لوگ زندہ جل گئے مگر انھوں نے ایمان کا سودا نہیں کیا۔

واقعات کی منظر کشی:

قرآن کریم نے سورۂ بروج میں اس واقعے کی منظر کشی کچھ اس طرح کی ہے ''قسم ہے آسمان کی جس میں بُرج ہیں، اور قسم ہے اس دن کی جس کا وعدہ ہے، اور قسم ہے اس دن کی جس میں لوگوں کی حاضری ہوتی ہے گڑھے کھودنے والے اور خوفناک آگ جلانے والے ملعون ہوئے، جس وقت وہ آگ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور جو کچھ وہ ایمان والوں کے ساتھ ظلم وستم کر رہے تھے اس کو دیکھ رہے تھے، اور وہ صرف اس بات کا بدلہ لے رہے تھے کہ (جن لوگوں کو آگ میں ڈالا گیا) وہ اللہ پر ایمان لائے تھے جو زبردست ہے، لائق حمد ہے آسمانوں اور زمین میں اسی کی حکومت ہے، اور اللہ ہر چیز کو دیکھنے والا ہے، جن لوگوں نے مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کو ان کے دین سے بھگانے کی کوشش کی اور اپنی اس حرکت سے تائب نہیں ہوئے ان کے لئے جہنم کا عذاب ہے، اور ان کے لئے آگ کا عذاب ہے، اور جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیا ان کے لئے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، یہی بڑی کامیابی ہے، بے شک تیرے رب کی پکڑ سخت ہے، بے شک وہی پہلی مرتبہ کرتا ہے اور وہی اس کا اعادہ کرتا ہے''۔

اصحاب الفیل

ہاتھی والوں کا قصہ:

قرآن کریم کے آخری پارے میں سورۂ الفیل ہے، جس میں نہایت اختصار کے ساتھ اصحاب الفیل (ہاتھی والوں) کا قصہ بیان کیا گیا ہے، سورت کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحٰبِ الْفِيلِ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ وَّأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيلٍ

فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُوْلٍ.(۱) ''کیا آپ کو معلوم نہیں آپ کے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا، کیا ان کی تدبیر کو سرتاپا غلط نہیں کر دیا، اور ان پر پرندوں کے غول بھیجے، جو ان لوگوں پر کنکر کی پتھریاں پھینکتے تھے، سو اللہ نے ان کو کھائے ہوئے بھوسے کی طرح کر دیا''۔

اصحاب الفیل کا واقعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے سال یعنی نبوت سے چالیس سال قبل پیش آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مکہ مکرمہ میں ہوئی، اور اس واقعے کا تعلق بھی مکہ مکرمہ سے ہے، حضرات محدثین نے اس واقعے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ قرار دیا ہے، لیکن کیوں کہ معجزات کا ظہور اعلان نبوت کے بعد نبی کی تائید کے لئے ہوتا ہے اور یہ واقعہ نبوت سے قبل پیش آیا اس لئے محدثین نے اس کو معجزے کے بجائے ارہاص کا نام دیا ہے، لغت میں ارہاص سنگ بنیاد کو کہتے ہیں، اور اصطلاح محدثین میں ان واقعات کو ارہاص کہا جاتا ہے جو کسی نبی کی آمد سے پہلے خرقِ عادت کے طور پر پیش آتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے قبل اور دعوئ نبوت سے پہلے کچھ ایسی نشانیاں اور علامات ظاہر ہوئی ہیں جو نبوت کے مبادی اور مقدمات قرار دی گئی ہیں، یہ واقعہ بھی اسی قبیل سے ہے جو محرم الحرام میں پیش آیا اور اس کے ٹھیک پچپن دن کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیائے آب وگل میں آنکھیں کھولیں۔

واقعۂ فیل کا پس منظر:

واقعے کی تفصیلات میں جانے سے پہلے اس کے پس منظر کو جان لینا بے حد ضروری ہے، اصحاب الاخدود کے قصے میں آپ نے یمن کے ایک بادشاہ کا ذکر پڑھا ہے جس نے نجران کے عیسائیوں پر ظلم وستم کی انتہا کر دی تھی، اور اس جرم میں کہ وہ اللہ کا نام لیتے تھے اور اس کی عبادت کرتے تھے خندقیں کھدوا کر اور ان میں آگ جلا کر تقریباً بیس ہزار عیسائیوں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا تھا، اس ظالم بادشاہ کا نام ذونواس ہے، مؤرخین نے لکھا ہے کہ ذونواس نے ہر اس شخص کو آگ میں ڈال دیا تھا جس نے اس کی بات نہیں مانی،

(۱) سورہ الفیل: ۱-۵۔

صرف دو شخص ایسے تھے جو کسی طرح اس کے چنگل سے نکل کر بھاگ کھڑے ہوئے اور انھوں نے ملک شام پہنچ کر دم لیا، انھوں نے وہاں کے حکمراں سے جس کو قیصر کہا جاتا تھا اپنی قوم پر ہونے والے ظلم وستم کے قصے سنائے اور بتلایا کہ ان پر یہ ظلم اس لئے ڈھایا گیا ہے کہ وہ نصرانی تھے، قیصر بھی اسی مذہب سے تعلق رکھتا تھا، وہ یہ واقعہ سن کر سخت مشتعل ہوا، اس نے حبشہ کے بادشاہ کو خط لکھا، اور اس سے کہا کہ وہ یمن پر حملہ کرے اور نجران کے نصرانیوں کا انتقام لے۔

حبشہ بھی ان دنوں ایک مضبوط اور طاقت ور ملک تھا، وہاں کے بادشاہ کا لقب نجاشی رہا ہے، حبشہ مصر سے قریب ہونے کی وجہ سے اس کے مذہب اور تمدن سے متأثر رہا ہے، جس وقت مصر میں عیسائیت کو فروغ ہوا حبشہ بھی نصرانیت کے دامن میں آگیا، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت کے وقت حبشہ پر جو شخص حکمراں تھا اس کا نام اصحمہ ابن ابجر نجاشی ہے، اصحمہ نجاشی بھی عیسائی تھا، اس کی خوش بختی ہے کہ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت وبعثت کا زمانہ پایا اور مشرف بہ اسلام ہوا، قریش مکہ کے مظالم سے تنگ آکر بہت سے صحابہؓ مکہ مکرمہ سے ہجرت کرکے حبشہ چلے گئے تھے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حبشہ کی طرف ہجرت کا حکم دیتے ہوئے صحابہؓ سے فرمایا تھا کہ وہاں ایک بادشاہ ہے جس کی قلم رو میں کوئی کسی پر ظلم نہیں کرتا، صحابۂ کرامؓ وہاں جا کر اطمینان وسکون کے ساتھ رہنے لگے، قریش مکہ کو صحابہ کی ہجرت اور حبشہ میں ان کی پر سکون زندگی پر بڑی تلملاہٹ تھی، چناں چہ انھوں نے عمرو بن العاصؓ اور عبد اللہ ابن ابی ربیعہؓ کو تحفے تحائف دے کر نجاشی کے پاس بھیجا، اور اس سے درخواست کی کہ وہ ان لوگوں کو جو اپنا آبائی دین چھوڑ کر یہاں آبسے ہیں ہمارے سپرد کردے تاکہ ہم ان کو اپنے ساتھ لے جائیں، نجاشی نے تحقیق حال کے لئے صحابۂ کرامؓ کو اپنے دربار میں بلایا، اس موقع پر حضرت جعفرؓ نے ایک طویل تقریر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کے متعلق کی جسے سن کر بادشاہ رونے لگا یہاں تک کہ اس کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی، اس نے قریش کی درخواست ٹھکرادی اور ان کے تحفے واپس کردئے۔

ابرہہ اور یمن میں کلیسا کی تعمیر:

اب ہم اصل واقعے کی طرف آتے ہیں، حبشہ کے نجاشی بادشاہ نے ایک عظیم الشان لشکر تشکیل دیا، جس کی باگ ڈور اپنے دو قابل کمانڈروں کے سپرد کی، ان میں سے ایک کا نام ابرہہ تھا اور دوسرے کا ارباط تھا، دونوں نے مل کر یمن پر حملہ کیا، ذونواس ملک سے فرار ہو گیا اور دریا میں ڈوب کر مر گیا، یمن بت پرستوں سے آزاد ہو کر حبشہ کے نصرانی بادشاہوں کے قبضے میں آ گیا، بعد میں ابرہہ اور ارباط میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا، ارباط مارا گیا اور ابرہہ کو حبشہ کے بادشاہ کی طرف سے یمن کا حاکم مقرر کر دیا گیا، ابرہہ حبشہ کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا، نکٹا تھا اس لئے اسے ابرہۃ الاشرم بھی کہا جاتا ہے، اس کی حکومت کا آغاز ۵۲۵ء یا ۵۴۳ء سے ہوتا ہے، یہ شخص عیسائیت میں بڑا پر جوش تھا، اس نے یمن میں بہت سے گرجا تعمیر کرائے، سب سے بڑا گرجا یمن کے دار الحکومت صنعاء میں تعمیر کرایا جس کو عرب القلیس کہتے ہیں، جو کلیسا کا معرب ہے، یہ گرجا فن تعمیر کے لحاظ سے بے مثال ہے، ابرہہ دیکھتا تھا کہ عرب کے لوگ مکہ مکرمہ جا کر ایک گھر کا طواف کرتے ہیں، جو دیکھنے میں پتھروں کا بنا ہوا معمولی سا گھر ہے، لیکن لوگ اس کا بے حد احترام کرتے ہیں اور اس کی زیارت کو اپنی سعادت سمجھتے ہیں، یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اہل عرب کے دلوں میں خواہ ان کا تعلق کسی بھی عقیدے یا مذہب سے رہا ہو، خانۂ کعبہ کی عظمت ومحبت جاگزیں رہی ہے، یہ الگ بات ہے کہ ہر ملک اور ہر بڑے قبیلے کے لوگ خانۂ کعبہ میں جا کر اپنے اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ وہاں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے جو در اصل اسی عقیدے کے اختلاف کی نمائندگی کرتے تھے، یمن سے بھی ہر سال بے شمار لوگ مکہ کا سفر کرتے اور خانۂ کعبہ کا طواف کر کے واپس آتے، یہ دیکھ کر ابرہہ کے دل میں آیا کہ اگر ایک کلیسا صنعاء میں تعمیر کر دیا جائے جو تعمیر کے لحاظ سے نہایت ارفع واعلا ہو تو لوگ مکہ کا دشوار گزار سفر کرنے کے بجائے اسی کی زیارت کر لیا کریں گے، یہ سوچ کر اس نے بہت بڑی اور نہایت عالیشان عمارت بنوائی، یہ عمارت اس قدر بلند تھی کہ اس کی بلندی پر نیچے کھڑا ہوا آدمی نظر نہیں ڈال سکتا تھا، اس کو سونے چاندی اور

جواہرات سے مرصّع کیا، جب عمارت بن کر تیار ہوگئی تو اس نے اپنی قلمرو میں یہ اعلان کرادیا کہ اب کسی کو خانۂ کعبہ کی زیارت کے لئے مکہ جانے کی ضرورت نہیں ہے، سب لوگ یہاں آکر عبادت کریں۔

خانۂ کعبہ کو شہید کرنے کا منصوبہ:

جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا ہے کہ اگرچہ عربوں میں بت پرستی غالب آگئی تھی، لیکن خانۂ کعبہ سے ان کو جو عقیدت تھی بت پرستی اور شرک کی وجہ سے اس میں کوئی کمی نہیں آئی تھی، خانۂ کعبہ کے مقابلے میں کلیسا کی تعمیر اور ابرہہ کے اعلان نے ان میں سخت غصہ اور اشتعال پیدا کردیا، ابرہہ کا اعلان سن کر ایک شخص جس کا تعلق قریش سے تھا رات میں کسی وقت گرجا میں داخل ہوا اور اس میں غلاظت کرکے بھاگ گیا، صبح کو جب ابرہہ کو اس واقعے کی خبر دی گئی تو اس کو بڑا غصہ آیا اور جب اسے یہ بتلایا گیا کہ یہ حرکت مکہ کے کسی قریشی شخص نے کی ہے تو اس کا پارہ آسمان پر چڑھ گیا، اسی وقت اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ مکہ پر چڑھائی کرے گا اور اس گھر کو تہس نہس کرڈالے گا، اس فیصلے کے بعد ابرہہ نے اس کی تیاری شروع کردی، اپنے بادشاہ نجاشی سے اس کی اجازت مانگی، بادشاہ نے اپنا ایک ہاتھی جس کا نام المحمود تھا ابرہہ کو بھیجا کہ وہ اس پر سوار ہوکر کعبہ پر حملہ کرے، بعض روایات میں ہے کہ وہ بہت بڑا ہاتھی تھا اس زمانے میں اس کی کوئی نظیر نہیں پائی جاتی تھی، اس ہاتھی کے علاوہ ساٹھ ہاتھی اور بھی تھے جو نجاشی بادشاہ نے یمن روانہ کئے تھے تاکہ مکہ پر چڑھائی کے وقت ان کو لشکر میں شامل کیا جائے، ان ہاتھیوں کو لشکر میں شامل کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ بیت اللہ کے ستونوں میں زنجیریں ڈال کر ان کو ہاتھیوں کے گلے میں باندھ دیا جائے اور ان کو ہنکادیا جائے تاکہ سارا بیت اللہ ایک ہی جھٹکے میں زمین پر آگرے۔

عالم عرب میں بے چینی:

جیسے ہی یہ خبر عام ہوئی کہ یمن کا حکمراں ابرہہ ہاتھیوں کا لشکر لے کر بیت اللہ پر حملہ کرنے جارہا ہے تمام عالمِ عرب میں ایک ہیجان پیدا ہوگیا، یمن ہی کے ایک بااثر شخص نے جس کا نام ذونفر تھا مختلف قبائل عرب کے سربراہوں کے پاس قاصد روانہ کئے اور

انہیں ابر ہہ کے ارادے سے باخبر کیا، اوران سے کہا کہ میں ابرہہ کا مقابلہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں آپ لوگ میرا ساتھ دیں، تمام قبائل اس کی آواز پر متحد ہو گئے، ذونصر نے ابرہہ کا راستہ روکنے کی کوشش کی، مگر جنگ میں شکست کھا گیا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ ابرہہ آگے بڑھے اور خانہ کعبہ کے قریب پہنچ کر ذلت ورسوائی کا سامنا کرے، اور ایسی شکست سے دوچار ہو کہ تا قیام قیامت کوئی دوسرا شخص خانۂ کعبہ پر حملہ کرنے کا تصور بھی نہ کر سکے، بہ ہر حال ابونصر کا لشکر جنگ میں ہار گیا، ابرہہ نے اس کو قید کر لیا، جب وہ قبیلۂ خثعم کے قریب پہنچا تو اس قبیلے کے سردار نفیل بن حبیب نے اپنے جوانوں کے ساتھ اس پر حملہ کر دیا، مگر ابرہہ نے اس کو بھی شکست دیدی، نفیل بھی گرفتار کر لیا گیا، راستے میں کئی جگہ اسے مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا، مگر وہ سب سے لڑتا ہوا اور سب کو شکست دیتا ہوا طائف پہنچ گیا، ابرہہ کی پے درپے فتوحات اور مسلسل پیش قدمی کی خبریں ہر جگہ پہنچ چکی تھیں، طائف کے لوگوں نے جنگ نہ کرنے کا فیصلہ کیا، البتہ انھوں نے ابرہہ سے مل کر اس کے سامنے یہ شرط رکھی کہ طائف میں لات کا جو عظیم الشان بت خانہ ہم نے بنا رکھا ہے وہ اس کو نہ چھیڑے، بدلے میں ہم اس کا راستہ نہیں روکیں گے، بل کہ اس جنگ میں اس کی مالی امداد کریں گے اور اگر اس کو کسی رہ نمائی کی ضرورت ہو گی تو ہم اس سے بھی دریغ نہیں کریں گے، ابرہہ نے یہ شرط منظور کر لی، طائف والوں نے ابورغال نامی ایک سردار کو رہ نمائی کے لئے ابرہہ کے ساتھ کر دیا۔

ابورغال ابرہہ کو لے کر وادیٔ مغمس پہنچ گیا، یہاں پہنچ کر ابرہہ نے اپنے ایک فوجی کمانڈر اسود بن مقصود کو حکم دیا کہ وہ مکہ کے قریب جا کر حالات کا جائزہ لے، اسود مکہ کے قریب پہنچا، وہاں قریش کے اونٹ اور بھیڑ بکریاں چر رہی تھیں، ان میں دو سو اونٹ حضرت عبد المطلب کے بھی تھے، اسود تمام جانوروں کو پکڑ کر اپنے لشکر میں لے آیا، اس زمانے میں حضرت عبد المطلب قریش مکہ کے سردار تھے، ابرہہ کی آمد اور اس کے ممکنہ حملے کی خبر سے مکہ کے مختلف قبیلوں میں بڑی بے چینی اور سخت اضطراب تھا، کنانہ، ہزیل اور دوسرے قبیلوں کے سربرآوردہ لوگ سر جوڑ کر بیٹھے اس میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہم ابرہہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس لئے ہمیں مکہ چھوڑ کر اور بیت اللہ کو اس کے مالک کے حوالے

کر کے قریب کی پہاڑیوں اور گھاٹیوں میں چلے جانا چاہئے، اُدھر ابرہہ نے اپنے ایک معتمد حناطہ حمیری کو قاصد کی حیثیت سے مکہ بھیجا، اور اس کے ذریعے مکہ کے سرداروں سے یہ کہلوایا کہ میرا مقصد جنگ کرنا نہیں ہے، بل کہ کعبے کو ڈھانا ہے، اگر تم نے کوئی رکاوٹ نہ ڈالی تو ہم تمہیں کچھ نہ کہیں گے اور اپنا مقصد پورا کر کے واپس چلے جائیں گے، حناطہ حمیری مکہ پہنچا تو لوگوں نے اسے حضرت عبدالمطلب کے پاس پہنچا دیا، قاصد کا پیغام سن کر عبدالمطلب نے فرمایا کہ ہم بھی جنگ کرنا نہیں چاہتے اور نہ ہمارے پاس اتنی طاقت ہے کہ ابرہہ سے جنگ کریں، البتہ میں تم پر ایک بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ اللہ کا گھر ہے جس کو اس کے پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا، اگر اللہ چاہے گا تو وہ خود اپنے گھر کی حفاظت کرے گا۔

حضرت عبدالمطلب اور ابرہہ کی ملاقات:

قاصد نے یہ جواب سن کر حضرت عبدالمطلب سے عرض کیا کہ جب آپ ہمارے بادشاہ سے جنگ نہیں کرنا چاہتے تو معاملہ آسانی کے ساتھ حل ہو جائے گا، آپ میرے ساتھ چلیں، میں آپ کو ابرہہ سے ملوا دیتا ہوں، آپ اس سے بات چیت کر لیں، عبدالمطلب قاصد کے ساتھ چل پڑے، لشکر کے قریب پہنچے تو ابرہہ ان کی وجیہہ اور شاندار شخصیت سے اس قدر مرعوب ہوا کہ اپنے تخت سے اتر پڑا اور ان کو اپنے برابر لا کر بٹھلایا، اور ترجمان کے ذریعے ان سے پوچھا کہ وہ کس لئے تشریف لائے ہیں اور کیا بات کرنا چاہتے ہیں؟ عبدالمطلب نے کہا کہ میں صرف یہ کہنے کے لئے آیا ہوں کہ تمہارے آدمی ہمارے اونٹ پکڑ کر لے آئے ہیں، آپ ہمارے اونٹ ہمیں واپس دیدیں، ابرہہ عبدالمطلب کی زبان سے یہ بات سن کر حیرت زدہ رہ گیا، اس کو توقع تھی کہ مکہ کا یہ سردار آتے ہی اس کے قدموں میں گر پڑے گا، اس کی منتیں کرے گا اور اس سے درخواست کرے گا کہ وہ بیت اللہ پر حملے کا ارادہ ترک کر دے، بدلے میں وہ مکہ کی تمام دولت اسے دینے کی پیش کش بھی کرے گا، عبدالمطلب کے مطالبے سے اسے سخت مایوسی ہوئی، اس نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں تو آپ کو انتہائی عقل مند اور معاملہ فہم آدمی سمجھتا تھا آخر آپ مکہ کے سردار ہیں اور خانہ کعبہ کے متولی بھی ہیں، مگر آپ کی گفتگو سے مجھے سخت مایوسی ہوئی، اور آپ کو دیکھ کر جو عزت

وتوقیر میرے دل میں آپ کے لئے پیدا ہوئی تھی وہ بھی جاتی رہی، قاعدے میں آپ کو یہ فکر کرنی چاہئے تھی کہ خانہ کعبہ کو کس طرح بچانا ہے، اسی ایک سوال پر آپ کو مجھ سے گفتگو بھی کرنی چاہئے تھی، اس کے بجائے آپ اپنے اونٹوں کا قصہ لے کر بیٹھ گئے جو اس گھر کے مقابلے میں نہایت حقیر ہیں، عبدالمطلب نے جواب دیا کہ اونٹوں کا مالک میں ہوں، مجھے اس کی فکر ہے، جہاں تک اس گھر کا تعلق ہے، وہ اللہ کا گھر ہے وہی اس کا مالک ہے، وہ خود اپنے گھر کی حفاظت کا ذمہ دار ہے، ہمارے اندر اتنی طاقت نہیں ہے کہ ہم تمہارا مقابلہ کریں اور اس گھر کو بچائیں، ہمیں تو اپنے اونٹوں سے مطلب ہے، برائے مہربانی تم ہمارے اونٹ ہمیں واپس کردو، اس کے بعد جو تمہارا دل چاہے وہ کرو، ابرہہ نے اپنے سرداروں سے کہا کہ وہ مکہ والوں کے اونٹ واپس کردیں، بعض روایات میں ہے کہ اس ملاقات میں حضرت عبدالمطلب کے ساتھ بنی بکر کے سردار یعمر بن نفاثہ اور بنی ھزیل کے سردار خویلد بن واثلہ بھی تھے، انھوں نے ابرہہ کو یہ پیش کش کی کہ اگر آپ بیت اللہ پر حملے کا ارادہ ترک کردیں اور اپنا لشکر لے کر واپس چلے جائیں تو وادیٔ تہامہ کی ایک تہائی پیداوار ہم زندگی بھر آپ کو بہ طور خراج ادا کرتے رہیں گے، ابرہہ نے جو اس وقت طاقت کے نشے میں چور تھا یہ پیش کش ٹھکرادی اور سرداروں سے کہا کہ تم لوگ اپنے اونٹ واپس لے جاؤ، اب تمہارے اس گھر کو میرے ہاتھوں سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

حضرت عبدالمطلب کی دُعا:

حضرت عبدالمطلب اپنے اونٹ لے کر مکہ واپس پہنچے، قریش سمیت تمام قبائل کو جمع کیا، ان کو اپنی اور ابرہہ کی گفتگو سے آگاہ کیا اور کہا کہ اب ہمیں یہ گھر اللہ کے حوالے کرکے یہاں سے چلے جانا چاہئے اور کسی ایسی جگہ جا کر اپنا ٹھکانہ بنانا چاہئے جہاں سے ہم ابرہہ کے حملے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں، رخصت ہونے سے پہلے عبدالمطلب اور دوسرے تمام لوگ بیت اللہ کے اردگرد جمع ہوگئے، عبدالمطلب نے بیت اللہ کی چوکھٹ پکڑی اور الحاح وزاری کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں عرض کیا، اے اللہ! ابرہہ سے مقابلہ ہمارے بس میں نہیں ہے، ویسے بھی یہ گھر تیرا ہے، تجھے ہی اس کی حفاظت کرنی ہے، جب

ہم اپنی چیزوں کی حفاظت کرتے ہیں تو تو اپنے گھر کی حفاظت کیوں نہیں کرے گا، اس کا ہمیں پورا یقین ہے، کہ تیرا گھر محفوظ رہے گا، اسے کوئی تباہ نہیں کرسکتا، تیری تدبیر پر نہ صلیب کی طاقت غالب آسکتی ہے اور نہ اہل صلیب کی کوئی تدبیر، ہاں اگر تو ہی اپنے مقدس گھر کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کا فیصلہ کرچکا ہے تو پھر ہم کیا کوئی بھی کچھ نہیں کرسکتا، اس دُعا کے بعد مکہ مکرمہ کے تمام لوگ اپنی ضرورت کی چیزیں لے کر قریب کے پہاڑوں پر چلے گئے اور حالات کا انتظار کرنے لگے۔

ابرہہ خانۂ کعبہ کی طرف بڑھا:

اگلی صبح ابرہہ نے اپنے لشکر کو مکہ کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا، سب سے پہلے محمود نامی ہاتھی کو جس کی جسامت اور طاقت کا پہلے بھی ذکر ہوچکا ہے آگے بڑھایا گیا، فضیل بن حبیب جنھوں نے راستے میں ابرہہ سے جنگ کی تھی اور شکست کے بعد گرفتار کرلئے گئے تھے آگے بڑھے اور انھوں نے محمود ہاتھی کے قریب جاکر اس کے کان میں صرف اتنا کہا کہ محمود! تو واپس یمن چلا جا، اس لئے کہ تو اللہ کے بلد امین (مکہ) میں ہے، یہ بات سنتے ہی محمود زمین پر بیٹھ گیا، اب اسے اٹھانے کی کوششیں شروع ہوئیں، کچوکے لگائے، تیر برسائے گئے، ناک میں لوہے کا آنکڑا ڈالا گیا، مگر وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا، فیل بان اپنی تمام کوششوں میں ناکام ہوگئے، اسی دوران کسی نے یمن کی طرف چلنے کے لئے کہا ہاتھی ایک دم اٹھ کر کھڑا ہوگیا، شام کی طرف لے جانا چاہا تب بھی چلنے پر آمادہ، مشرق کی سمت چلنے کے لئے کہا تو چلنے لگا، اگر مکہ کی طرف چلنے کے لئے کہا جاتا تو وہ اپنی جگہ سے نہ ہلتا، باقی تینوں سمتوں میں چلنے کے لئے اسے انکار نہیں تھا، یہ صورت حال دیکھ کر محمود کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا، باقی ہاتھیوں کو آگے بڑھایا گیا، اسی دوران تیز ہوا چلی اور سمندر کی جانب سے پرندوں کے غول آسمان میں اڑتے اور مکہ کی طرف بڑھتے نظر آئے۔

ابابیل پرندوں کے غول

محدثین نے اس طرح کی روایات نقل کی ہیں کہ اس طرح کے پرندے کبھی نہیں

دیکھے گئے تھے، وہ پرندے چنئے سے کبوتر سے چھوٹے تھے، ان کے پنجے سُرخ تھے، ہر ایک کے ساتھ تین کنکریاں تھیں، دو پنجوں میں اور ایک منہ میں، کنکریاں چنے یا مسور کے دانے کے برابر تھیں، دیکھتے ہی دیکھتے پرندوں کا یہ غول ابرہہ کے لشکر پر چھا گیا، اور کنکریاں گرانے لگا، جس شخص کے وہ کنکریاں لگتیں بدن میں تیر کی طرح داخل ہوتیں اور دوسری طرف سے باہر نکل جاتیں، کچھ ہی دیر میں اعضاء بدن گلنے لگتے، دیکھتے ہی دیکھتے ابرہہ کے اکثر فوجی ہلاک ہو گئے، ایک ہاتھی بھی سنگریزے سے ہلاک ہوا باقی یمن کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے، کچھ لوگ جو اس جنگ میں شریک نہیں تھے تیزی کے ساتھ یمن پہنچے اور انھوں نے وہاں جا کر عذاب کا حال سنایا، اکثر لوگ یا تو موقع پر ہی ہلاک ہو گئے یا راستے میں گل سڑ کر مر گئے، صرف ابرہہ باقی بچا، کیوں کہ وہی سرغنہ تھا، اس لئے عبرت کا مرقع بنانے کے لئے کچھ دنوں اور اسے زندہ رکھا گیا، مگر اس حال میں کہ اس کا ایک ایک عضو بدن گلنے لگا، اس میں سے بدبو پھوٹنے لگی، اسی حال میں وہ یمن کے دارالحکومت صنعاء پہنچا، اطباء نے لاکھ تدبیریں کیں، لیکن کوئی علاج کارگر نہ ہوا، سارا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بہہ گیا، اسی حالت میں اس کا قصہ پاک ہوا۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ محمود نامی ہاتھی کا بیٹھنا اور ہزاروں کوششوں کے باوجود اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہونا ابرہہ کے لئے کھلی تنبیہ تھی، اور آخری موقع تھا کہ وہ اپنے ارادے سے باز آجائے اور لشکر کو واپس لے جائے مگر اس نے یہ موقع بھی گنوا دیا، اس کے بعد پرندوں جیسی حقیر مخلوق نے ابرہہ کا، اس کے طاقت ور جوانوں کا اور اس کے عظیم الجثہ ہاتھیوں کا وہ حشر کیا کہ اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، پھر اللہ نے ابرہہ کو نشان عبرت بناتے ہوئے اس وقت تک زندہ رکھا جب تک وہ اپنی جگہ واپس نہ پہنچ جائے، باقی تمام لوگ موقع پر اور راستے میں ہلاک ہو گئے، صرف ابرہہ تھا جو گلی سڑی حالت میں چیختا چلاتا صنعاء پہنچا، سچ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے باغیوں کو سزا دیتا ہے تو انہیں آنے والی نسلوں کے لئے عبرت بھی بنا دیتا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں فرعون نے سرکشی کی اللہ نے اسے اور اس کے تمام ساتھیوں کو دریا میں غرق کر دیا، باقی لوگوں کی لاشیں تو دریا ہی میں پڑی رہ گئیں صرف فرعون کی لاش کو دریا کے کنارے لا کر پھینکا گیا، اس کی لاش آج بھی چشم

بصیرت رکھنے والوں کے لئے عبرت وموعظت کا نمونہ بنی ہوئی ہے۔

قرآن کا معجزانہ اسلوب بیان:

قرآن کریم نے یہ انتہائی اہم واقعہ چند آیات کے اندر اپنے انتہائی معجزانہ اسلوب میں بیان کیا ہے، اس واقعے کا حیرت انگیز پہلو یہ بھی ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت با سعادت سے چند روز قبل اس کا ظہور ہوا، بہ قول حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ "یہ گویا ذات اقدس محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان اوران کے اعزاز واکرام کا عظیم الشان نشان ہے"۔ عربوں میں یہ واقعہ اس قدر اہمیت اور شہرت رکھتا تھا کہ انھوں نے اس سال کا نام ہی عام الفیل (ہاتھیوں والا سال) رکھ دیا، اس واقعے کے آثار بعد تک بھی دیکھے گئے، حدیث کی کتابوں میں ہے کہ محمود کے دو ہاتھی بان مرنے سے بچ گئے تھے، مگر دونوں اندھے اور ہاتھ پاؤں سے معذور ہوگئے تھے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے ان کو اس حال میں دیکھا ہے کہ وہ اندھے اور اپاہج تھے، ان کی بہن حضرت اسماءؓ کہتی ہیں کہ میں نے ان دونوں کو بھیک مانگتے ہوئے دیکھا ہے۔

حقیقت واقعہ کا انکار:

بہت سے نام نہاد یورپین مصنف اس واقعے کی صداقت کا انکار کرتے ہیں، ان کے خیال میں یہ کیسے ممکن ہے کہ کچھ پرندے اڑ کر آئیں اور اپنے پنجوں سے سنگریزے گرا کر اتنے بڑے لشکر کو ہلاک کرڈالیں، اوّل تو تاریخ کے دامن میں اس سے بھی زیادہ محیّر العقول واقعات محفوظ ہیں، یہ اللہ کا کھلا ہوا عذاب تھا اور وہ کسی بھی وقت کسی بھی صورت میں آسکتا ہے، دوسرے اللہ کو اپنی قدرت کا یہ نمونہ بھی دکھانا تھا کہ تم اپنے جس لشکر پر ناز کرتے ہو اور جن ہاتھیوں پر گھمنڈ کرتے ہو وہ اللہ کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے، اللہ ان کو اپنی حقیر اور بے زبان مخلوق کے ذریعے معمولی کنکریوں سے ہلاک کرسکتا ہے، اس طرح کے اعتراضات وہی شخص کرسکتا ہے جس کو خدا کی قدرت پر یقین نہ ہو، ویسے بھی اس عذاب کا مشاہدہ کرنے والے ہزاروں لوگ تھے اور جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خلعت نبوت ورسالت سے سرفراز کیا اس وقت بھی سینکڑوں لوگ زندہ

تھے جنھوں نے پرندوں کو آتے ہوئے اور کنکریاں برساتے ہوئے دیکھا تھا، یہی وجہ ہے کہ جب سورۃ الفیل نازل ہوئی تو کسی بھی مشرک کو خواہ وہ ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کتنا ہی عناد کیوں نہ رکھتا تھا اس سورت میں بیان کئے گئے واقعے کے خلاف لب کشائی کرنے کی جرأت نہیں ہوئی، بل کہ خاموش رہ کر اس نے اس بات کی تصدیق ہی کی کہ ہاں یہ واقعہ اسی طرح پیش آیا ہے جس طرح محمد نے بیان کیا ہے، تنہا یہی ایک سورت مشرکین مکہ کو ایمان کے راستے پر لانے کے لئے کافی تھی لیکن وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر بغض اور دشمنی رکھتے تھے کہ یہ سورت بھی انہیں راہ حق پر نہ لاسکی۔

بہ ہر حال اصحاب الفیل کا یہ عجیب وغریب واقعہ تاریخ کا نادر واقعہ ہے، کچھ ہی دنوں میں دور دور تک اس کی شہرت پھیل گئی، اس سے بیت اللہ کی عظمت اور وقار واحترام تو لوگوں کے دلوں میں بڑھا ہی خود قریش مکہ کی عزت وعظمت میں بھی اضافہ ہوا، اور یہ کہا جانے لگا کہ یہ لوگ اللہ والے ہیں، خود اللہ نے ان کے دشمنوں کو ہلاک کیا ہے، اس شہرت کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ قریش مکہ بغرض تجارت جہاں بھی جاتے ان کا احترام کیا جاتا، راستے میں ان کو تحفظ دیا جاتا، اس واقعے سے ان کی تجارت میں بھی اضافہ ہوا، اور عزت وتوقیر میں بھی چار چاند لگے، سورۃ الفیل کے بعد ایک سورۃ القریش نازل ہوئی، اس کا موضوع یہ ہے کہ واقعہ فیل تمہارے لئے بڑی نعمت ہے تم اس پر اللہ کا شکر ادا کرو اور اس کے گھر کے مالک کی عبادت کرو، تمام مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ معنی اور مضمون کے لحاظ سے دونوں سورتیں ایک ہی ہیں، مگر دونوں کو الگ الگ وقت میں نازل کیا گیا ہے، اگر سورۂ القریش کو سورۂ الفیل کا تتمہ اور تکملہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

اولوالعزم پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر:

رسالت مآب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء کے سردار اور سلسلۂ نبوت کے خاتم ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام تمام انبیاء بنی اسرائیل کے مجدد اور ان کے خاتم ہیں،

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل کوئی نبی نہیں آیا، درمیان کا یہ وقفہ فترت کا زمانہ کہلاتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زمانہ ایسا گزرا ہے جس میں کوئی نبی نہیں ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل نازل ہوئی، اس کتاب کی اہمیت اس لئے ہے کہ اس نے اُس قانونِ شریعت کی تکمیل کی ہے جس کا آغاز تورات سے ہوا تھا، انجیل کو آسمانی کتابوں میں اس لئے بھی بلند مقام حاصل ہے کہ اس میں جگہ جگہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی بشارتیں ملتی ہیں، افسوس نصاریٰ نے شروع ہی سے کتمان علم کیا ہے اور آسمانی ہدایتوں میں ردّ وبدل کر کے پوری کتاب کو ناقابل یقین بنا دیا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے اولو العزم پیغمبروں میں سے ایک ہیں، قرآن کریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام نامی پچیس آیتوں میں آیا ہے، ان کو بعض آیات میں مسیح اور بعض میں عبداللہ کے نام سے بھی یاد کیا گیا ہے، یہ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کی خصوصیت ہے کہ قرآن کریم میں نہ صرف ان کے واقعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے بل کہ ان کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام کا بھی متعدد آیات میں ذکر کیا گیا ہے، بلکہ ایک پوری سورت ان کے نام سے سولہویں پارے میں موجود ہے، اس کے علاوہ بھی ایک سورت آل عمران کے نام سے ہے اس میں بھی حضرت مریم علیہا السلام کا ذکر خیر ملتا ہے، سب سے پہلے ہم حضرتِ مریم علیہا السلام کے واقعات پر روشنی ڈالتے ہیں۔

حضرت مریم علیہا السلام کے احوال:

حضرت مریم علیہا السلام کے والد کا نام عمران اور والدہ کا نام حنہ تھا، دونوں ہی بڑے نیک، متقی اور پرہیزگار تھے، مسجد اقصیٰ کی امامت حضرت عمران کے سپرد تھی، والدہ حنہ گھر پر رہ کر عبادت وریاضت میں مصروف رہا کرتی تھیں، ان کے کوئی اولاد نہیں تھی، جس کا ان دونوں کو خاص طور پر حنہ کو بڑا قلق رہتا تھا، وہ اکثر اپنے رب کے حضور اولاد کے لئے دُعا بھی کرتی رہتی تھیں، ایک مرتبہ وہ اپنے گھر کے صحن میں ٹہل رہی تھیں، انھوں نے دیکھا کہ ایک پرندہ اپنے بچے کے ساتھ کھیل رہا ہے، اسے محبت وپیار سے چوم رہا ہے، وہ بچہ بھی اپنی ماں کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہا ہے، اس منظر نے ان کے دل پر بڑا اثر کیا، شدتِ تاثر سے اُن کی آنکھوں میں آنسو آگئے، اسی حالت میں انھوں نے خالق کائنات

سے یہ دُعا کی کہ اے اللہ! اسی طرح مجھے بھی کوئی بچہ عطا کر جو ہماری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ثابت ہو، بے قرار دل سے نکلی ہوئی دُعا نے شرفِ قبولیت حاصل کیا، حنہ نے کچھ ہی دنوں بعد محسوس کیا کہ وہ حاملہ ہو چکی ہیں، اس احساس سے ان کو اس درجہ خوشی ہوئی کہ انھوں نے اسی وقت یہ نذر مان لی کہ جو بچہ میرے یہاں پیدا ہوگا میں اسے مسجد اقصیٰ کی خدمت کے لئے وقف کردوں گی، قرآن کریم میں ہے: إِذْ قَالَتِ امْرَأَةُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ. (۱) ''جب عمران کی بیوی نے کہا کہ یا اللہ! میں نے نذر مان لی ہے کہ میرے پیٹ میں جو بچہ ہے وہ تیری راہ میں آزاد ہے پس تو اس کو میری جانب سے قبول فرمالے، بے شک تو سننے اور جاننے والا ہے''۔

ولادت کا وقت جوں جوں قریب آتا جارہا تھا، حضرت حنہ کی شادمانی اور مسرت بھی بڑھتی جارہی تھی، وہ گھڑی بھی آپہنچی جب حضرت حنہ کی خالی گود بھرنے والی تھی، اور ان کی برسوں کی بے قراری کو قرار آنے والا تھا، ولادت ہوئی، ان کو بتلایا گیا کہ بیٹی ہوئی ہے، حضرت حنہ کو اولاد کی خوشی تو ہوئی مگر ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوا کہ میں نے نذر مان رکھی تھی کہ میں اپنے بچے کو راہ خدا میں دوں گی اور اسے ہیکل کا خادم بناؤں گی، مگر بیٹی ہوئی ہے کیا کروں، اس وقت بیٹیوں کو ہیکل کی خادمہ بنانے کا کوئی دستور نہیں تھا، اس لئے وہ خوشی کے اس موقع پر پریشان بھی نظر آئیں، مگر وہ اپنی نذر پر قائم رہیں اور اپنے رب سے کہنے لگیں: قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنثَىٰ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنثَىٰ وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ. (۲) ''پروردگار! میرے لڑکی پیدا ہوئی ہے اور اللہ خوب جانتا ہے جو میں نے جنا ہے اور لڑکا لڑکی جیسا نہیں ہوتا (یعنی دونوں برابر نہیں ہوتے، صنف نازک ہونے کی وجہ سے لڑکی وہ کام نہیں کرسکتی جو لڑکا کرسکتا ہے) اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اور میں اس کو اور اس کی اولاد کو بھی مردود شیطان سے تیری پناہ میں دیتی ہوں'' حضرت حنہ کو لڑکی پیدائش کے بعد خیال ہوا کہ میں اپنی نذر پوری نہیں کرسکوں گی، کیوں کہ لڑکا ہی ہیکل کا

(۱) آل عمران: ۳۵۔ (۲) آل عمران: ۳۶۔

خادم بن سکتا ہے، لڑکی کو اس کام میں نہیں لگایا جا سکتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی نیک دل بندی کو مایوس نہیں کیا، بل کہ یہ کہہ کر ان کو تسلی دی کہ ''اس کے رب نے اس کو قبول کرلیا'' اس طرح حضرت حنہ کی نذر پوری ہوئی۔

حضرت مریم علیہا السلام بیت المقدس میں:

تفسیر کی کتابوں میں ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ حضرت حنہ ان کو لے کر بیت المقدس پہنچیں اور وہاں کے مجاورین اور عابدین سے جن میں حضرت زکریا علیہ السلام بھی تھے کہا کہ میں نے نذر مانی تھی کہ جو بچہ میں جنم دینے والی ہوں اس کو راہ خدا میں وقف کروں گی، سو یہ بچی پیدا ہوئی ہے، اپنی نذر کے مطابق میں اسے اپنے پاس نہیں رکھ سکتی، اب آپ اس کی پرورش کریں، حضرت عمران لڑکی کے باپ تھے، لیکن وضعِ حمل سے پہلے ہی وہ فوت ہو چکے تھے، ورنہ حقیقت میں وہی اس لڑکی کو لینے اور اس کی پرورش کرنے کے لئے زیادہ مستحق تھے، حضرت عمران امام تو تھے ہی ان کی نیکی اور پرہیزگاری بھی قابل رشک تھی، اب حنہ ان کی بیٹی کو لے کر آئیں تو مسجد کے تمام مجاورین اور عابدین کی خواہش یہ ہوئی کہ یہ بچی انہیں مل جائے اور وہ اس کی دیکھ بھال کریں، حضرت زکریا علیہ السلام نے فرمایا کہ لڑکی میری بیوی کی بھانجی ہے، اس لئے میں بوجہ قرابت اس کی پرورش کا زیادہ حق رکھتا ہوں، ویسے بھی میرے گھر میں اس کی خالہ موجود ہیں جو ماں کے درجے میں ہوتی ہے، میں نہیں سمجھتا کہ ماں کے بعد خالہ سے بہتر کوئی دوسرا شخص کسی بچّے کو اچھی طرح پرورش کرسکتا ہے، حضرت زکریا کی یہ دلیل دوسرے لوگوں نے قبول نہیں کی، اور ہر شخص اسی پر مصر رہا کہ بچی اس کے سپرد کردی جائے، جب اختلاف زیادہ بڑھا تو یہ طے پایا کہ قرعہ ڈال لیا جائے، جس کا نام قرعے میں نکل آئے بچی اس کے سپرد کردی جائے، قرعہ ڈالا گیا، خدا کی مصلحت اور منشأ کے مطابق حضرت زکریا علیہ السلام کا نام نکل آیا اور بچی ان کے سپرد کردی گئی۔

بیت المقدس میں حضرت مریم کی پرورش:

مفسرین لکھتے ہیں کہ مسجد کے قریب ہی ایک حجرہ حضرت مریم کے لئے مخصوص

کردیا گیا، وہ اس میں رہنے لگیں، حضرت زکریا علیہ السلام ان کی ہر طرح دیکھ بھال کرتے، ان کے کھانے پینے کا خیال رکھتے، کہیں جاتے تو وہ حجرہ مقفل کردیتے، جب وہ بچی سن شعور کو پہنچی تو اس کا وقت عبادت الٰہی میں گزرنے لگا، حضرت مریم رات کو اپنی خالہ کے پاس چلی جاتیں، شب بھر وہاں رہتیں، صبح کو پھر اپنے حجرے میں واپس آجاتیں، کبھی کبھی مسجد کی خدمت بھی کرتیں یعنی اس کی صفائی وغیرہ بھی کردیتیں، حضرت زکریا علیہ السلام جب بھی حجرے میں تشریف لاتے تو ان کے پاس طرح طرح کے میوے اور پھل دیکھتے، بل کہ بے موسم کے پھل بھی دیکھتے، انہیں بڑی حیرت ہوتی کہ آخر بند کمرے میں یہ پھل اور وہ بھی بے موسم کے پھل کہاں سے آتے ہیں، وہ مریم سے پوچھتے! اے مریم یہ پھل اور میوے کہاں سے آئے ہیں، وہ کہتیں کہ ''یہ میرے اللہ کے پاس سے آئے ہیں اور اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق عطا کرتا ہے''۔

آہستہ آہستہ حضرت مریم کی بزرگی اور ولایت کا چرچا ہونے لگا، یہاں تک کہ بنی اسرائیل میں سے ہر شخص کی زبان پر ان کے زہد وتقویٰ کا ذکر رہنے لگا، اس وقت اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعے ان کو یہ بشارت دی ''اے مریم اللہ نے تجھے بزرگی دی، اور پاک کیا، اور دنیا کی عورتوں پر تجھ کو فضیلت عطا کی، اے مریم! اپنے پروردگار کے سامنے جھک جا، سجدہ ریز ہوجا، اور نماز پڑھنے والوں کے ساتھ نماز ادا کر'' اس آیت کریمہ کے حوالے سے مفسرین نے تین سوالات اٹھائے ہیں اور ان کا جواب دینے کی کوشش کی ہے کہ (۱) کیا عورت کو نبوت مل سکتی ہے (۲) کیا حضرت مریم علیہا السلام اللہ کی نبی تھیں (۳) اگر نبی نہیں تھیں تو آیت فضیلت کا کیا مطلب ہے۔

کیا حضرت مریم نبی تھیں:

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے اپنی کتاب قصص القرآن میں ان تینوں سوالوں پر بھرپور عالمانہ اور محققانہ بحث کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ عورت کی نبوت کے مسئلے پر علماء کے درمیان اختلاف رہا ہے، محمد بن اسحاقؒ، شیخ ابوالحسن اشعریؒ، امام قرطبیؒ، اور ابن حزمؒ اس جانب مائل ہیں کہ عورت نبی ہوسکتی ہے، بل کہ ابن حزمؒ تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ

حضرت حوا، سارہ، ہاجرہ، ام موسیٰ، آسیہ اور مریم (علیہن السلام) یہ سب نبی تھیں، محمد بن اسحاقؒ کہتے ہیں کہ اکثر فقہاء اس کے قائل ہیں کہ عورت نبی ہوسکتی ہے، قرطبی فرماتے ہیں کہ مریم علیہا السلام نبی تھیں، ان حضرات کے برعکس خواجہ حسن بصریؒ اور قاضی عیاضؒ وغیرہ کا رجحان اس جانب ہے کہ عورت نبی نہیں ہوسکتی، حافظ ابن کثیر تو اسے جمہور کا مسلک قرار دیتے ہیں، یہ حضرات قرآن کریم کی اس آیت کو بہ طور دلیل پیش کرتے ہیں ''اور تم سے پہلے ہم نے رسول نہیں بھیجے مگر مرد، ہم ان کے پاس وحی بھیجتے تھے'' اور خصوصیت کے ساتھ حضرت مریم علیہا السلام کے نبوت کے انکار پر یہ دلیل دیتے ہیں کہ قرآن کریم میں ان کو صدیقہ کہا گیا ہے، اگر وہ نبی ہوتیں تو ان کو نبی کہا جاتا، اور سورۂ نساء میں قرآن کریم نے ان لوگوں کی جو فہرست دی ہے جن پر انعام کیا گیا ہے ان میں صدیقین کو دوسرے نمبر پر رکھا گیا ہے۔

جو حضرات عورت کے نبی ہونے کے قائل ہیں وہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم نے حضرت سارہ، حضرت ام موسیٰ اور حضرت مریم (علیہن السلام) کے متعلق جو واقعات بیان کئے ہیں ان میں صراحت کے ساتھ یہ بات موجود ہے کہ ان پر اللہ کے فرشتے وحی لے کر آئے، ان کو من جانب اللہ بشارت سے سرفراز کیا اور ان تک اپنی معرفت وعبادت کا حکم پہنچایا، چناں چہ حضرت سارہؓ کے لئے سورۂ ہود، سورۂ الذاریات میں، حضرت ام موسیٰ کے لئے سورۂ قصص میں اور حضرت مریم علیہا السلام کے لئے آل عمران اور سورۂ مریم میں بواسطۂ ملائکہ اور بلاواسطہ خطاب الٰہی موجود ہے، اور خصوصیت کے ساتھ حضرت مریم علیہا السلام کے نبی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم میں ان کا ذکر اسی اسلوب میں کیا گیا ہے جس اسلوب میں دوسرے انبیاء کا ذکر ہے، چناں چہ فرمایا: ''اور کتاب میں مریم کا ذکر کرو'' بعینہٖ یہی اسلوب حضرت موسیٰ، ادریس، اسماعیل اور ابراہیم علیہم السلام کے بارے میں بھی اختیار کیا گیا ہے، حضرت مریم علیہا السلام کے متعلق قرآن کریم میں یہ بھی فرمایا گیا ''اور ہم نے مریم کی جانب اپنے فرشتے (جبرئیل) کو بھیجا'' یہ بھی ارشاد فرمایا ''میں بلاشبہ تیرے پروردگار کی جانب سے پیغامبر ہوں'' نیز سورۂ آل عمران میں مریم علیہا السلام کو ملائکہ نے جس طرح خدا کی جانب سے پیغامبر بن کر خطاب کیا ہے وہ بھی اس دعویٰ کی روشن دلیل ہے۔

صدیقہ کا مفہوم کیا ہے:

اب رہی یہ بات کہ قرآن کریم میں حضرت مریم علیہا السلام کو صدیقہ کہا گیا ہے اس کا جواب دیتے ہوئے یہ حضرات فرماتے ہیں کہ اگر قرآن کریم میں ان کو صدیقہ کہا گیا ہے تو یہ لقب ان کی شان نبوت کے اسی طرح منافی نہیں ہے جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے نبی ہونے کے باوجود آیت یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ میں ان کا صدیق ہونا ان کے نبی ہونے کے مانع نہیں ہے، کیوں کہ جو نبی ہے وہ صدیق ضرور ہے، البتہ اس کا عکس ضروری نہیں ہے، یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ جو صدیق ہو وہ نبی بھی ہو، بہ ہر حال حافظ ابن حزمؒ نے اس موضوع پر بڑی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اور کافی مضبوط دلائل فراہم کئے ہیں، اس بنیاد پر مولانا سیوہارویؒ فرماتے ہیں کہ عورتوں کی نبوت کا انکار کرنا صحیح نہیں ہے، نیز یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ فہرست انبیاء میں دوسری عورتوں کے مقابلے میں حضرت مریم علیہا السلام کی نبوت کے متعلق قرآنی نصوص زیادہ واضح ہیں۔

جو حضرات علماء عورتوں کی نبوت کے قائل ہیں اور حضرت مریم علیہا السلام کو نبی تسلیم کرتے ہیں ان کے مطابق تو آیت وَاصْطَفَاکِ عَلٰی نِسَاءِ الْعَالَمِیْنَ (اور اللہ نے تم کو دنیا کی تمام عورتوں پر فضیلت بخشی ہے) کا مطلب صاف اور واضح ہے وہ یہ کہ حضرت مریم علیہا السلام کو کائنات کی تمام عورتوں پر فضیلت حاصل ہے، جو عورتیں نبی نہیں ہیں ان پر اس لئے کہ حضرت مریم علیہا السلام نبی ہیں اور جو نبی ہیں ان پر اس لئے کہ وہ قرآنی نصوص کے پیش نظر جو ان کے فضائل وکمالات سے تعلق رکھتی ہیں، باقی نبیات پر برتری اور فوقیت رکھتی ہیں، لیکن جو علماء عورتوں کی نبوت کا انکار کرتے ہیں اور حضرت مریم علیہا السلام کو نبی نہیں مانتے وہ یہ کہتے ہیں کہ آیت کا جملہ نساء العالمین عام ہے، اس میں ماضی، حال اور مستقبل کی تمام عورتیں شامل ہیں، اس لئے حضرت مریم علیہا السلام کو بغیر کسی استثناء کے کائنات انسانی کی تمام عورتوں پر فضیلت اور برتری حاصل ہے، اور اکثر کا قول یہ ہے کہ آیت کے لفظ العالمین سے کائنات کی وہ تمام عورتیں مراد ہیں جو حضرت مریم علیہا السلام کی معاصر تھیں۔

اصل موضوع کی طرف واپسی:

اب ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں، حضرت مریم علیہا السلام اپنے حجرے میں جوان کے لئے مسجد اقصیٰ کے قریب مخصوص کیا گیا تھا اور جس کو اس وقت کی اصطلاح میں محراب کہا جاتا تھا مصروف عبادت رہتی تھیں، شب گزارنے کے لئے اپنی خالہ محترمہ ایشاع کے پاس ان کے گھر تشریف لے جاتیں، صبح سویرے پھر اپنے حجرے میں تشریف لے آتیں، اس دوران ان پر پھلوں اور رزق کے دیگر انواع واقسام کی صورت میں انعامات خداوندی کا سلسلہ جاری رہتا، جس سے ان کے خالو حضرت زکریا علیہ السلام جو اپنے وقت کے پیغمبر تھے حیرت زدہ ہو جاتے، اور وہ پوچھتے بھی تھے کہ یہ چیزیں تمہیں کون دے کر جاتا ہے یا کہاں سے آتی ہیں، وہ جواب میں کہتیں کہ میرا رب مجھے دیتا ہے۔

نوید مسیح:

ایک دن حضرت مریم علیہا السلام حسب معمول اپنے خالق و مالک کی عبادت میں مشغول تھیں کہ فرشتے حاضر خدمت ہوئے اور انھوں نے اللہ کی ایک بشارت انہیں سنائی، قرآن کریم میں ہے: إِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ.(۱) "جب فرشتوں نے (حضرت مریم علیہا السلام سے) یہ بھی کہا کہ اے مریم! اللہ تم کو بشارت دیتا ہے ایک کلمے کی جو من جانب اللہ ہوگا، اس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا، وہ دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں معزز ہوں گے، اور اللہ کے نزدیک مقرب بھی ہوں گے، (ان کو معجزہ بھی عطا کیا جائے گا کہ) وہ گہوارے میں یعنی بالکل بچپن میں اور بڑی عمر میں بھی کلام کریں گے، اور وہ اعلا درجے کے صالحین میں سے ہوں گے" اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جس خاص معجزے کا ذکر ہے وہ ماں کی گود میں ان کا کلام کرنا ہے، ظاہر ہے اس وقت کوئی بچہ کلام کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، مگر حضرت عیسی علیہ السلام کلام کریں گے اور لوگ ان کی گفتگو سن کر انگشت بہ دنداں رہ جائیں گے، ماں کی

(۱) آل عمران: ۴۵۔

گود میں کلام کرنا تو بلاشبہ معجزہ ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا، مگر کہولت کے زمانے میں یعنی بڑی عمر میں بھی وہ بولیں گے، کلام کریں گے، یہ کونسا معجزہ ہوا، بڑی عمر میں تو سب ہی کلام کرتے ہیں، اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کیا خصوصیت ہوئی، اس سلسلے میں حضرت مولانا مفتی شفیع عثمانیؒ معارف القرآن میں لکھتے ہیں کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعے اور ان کی پوری تاریخ پر غور کیا جائے تو اس جگہ ادھیڑ عمر میں کلام کرنے کا تذکرہ ایک مستقل عظیم فائدے کے لئے ہو جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ اسلامی اور قرآنی عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھالیا گیا ہے، روایات سے یہ بات ثابت ہے کہ ان کو اٹھانے کے وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عمر تیس پینتیس سال کے درمیان تھی جو عین عنفوان شباب کا زمانہ ہے، ادھیڑ عمر جس کو عربی میں کہولت کہتے ہیں وہ اس دنیا میں ان کی ہوئی نہ تھی، اس لئے ادھیڑ عمر میں لوگوں سے کلام جب ہی ہوسکتا ہے جب کہ وہ دنیا میں پھر تشریف لائیں، اس لئے یہ جس طرح ان کے بچپن کا کلام معجزہ تھا، اسی طرح ان کے ادھیڑ عمر کا کلام بھی معجزہ ہے۔

بہ ہر حال حضرت مریم علیہا السلام کے پاس فرشتے آئے اور انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی بشارت دی یہ سن کر حضرت مریم علیہا السلام حیرت زدہ رہ گئیں، اور کہنے لگیں کہ ''میرے بچہ کس طرح ہوگا جب کہ مجھے تو کسی انسان نے چھوا تک نہیں ہے'' وہ جانتی تھیں کہ کوئی بچہ بدون مرد کے پیدا نہیں ہوسکتا، مگر وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ یہ بچہ محض قدرت خداوندی سے اس طرح ہوگا کہ کسی مرد کی ضرورت نہ ہو، یا ان کو کسی سے نکاح کے لئے کہا جائے گا تب بچے کی پیدائش عمل میں آئے گی۔

حضرت مریم کی گزارش:

حضرت مریم علیہا السلام نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا کہ الٰہا! میں کنواری ہوں، مجھے آج تک کسی مرد نے چھوا تک نہیں ہے، نہ میں نے کسی سے نکاح کیا اور نہ میں زانیہ ہوں، جواب آیا، یہ ہمارا فیصلہ ہے، ہم جس کو چاہتے ہیں اس کو اسی طرح پیدا کرتے ہیں، اور جب ہم کوئی فیصلہ کرلیتے ہیں تو کُن کہتے ہیں اور وہ چیز وجود میں آجاتی ہے، بہ طور تسلی

حضرت مریم علیہا السلام سے یہ بھی فرمایا گیا کہ ہم اس بچے کو اپنی کتاب عطا کریں گے، اس کو حکمت سکھلائیں گے، اس کو تورات وانجیل کا علم دیں گے اور اسے بنی اسرائیل میں اپنا رسول بنا کر بھیجیں گے، حضرت مریم علیہا السلام یہ حتمی اور قطعی جواب سن کر خاموش ہو گئیں، جبرئیل امین نے یہ بشارتیں سنانے کے بعد ان کے گریبان میں پھونکا اور واپس تشریف لے گئے، کچھ دنوں کے بعد حضرت مریم علیہا السلام نے محسوس کیا کہ وہ حاملہ ہو چکی ہیں، اس احساس نے ان کو اضطرابی کیفیت میں مبتلا کر دیا، کیوں کہ وہ بہ ہر حال انسان تھیں اور یہ خیال انہیں ستا رہا تھا کہ جب ان کے حمل کی کیفیت لوگوں پر ظاہر ہوگی تو وہ ان کے متعلق کیا کہیں گے اور جو لوگ آج ان کو مقدس، عفت مآب اور قابل احترام شخصیت سمجھتے ہیں وہ کل کو ان پر بہتان لگانے سے بھی باز نہیں آئیں گے، کسی کو یہ یقین دلانا ہر حال میں مشکل ہوگا کہ یہ حمل کسی انسانی کارکردگی کے بغیر فرشتے کی پھونک سے وجود میں آیا ہے، اس احساس نے ان کو اپنے حجرے تک محدود کر دیا، اور جب ولادت کا وقت قریب آیا تو وہ یہ سوچ کر کہ یروشلم (بیت المقدس) سے تقریباً نو میل دور کوہ سراۃ (ساعیر) کی ایک پہاڑی پر چلی گئیں جو اب بیت اللحم کے نام سے مشہور ہے، چند دنوں کے بعد درد زہ شروع ہوا، تنہا تھیں، مشکل وقت شروع ہونے والا تھا، آنے والی تکلیف کا احساس، اور ولادت کے بعد ہونے والی بدنامی کا خوف انہیں بے چین کئے ہوئے تھا، کھجور کے ایک تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھی ہوئی وہ انتہائی مایوسی کے عالم میں یہ کہہ رہی تھیں: کاش میں بچہ پیدا ہونے سے پہلے ہی مر جاؤں اور بھولی بسری داستان بن جاؤں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش:

اللہ رب العزت کو ان کی حالتِ زار پر رحم آیا، ایک فرشتہ نمودار ہوا اور اس نے کہا کہ اے مریم! غمگین مت ہو، تیرے رب نے تیرے نیچے ایک نہر جاری کر دی ہے، تو کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلا، تازہ اور پکی ہوئی کھجور کے خوشے تجھ پر گریں گے، کھا پی اور اپنے بچے سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر، فرشتے کی تسلی آمیز باتوں سے حضرت مریم علیہا السلام کا اضطراب کچھ کم ہوا، ادھر ولادت بھی ہوگئی، بچہ گود میں آیا تو وہ اپنا تمام دکھ درد بھول گئیں

اور ہر وقت اس میں مگن رہنے لگیں، کبھی کبھی یہ خیال انہیں ستاتا کہ جب میں یروشلم واپس جاؤں گی اور لوگ دیکھیں گے کہ میں ایک بچہ اپنی گود میں لے کر واپس آئی ہوں تو وہ لوگ کتنی باتیں بنائیں گے، مجھ سے اس کے باپ کے متعلق پوچھیں گے، میں کیا جواب دوں گی، وحی آئی کہ اے مریم! جب تو اپنی قوم میں پہنچے، اور لوگ تجھ سے اس بچے کے متعلق کوئی سوال کریں تو انہیں اشارے سے یہ بتلا کر خاموشی اختیار کر لینا کہ میں نے روزہ رکھا ہوا ہے، میں آج کسی سے بات نہیں کر سکتی، البتہ اگر تمہیں کچھ پوچھنا ہے تو اس بچے سے پوچھ لو، ایسا ہی ہوا حضرت مریم علیہا السلام اللہ کا حکم پا کر یروشلم کی طرف چلیں، ننھا بچہ ان کی گود میں تھا، لوگوں نے ان کو اس حال میں دیکھا تو کہنے لگے کہ تو نے تو بڑی تہمت کا کام کیا ہے، اے ہارون کی بہن! نہ تو تیرا باپ برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں فاحشہ عورت تھی، پھر تو کہاں سے ایسی ہو گئی، ہارون ان کے سگے بھائی نہیں تھے، بل کہ کسی رشتے سے ان کے بھائی ہوتے تھے، بڑے عابد زاہد اور نیک انسان تھے، طعنہ دینے والوں نے اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لئے اور انہیں عار دلانے کے لئے ہارون کا بھی حوالہ دیا، اور ماں باپ کی نیکی اور تقویٰ کا بھی حوالہ دیا، حضرت مریم علیہا السلام نے کسی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، نہ اپنی صفائی پیش کی، بل کہ اپنے رب کے حکم پر عمل کرتے ہوئے اشارے سے کہا کہ میں روزے سے ہوں اور میں نے اپنے رب سے یہ نذر مانی ہے کہ میں آج کسی سے بات نہیں کروں گی، بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے یہ بھی کہا کہ اگر تمہیں کچھ معلوم کرنا ہے تو اس نومولود سے پوچھ لو، وہ خود اپنے متعلق تمہیں جواب دے کر مطمئن کر دے گا، لوگ کہنے لگے، اے مریم! تم کس طرح کی باتیں کر رہی ہو، ہم اس بچے سے جو ابھی چند روز پہلے ہی پیدا ہوا ہے کیا پوچھ سکتے ہیں، کیا اتنا چھوٹا بچہ ہماری بات سمجھ سکتا ہے اور کیا وہ بات کر سکتا ہے، ابھی وہ لوگ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ شیر خوار بچہ بول اٹھا، میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی ہے، اور نبی بنایا ہے اس نے مجھے بابرکت ہستی بنایا ہے خواہ میں کہیں بھی رہوں، اس نے مجھے نماز اور زکوۃ کا حکم دیا ہے، جب تک میں زندہ رہوں مجھے اس کے حکم پر عمل کرنا ہے، اور مجھے اپنی والدہ کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرنے کا حکم ہے، اس نے مجھے خودسر اور نافرمان نہیں بنایا، میرے لئے سلامتی ہے جس روز میں

پیدا ہوا اور اس روز بھی مجھ پر سلامتی ہوگی جس دن میں مروں گا اور جس دن میں زندہ اٹھایا جاؤں گا۔

نومولود کو گویائی ملی:

نومولود بچے کی زبان سے یہ فصیح و بلیغ گفتگو سن کر قوم کے لوگ حیرت زدہ رہ گئے، انہیں یقین آ گیا کہ یہ بچہ کوئی مافوق الفطرت ہستی ہے، جو دنیا کے متعارف طریقے سے ہٹ کر وجود میں آئی ہے، بلاشبہ مریم ایک پاکباز خاتون ہیں، ان کے بطن سے بچّے کی پیدائش اللہ کی طرف سے ایک نشان ہے، قرآن کریم میں بھی اس واقعے کو ایک نشان ہی قرار دیا گیا ہے، فرمایا ''ہم نے عیسیٰ ابن مریم اور اس کی ماں کو (اپنی قدرت کا) ایک نشان بنا دیا، اور ان دونوں کو ایسے بلند مقام پر ٹھکانا دیا جو سکونت کے قابل اور چشمے والا ہے'' اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم قوم کو مطمئن کرنے کے بعد یروشلم سے واپس چلی گئیں اور اسی ٹیلے پر جا کر مقیم ہوگئیں جہاں بچے کی پیدائش عمل میں آئی تھی۔

عیسائیوں کے وفد کی آمد:

قرآن کریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے متعلق صرف یہی تفصیلات بیان کی ہیں، لیکن حضرت وہب ابن منبہؒ کے حوالے سے کتبِ تفسیر میں کچھ اور واقعات بھی ذکر کئے گئے ہیں، ان میں ایک واقعہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ جس رات حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے فارس کے بادشاہ نے آسمان پر ایک ستارہ دیکھا جو غیر معمولی طور پر روشن نظر آ رہا تھا، بادشاہ نے ستاروں کا علم رکھنے والوں کو بلا کر اس ستارے کے متعلق دریافت کیا، انھوں نے کہا کہ اس طرح کے ستارے عموماً اس وقت طلوع ہوتے ہیں جب کوئی عظیم الشان ہستی دنیا میں آتی ہے، یہ ہستی ملک شام میں پیدا ہوئی ہے، کاہنوں اور نجومیوں کی زبانی بادشاہ نے یہ سن کر کچھ لوگوں کو شام روانہ کیا، ان کے ساتھ خوشبوؤں کے تحفے بھی بھیجے، یہ لوگ شام پہنچے تو وہاں کے یہودیوں کو اپنی آمد کے مقصد سے آگاہ کیا، یہودیوں نے اہل فارس کی زبان سے اس طرح کی باتیں سنیں تو اپنے بادشاہ ہیرودوس کو اس کی خبر دی کہ فارس سے ایک وفد آیا ہے اور اسے کسی نومولود کی تلاش ہے جو ان کے خیال

میں غیر معمولی ہستی بننے والی ہے، بادشاہ یہ سن کر بہت گھبرایا، اس نے وفد سے کہا کہ وہ اس بچے کو ضرور تلاش کریں اور اسے بھی مطلع کریں، وفد شام سے یروشلم کی طرف چلا، وہاں جا کر بچے کے متعلق پوچھا تو لوگوں نے حقیقت حال بتلا دی کہ اس طرح کا ایک بچہ ہمارے یہاں پیدا ہوا ہے، جو یہ کہتا ہے کہ وہ اللہ کا نبی ہے، اور اس کی پیدائش بھی بغیر باپ کے حیرت انگیز طریقے پر ہوئی ہے، لوگوں نے وفد کو بیت اللحم کا پتہ بتلا دیا کہ دونوں ماں بیٹے وہاں رہتے ہیں، فارس کے لوگ نومولود کی زیارت کے لئے بیت اللحم پہنچے، بچے کو دیکھ کر سجدۂ تعظیمی بجالائے، جو خوشبوئیں ان کے ساتھ تھیں وہ نچھاور کیں، چند روز وہاں قیام کیا، اسی دوران وفد کے کسی شخص نے خواب میں دیکھا کہ شام کا بادشاہ بچے کو ایذا پہنچانا چاہتا ہے، وفد نے طے کیا کہ اب وہ واپسی پر شام سے ہو کر نہیں گزریں گے اور نہ بادشاہ سے ملاقات کریں گے، بیت اللحم سے رخصت کے وقت انھوں نے بچے کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام سے کہا کہ وہ اس بچّے کا خاص خیال رکھیں، اور اس کی حفاظت میں غفلت نہ کریں، بہتر ہوگا کہ آپ اس بچّے کو لے کر کسی دوسری جگہ چلی جائیں، ہمیں ڈر ہے کہ یہودی بادشاہ ہیرودوس اس بچے کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا، اس مشورے کے بعد حضرت مریم علیہا السلام نے مصر جانے کا فیصلہ کیا جہاں ان کے کچھ عزیز رہتے تھے، مصر سے وہ ناصرہ چلی گئیں، جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عمر تیرہ برس ہوگئی تو وہ انہیں لے کر یروشلم واپس آئیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا حلیۂ مبارک:

اس سے پہلے کہ ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت و رسالت پر گفتگو کریں ان کے حلیہ مبارک پر کچھ روشنی ڈالتے ہیں، بخاری شریف میں حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک حدیث ہے فرماتے ہیں کہ معراج کی رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام سمیت بہت سے انبیاء کرام سے ملاقات فرمائی، آپ صحابۂ کرامؓ سے بعض حضرات انبیاء کرام کا حلیہ بیان فرمایا کرتے تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ارشاد فرمایا: میری ملاقات حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ہوئی تو میں نے انہیں میانہ قد اور سرخ و سفید پایا، بدن ایسا صاف شفاف گویا ابھی نہا کر نکلے ہیں، محسوس ہوتا تھا

کہ سر کے بالوں سے پانی کے قطرات ٹپک رہے ہیں، حالاں کہ ان کے بال خشک تھے، ان کے گیسو کاندھوں تک لٹکے ہوئے تھے، وہ تمہارے عروہ بن مسعود الثقفی سے زیادہ مشابہت رکھتے تھے، اس ملاقات کے وقت میرے پاس تین پیالے لائے گئے، ایک میں دودھ تھا، دوسرے میں شہد اور تیسرے میں شراب تھی، میں نے دودھ کا پیالہ اٹھالیا یہ دیکھ کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مجھ سے فرمایا کہ تم اور تمہاری امت دین فطرت پر قائم رہے گی، بخاری شریف میں ہی ایک روایت حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی ہے کہ سرکار دوعالم نے ارشاد فرمایا کہ اُس رات مجھ کو کعبے کے مناظر دکھلائے گئے، وہاں میں نے ایک شخص کو دیکھا جن کا رنگ گندمی تھا، گندمی رنگ کے لوگوں میں اتنے حسین تم نے کم ہی دیکھے ہوں گے، ان کے گیسو دراز تھے، اتنے حسین گیسو تم نے کم ہی دیکھے ہوں گے، ان کے بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا، وہ دو لوگوں کے سہارے طواف کر رہے تھے، میں نے (فرشتوں سے) پوچھا یہ کون صاحب ہیں، مجھے بتلایا گیا کہ یہ مسیح ابن مریم ہیں، ان دونوں روایات کو ذکر کرنے کے بعد حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے لکھا ہے کہ دونوں روایتوں میں اداء اور تعبیر کا فرق ہے، حسن میں اگر صباحت کے ساتھ ملاحت کی آمیزش بھی ہوتی ہے تو اس رنگ میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، کسی وقت اگر سرخی جھلک آئے تو صباحت نمایاں ہو جاتی ہے اور اگر کسی وقت ملاحت غالب آجائے تو چہرے پر حسن ولطافت کے ساتھ کھلتا ہوا گندم گوں رنگ چمکنے لگتا ہے، اس لئے بہ ظاہر ان دونوں روایتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

بنی اسرائیل کی دینی اور معاشرتی صورت حال:

حضرت مولانا حفظ الرحمٰنؒ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے پہلے بنی اسرائیل کی دینی اور معاشرتی احوال کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، لکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل بنی اسرائیل ہر قسم کی برائیوں میں مبتلا تھے اور انفرادی واجتماعی عیوب ونقائص کا کوئی پہلو ایسا نہیں تھا جو ان سے بچ رہا ہو، وہ اعتقاد واعمال دونوں ہی قسم کی گمراہیوں کا مرکز ومحور بن گئے تھے، حتی کہ اپنی ہی قوم کے ہادیوں اور پیغمبروں کے قتل تک پر جری اور دلیر ہو گئے تھے، یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس نے اپنی محبوبہ کے کہنے پر وقت کے پیغمبر حضرت یحیٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا تھا، صرف اس لئے کہ وہ ہیرودیس اور اس عورت کے ناجائز تعلق پر

اعتراض کرتے تھے، یہ عبرتناک واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے بعد نبوت سے قبل پیش آیا، بستانی کی دائرۃ المعارف الاسلامیہ میں یہود سے متعلق جو مقالہ ہے اس میں صاف لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے قبل یہود کے عقائد واعمال کا یہ حال تھا کہ وہ مشرکانہ رسوم وعقائد کو مذہب کا جزء بنا چکے تھے، اور جھوٹ، فریب، بغض وحسد جیسی بداخلاقیوں کو تو عملاً اخلاقِ کریمانہ کی حیثیت دے رکھی تھی اور اسی بنا پر وہ عادات بد پر بجائے شرمسار ہونے کے فخر کیا کرتے تھے، ان کے علماء واحبار نے تو دنیا کے لالچ اور حرص میں کتاب اللہ (تورات) تک میں تحریف کرڈالی، اور درہم ودینار کے عوض اللہ کی آیات فروخت کرنے کا شیوہ اختیار کرلیا، عوام سے نذرانے وصول کرنے کی خاطر حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانے سے بھی دریغ نہیں کیا، اور اس طرح قانون الٰہی کو مسخ کرڈالا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت:

ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے ایک اور اولوالعزم اور برگزیدہ پیغمبر کو ایک نئی کتاب ہدایت کے ساتھ مبعوث کرنے کا ارادہ فرمایا، سورۂ بقرہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ورسالت کا ذکر کچھ اس طرح ہے ''اور بے شک ہم نے موسیٰ کو کتاب تورات عطا کی، اور اس کے بعد ہم تم میں پیغمبر بھیجتے رہے اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو واضح معجزے دے کر بھیجا، اور ہم نے اس کو روح پاک جبرئیل کے ذریعے قوت وتائید عطا کی'' پیغمبری کے منصب پر سرفراز ہونے کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا! میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے اپنی نبوت پر کافی نشانیاں لے کر آیا ہوں، اور وہ نشانیاں یہ ہیں کہ میں مٹی گارے سے پرندے کی شکل کی ایک چیز بناتا ہوں پھر میں اس مصنوعی شکل کی چیز میں پھونکتا ہوں اور وہ چیز اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے، میں مادر زاد اندھے کو اور برص کی بیماری میں مبتلا آدمی کو اچھا کردیتا ہوں، اور میں مردے کو بھی زندہ کردیتا ہوں اور میں یہ بھی بتلادیتا ہوں کہ تم کیا کھا کر آئے ہو اور تم نے اپنے گھروں میں کیا رکھ چھوڑا ہے، اگر تم ایمان لانا چاہو تو تمہارے لئے یہ کافی نشانیاں ہیں، اتنا ہی نہیں میں اس کتاب کی بھی تصدیق کرتا ہوں جو تمہارے پاس ہے یعنی

تورات، اس کے علاوہ میں بعض وہ چیزیں جو تم پر حرام کی گئیں تھی حلال کردوں گا، میں تمہارے پاس دلیل وحجت کے ساتھ آیا ہوں اب یہ تمہارا فرض بنتا ہے کہ تم اللہ سے ڈرو اوراس کی اطاعت کرو، اللہ ہی میرا اور تمہارا رب ہے، اسی کی عبادت کرو یہی راستہ سیدھا راستہ ہے۔

معجزاتِ مسیح:

انبیاء کرام کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی سنت یہی رہی ہے کہ وہ اپنے نیک وپاک باز بندوں کو ان کی قوموں کے پاس بھیجنے سے پہلے کچھ ایسے معجزات عطا کرتا ہے جو ان کی نبوت پر حجت ہوں اور جنہیں دیکھ کر ان کی قوم کے لوگ ایمان لے آئیں، یہ معجزات اس زمانے کے تقاضے کے مطابق عطا کئے جاتے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جادو کا زیادہ شور تھا اور اس فن میں مہارت کو شان امتیاز سمجھا جاتا تھا، اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ید بیضاء اور عصا جیسے معجزات عطا کئے گئے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی ان کے زمانے کے مطابق معجزات عطا کئے گئے، اس وقت طب اور فلسفے کا زیادہ چرچا تھا، صدیوں سے بڑے بڑے اطباء اور فلاسفہ اپنی دانش وحکمت اور اپنے کمالات کا مظاہرہ کررہے تھے، قوموں میں ایسے ماہرین فن موجود تھے جن کے علاج سے مایوس مریض شفا پالیا کرتے تھے، بل کہ بہت سے لوگ تو حقائق اشیاء میں تغیر بھی کردیا کرتے تھے، لیکن ابھی تک کوئی ایسا شخص پیدا نہیں ہوا تھا جو مٹی کے ہیولیٰ میں جان ڈال سکے، جو مادر زاد اندھے کو بینا کرسکے، جو برص (کوڑھ) میں مبتلا شخص کو اچھا کردے، جو مردہ بدن میں جان ڈال دے، تفسیر کی کتابوں میں ان چاروں معجزات کی تفصیل بھی ملتی ہے، چناں چہ پہلے معجزے پرندے پیدا کرنے کے سلسلے میں مفسرین لکھتے ہیں کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے نبوت کا دعویٰ کیا اور معجزات دکھائے تو لوگوں نے درخواست کی آپ چمگادڑ پیدا کرکے دکھائیں آپ نے مٹی سے چمگادڑ کی صورت بنالی پھر اس میں پھونک ماری تو وہ اڑنے لگی، تفسیر خازن اور تفسیر جمل میں ہے کہ دوسرے پرندوں کے مقابلے میں چمگادڑ کی ہیئت ترکیبی الگ ہے، وہ اڑنے والے جانوروں میں اس لئے عجیب ہے کہ وہ بغیر پروں کے اڑتی

ہے، دانت رکھتی ہے اور ہنستی ہے، اس کی مادہ کے چھاتی ہوتی ہے اور وہ بچہ جنتی ہے جب کہ اڑنے والے جانوروں میں یہ باتیں نہیں ہوتیں۔

بیماروں کی شفا:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس مریض کو بھی اچھا کر دیتے تھے جو پیدائشی اندھا ہو، اور جس کا کوڑھ پورے بدن میں پھیل گیا ہو، حضرت وہب بن منبہؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس ایک ایک دن میں پچاس پچاس ہزار مریضوں کا اجتماع ہو جاتا تھا، جو چل سکتا وہ خود حاضر خدمت ہو جاتا اور جو عاجز ہوتا اس کے پاس حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود تشریف لے جاتے اور اس کی آنکھوں پر یا بدن پر ہاتھ پھیر کر اس شرط کے ساتھ اس کو تندرست کر دیتے کہ وہ ان پر ایمان لائے گا۔

مُردوں کی زندگی:

مردوں کو زندہ کرنے کے سلسلے میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ایک روایت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے چار لوگوں کو ان کے مرنے کے بعد زندہ کیا، ایک عازر جس کو پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ انتہائی مخلصانہ اور والہانہ محبت وعقیدت تھی، جب وہ مرنے کے قریب ہوا تو اس کی بہن نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس کی اطلاع دی، مگر آپ تین دن کی مسافت کے فاصلے پر تھے اس لئے اس کی زندگی میں نہ پہنچ پائے، مرنے کے بعد اس کے گھر تشریف لے گئے اور اس کی بہن سے کہا کہ ہمیں اس کے قبر پر لے چلو، وہ لے گئی، آپ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی، عازر زندہ ہو کر قبر سے باہر آ گیا اور عرصۂ دراز تک زندہ رہا، یہاں تک کہ اس نے نکاح بھی کیا اور اس کے یہاں اولاد بھی ہوئی۔

دوسرا شخص جس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندہ کیا وہ ایک بڑھیا کا لڑکا تھا، جو کسی بیماری میں مبتلا ہو کر مر گیا تھا، بڑھیا اپنے اکلوتے بیٹے کو کھو کر بے حد غم زدہ تھی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سامنے سے اس کا جنازہ گزرا، آپ نے اس کے لئے دعا فرمائی، وہ زندہ ہو کر جنازہ اٹھانے والوں کے کاندھوں سے اتر پڑا، کپڑے پہنے،

گھر آ گیا، اس کے بعد کافی دنوں تک زندہ رہا، اس کے یہاں بھی اولاد ہوئی، تیسری ایک لڑکی تھی جو مرنے کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دُعا سے زندہ ہوگئی، چوتھے سام بن نوح تھے، جن کی وفات کو ہزاروں برس گزر چکے تھے، لوگوں نے آپ علیہ السلام سے درخواست کی کہ ان کو زندہ کر دیں، معلوم کیا کہ ان کی قبر کہاں ہے، لوگوں کے بتلانے پر ان کی قبر پر تشریف لے گئے اور اللہ سے دُعا کی، سام بن نوح زندہ ہوکر قبر سے باہر نکل آئے، وہ کہتے تھے کہ میں قبر میں تھا کہ ایک آواز آئی کہ روح اللہ یعنی حضرت عیسیٰ روح اللہ علیہ السلام کی بات سنو، یہ سنتے ہی میں خوف زدہ ہوکر اٹھ بیٹھا، مجھے گمان ہوا کہ شاید قیامت قائم ہوگئی، سام بن نوح حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے، پھر ان سے درخواست کی کہ ان کے لئے دوبارہ موت کی دُعا فرمائیں، اس کے ساتھ ہی یہ بھی درخواست کی کہ موت اس طرح آئے کہ سکرات موت طاری نہ ہوں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دُعا کی اور اسی وقت وفات پاگئے، یہ چاروں واقعات تفسیر قرطبی اور تفسیر جمل میں موجود ہیں، مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب بھی کسی مردہ کو زندہ فرماتے یہ ضرور کہتے قُم باذن اللہ (اللہ کے حکم سے کھڑا ہوجا) اس میں ان عیسائیوں کا رد ہے جو اس معجزے کی بنا پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کے قائل ہیں۔

بنی اسرائیل کا انکار:

بنی اسرائیل کے سامنے یہ معجزات آئے جو ان کو یقین دلانے کے لئے کافی تھے مگر انھوں نے کہا کہ یہ تو جادو ہے، آپ اور کوئی معجزہ دکھایئے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ جو تم کھاتے ہو اور جو تم اپنے گھروں میں جمع کر کے رکھتے ہو میں اس کی خبر دے سکتا ہوں، چناں چہ انھوں نے یہ معجزہ بھی کر دکھایا کہ وہ کسی شخص کے پوچھنے پر اس کو یہ بتلا دیتے تھے کہ اس نے کیا کھایا ہے وہ اپنے گھر میں کیا چیز رکھ کر آیا ہے، مفسر قرطبی نے لکھا ہے کہ بہت سے بچے آپ کے ارد گرد جمع ہوجاتے اور آپ انہیں بتلاتے کہ تمہارے گھر فلاں چیز پکی ہے، تمہارے گھر کھانے کی فلاں چیز موجود ہے، بچے گھر جاتے اور وہ اپنے والدین سے وہ چیز طلب کرتے، والدین حیرت سے پوچھتے کہ یہ بات تمہیں کس نے بتلائی، و

کہتے کہ ہمیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بتلایا ہے، لوگوں نے اپنے بچوں کو ان کے پاس جانے اور ان سے ملنے سے روک دیا اور کہا کہ وہ جادوگر ہیں ان سے نہ ملا کرو، ایک مرتبہ لوگوں نے اپنے بچوں کو کسی مکان میں بند کر دیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام بچوں کو تلاش تلاش کرتے وہاں پہنچ گئے، لوگوں نے کہا بچے یہاں نہیں ہیں، پوچھا پھر مکان کے اندر کون ہے، لوگوں نے کہا سور ہیں، فرمایا اچھا ایسا ہی ہوگا، اب جو دروازہ کھولا تو اندر سور ہی سور تھے۔

منکرین نبوت:

دنیا میں جتنے بھی انبیاء کرام علیہم السلام تشریف لائے ہیں ان کی قوموں نے اوّلاً ان کی تکذیب ہی کی ہے، پھر اللہ نے ان کے ذریعے کچھ معجزات دکھلائے جنھیں دیکھ کر کچھ لوگوں کے دلوں کی مٹی نرم ہوئی اور وہ اپنے پیغمبروں پر ایمان لانے میں کامیاب ہو گئے، اکثریت کا حال پھر بھی ایسا ہی رہا، پیغمبروں کی کوئی نصیحت، کوئی انذار کوئی تبشیر، کوئی معجزہ ان کو راہ حق پر لانے میں کامیاب نہ ہوتا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا، زیادہ تر لوگ کھلی آنکھوں معجزے دیکھنے کے باوجود ٹس سے مس نہ ہوئے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو برابر حجت و برہان اور آیات اللہ (معجزات) کے ذریعے دین حق کی تعلیم دیتے رہتے تھے اور ان کے بھولے ہوئے سبق کو یاد دلاتے رہتے تھے، مگر بد بخت یہودی اپنی فطرت کی کجی اور صدیوں کی سرکشی، بے راہ روی اور خدائی تعلیمات سے سرکشی و بغاوت کی بنا پر اس قابل ہی نہیں رہے تھے کہ وہ اس آواز کو جو ان کو حیات تازہ بل کہ حیاتِ جاودانی بخشنے کے لئے دی جا رہی تھی گوش حق نیوش سے سنتے اور اس پر لبیک کہتے اس کے بجائے انھوں نے تکذیب و تضحیک کا راستہ اختیار کیا، جس قوم نے اپنے پیغمبروں کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہ کیا ہو وہ اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتی تھی، لوگ ان پر پھبتیاں کستے، ان کا مذاق اڑاتے، ان کو ایذاء پہنچاتے، معاندت اور مخالفت کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جو ان بد بختوں نے اختیار نہ کیا ہو۔

کچھ سعید روحیں:

مگر اس قوم میں کچھ لوگ، کچھ پاکیزہ نفوس اور کچھ سعید روحیں ایسی بھی تھیں

جنھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دست حق پر ایمان لانے میں سبقت کی، وہ ایمان لائے، اس پر ثابت قدم رہے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایمانی مشن میں ان کے معین ومددگار بھی رہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو حواری کے لقب سے سرفراز کیا ہے، قرآن کریم میں ہے: وَإِذْ أَوْحَيْتُ إِلَى الْحَوَارِيِّينَ أَنْ آمِنُوا بِي وَبِرَسُولِي قَالُوا آمَنَّا وَاشْهَدْ بِأَنَّنَا مُسْلِمُونَ.(۱) ''اے عیسیٰ وہ وقت یاد کرو جب کہ میں نے حواریوں کی جانب آپ کی معرفت یہ وحی کی کہ مجھ پر اور میرے پیغمبر پر ایمان لاؤ تو انھوں نے کہا ہم ایمان لائے اور اے اللہ تو گواہ رہنا، بلاشبہ ہم مسلمان ہیں''۔ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّينَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ فَآمَنَتْ طَائِفَةٌ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَكَفَرَتْ طَائِفَةٌ فَأَيَّدْنَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَى عَدُوِّهِمْ فَأَصْبَحُوا ظَاهِرِينَ.(۲) ''عیسیٰ ابن مریم نے اپنے حواریوں سے کہا کہ اللہ کے راستے میں کون میرا مددگار ہے تو حواریوں نے جواب دیا، ہم ہیں اللہ کی راہ میں مددگار، چناں چہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت ایمان لائی اور ایک گروہ نے کفر اختیار کیا، سو ہم نے اہل ایمان کی ان کے دشمنوں کے مقابلے میں تائید کی چناں چہ وہ غالب رہے''۔ مگر یہ لوگ اقتصادی اور سماجی اعتبار سے بہت کم زور اور پس ماندہ طبقات سے تعلق رکھتے تھے، کوئی مزدور تھا، کوئی بڑھئی تھا، کوئی معمار تھا، باعزت اور دولت مند لوگ اس دعوت سے رُخ پھیرے ہوئے تھے، رُخ کیا پھیرے ہوئے تھے کھلی دشمنی پر اتر آئے تھے، اور جان لینے کے درپے ہوگئے تھے، قرآن کریم نے یہ واقعات تفصیل سے بیان کئے ہیں، سورۂ آل عمران کی آیات ۵۴ اور ۵۵ میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دینے کی سازش کی اور اللہ نے اپنی تدبیر سے اس سازش کو ناکام بنادیا۔

بنی اسرائیل میں سے جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے منکر تھے انھوں نے آپ کو ہلاک کرنے کی سازش کی اور مکروحیلہ سے آپ کو ایسی جگہ لے گئے جہاں کوئی ان کی مدد کو نہ پہنچ پاتا، مقصد یہ تھا کہ کسی درخت وغیرہ میں لٹکا کر ان کو پھانسی دیدیں گے اور روز روز کا یہ قصہ ہی ختم کردیں گے، مگر اللہ نے اپنے پیغمبر کو محفوظ رکھا، ان ہی میں

(۱) المائدۃ:۱۱۱۔(۲) الصف:۱۴۔

سے ایک شخص کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شکل دیدی، انھوں نے اس شخص کو عیسیٰ سمجھ کر پھانسی پر لٹکا دیا، اللہ نے اپنے بندے اور پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تسلی اور تشفی دیتے ہوئے فرمایا: إِذْ قَالَ اللّٰهُ يَا عِيسىٰ إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ.(۱) ''اے عیسیٰ میں تم کو (وقت موعود پر طبعی طور پر) وفات دینے والا ہوں اور (فی الحال) میں تم کو اپنے (عالم بالا) کی طرف اٹھائے لیتا ہوں اور تم کو ان لوگوں کی (تہمت سے) پاک کرنے والا ہوں جو تمہارے منکر ہیں قیامت کے دن تک، پھر میری ہی طرف تم سب کو واپس آنا ہے، تب میں فیصلہ کروں گا ان امور میں جن میں تم باہم اختلاف کرتے تھے''۔

اللہ رب العزت کے پانچ وعدے:

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پانچ وعدے کئے ہیں، ایک وعدہ تو یہ کیا ہے کہ ہم تمہیں ان بد بخت یہودیوں کے ذریعے ہلاک نہیں کریں گے بل کہ جب وقت آئے گا تمہیں طبعی طور پر موت دیں گے، ہمارے عقیدے کے مطابق یہ وقت موعود قیامت کے قریب آئے گا جیسا کہ متواتر احادیث میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے قریب آسمان سے دنیا میں تشریف لائیں گے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول اور وفات مستقل ایک عقیدہ ہے، اس پر تفصیلی گفتگو ضروری ہے، لیکن اس سے پہلے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پانچ وعدے کون کون سے کئے ہیں؟

اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے دوسرا وعدہ یہ فرمایا کہ ہم تمہیں فی الحال طبعی موت نہیں دیں گے بل کہ عالم بالا کی طرف اٹھالیں گے، یہ وعدہ بھی پورا ہوا، قرآن کریم کی سورۂ نساء میں رفع عیسیٰ کی خبر دی گئی ہے، ارشاد ربانی ہے: وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ إِلَيْهِ.(۲) ''یقیناً یہودیوں نے ان کو قتل نہیں کیا بل کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی

(۱) آل عمران:۵۵۔(۲) النساء:۱۵۷،۱۵۸۔

طرف اٹھالیا‘‘ تیسرا وعدہ یہ کیا گیا تھا کہ جو تہمتیں اور الزام تراشیاں یہود تمہارے خلاف کرتے ہیں ہم ان تہمتوں سے اور الزامات سے تم کو پاک وصاف کردیں گے، یہ وعدہ اس طرح پورا ہوا کہ خاتم النبیین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپ نے یہود کے ان تمام الزامات کی تردید کی جو الزامات اہل کفر لگاتے رہتے تھے، مثلاً وہ یہ کہتے تھے کہ عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے ہیں، نعوذ باللہ وہ ولد الزنا ہیں، قرآن کریم نے ان کے اس الزام کی یہ کہتے ہوئے نفی کی کہ بغیر باپ سے بچے کی پیدائش اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت سے عمل میں آئی ہے، اور یہ کوئی بڑا تعجب خیز معاملہ نہیں ہے، اس سے زیادہ تعجب تو حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش پر ہونا چاہئے کہ وہ ماں باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے۔

چوتھا وعدہ یہ تھا کہ ہم آپ کے متبعین کو آپ کے منکرین پر غالب کریں گے، یہ وعدہ بھی پورا ہوا، اور وہ اس طرح کہ اس وقت سے آج تک اور آج سے قیامت تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے والے یعنی نصاریٰ اور مسلمان یہودیوں پر بہ اعتبار تعداد کے اور بہ اعتبار دنیوی اقتدار وحکومت کے غالب رہے ہیں، اور غالب رہیں گے، حضرت مفتی محمد شفیع عثمانیؒ نے معارف القرآن میں تحریر فرمایا ہے کہ یہاں اتباع سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا اعتقاد واقرار مراد ہے، ان کے سب احکام پر ایمان واعتقاد کی شرط نہیں، اس طرح نصاریٰ اور اہل اسلام دونوں اس میں داخل ہوگئے کہ دونوں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت ورسالت کے معتقد ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ صرف اتنا اعتقاد نجاتِ آخرت کے لئے کافی نہیں ہے بل کہ نجات آخرت اس پر موقوف ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تمام احکام پر اعتقاد وایمان رکھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قطعی اور ضروری احکام میں سے ایک حکم یہ بھی تھا کہ ان کے بعد پیغمبر آخر الزماں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں، نصاریٰ نے اس حکم کو نہیں مانا، اس لئے نجات آخرت سے محروم رہے، مسلمانوں نے اس پر عمل کیا اس لئے نجات آخرت کے مستحق بنے۔

آسمان پر اٹھائے جانے کا مسئلہ:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سلسلے میں ایک اختلافی مسئلہ یہ رہا ہے کہ وہ دنیا سے آسمان پر اٹھا لئے گئے اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے اوران کو آسمان سے اتارا جائے گا، یہود تو صاف کہتے ہیں کہ ہم نے ان کو پھانسی دیدی تھی، اس لئے نہ وہ زندہ ہیں، نہ ان کو آسمان پر اٹھایا گیا اور نہ وہ دنیا میں اتارے جائیں گے، بدقسمتی سے نصاریٰ بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کے دشمنوں نے سولی دیدی تھی، جب وہ رفع عیسیٰ کے قائل نہیں ہیں تو نزول عیسیٰ کے قائل کیسے ہوں گے، جب کہ دوسری طرف اسلام کا نظریہ وعقیدہ یہ ہے کہ یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پھانسی دینے یا قتل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے اگر چہ انھوں نے کوشش ضرور کی تھی، اللہ نے ان کو آسمان پر اٹھالیا تھا، قیامت کے قریب ان کو دنیا میں اتارا جائے گا اس سلسلے کی کچھ تفصیلات جو قرآن وحدیث سے ثابت ہیں پیش ہیں۔

قرآن کریم میں نزول عیسیٰ کا ذکر:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا مسئلہ قرآن کریم سے بھی ثابت ہے اور احادیث سے بھی، سب سے پہلے ہم قرآن کریم سے استفادہ کرتے ہیں، سورۂ آل عمران اور سورۂ النساء میں تفصیل کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قصہ بیان کیا گیا ہے اور اس میں یہ بھی بیان کردیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہودیوں کے شر سے محفوظ رکھا نہ ان کو قتل کیا جاسکا اور نہ سولی پر چڑھایا جاسکا، بل کہ ان کو زندہ آسمان پر اٹھالیا گیا یہ بات سورۂ النساء کی ان دو آیتوں میں واضح طور پر بیان کی گئی ہے فرمایا: وَمَاقَتَلُوْهُ وَمَاصَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ(۱)۔ ''اورانہوں نے نہ ان کو قتل کیا اور نہ ان کو سولی پر چڑھایا لیکن ان کو اشتباہ ہوگیا'' اس آیت کی بعد والی آیت میں فرمایا گیا: بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ(۲) ''بلکہ ان کو اللہ نے اپنی طرف اٹھالیا'' یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ قرآن کریم میں رفع الی السماء کا تو ذکر ہے لیکن نزول الی الارض کا ذکر نہیں ہے، اس سے ایسا لگتا ہے کہ یہ من گھڑت

(۱) النساء:۱۵۷۔ (۲) النساء:۱۵۸۔

واقعہ ہے اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ قرآن کریم کا ایک مخصوص انداز بیان ہے، اس میں بہت سی باتیں نہایت اختصار کے ساتھ مجملاً بیان کی گئی ہیں، بلکہ کہیں کہیں تو محض اشارے کیے گئے ہیں، جن کی تفصیل وتشریح سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اقوال مبارکہ سے کی ہے، اگر قرآن کریم میں اس کا ذکر نہیں ہے تو کوئی حرج نہیں، حدیث کی کتابوں میں اس کا ذکر ہے، اور یہ حدیثیں ایک دو نہیں دس بیس نہیں بلکہ سو سے بھی زیادہ ہیں جن میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دنیا میں دوبارہ تشریف آوری کی خبر دی ہے، اور واقعۂ نزول اور بعد کے حالات نہایت تفصیل سے بیان فرمائے ہیں، لیکن اگر کسی کو یہ اصرار ہی ہے کہ وہ نزول کی پیشین گوئی قرآن کریم میں دیکھنا چاہتا ہے تو اسے یہ آیت دیکھنی چاہئے فرمایا: وَاِنَّ مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتَابِ اِلَّا لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يَكُوۡنُ عَلَيۡهِمۡ شَهِيۡدًا.(۱) ''اور اہل کتاب میں سے کوئی شخص حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی وفات سے پہلے ان پر ایمان لائے بغیر باقی نہیں رہے گا اور قیامت کے روز حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان اہل کتاب پر گواہ ہوں گے''۔

ایک آیت کریمہ کی تفسیر:

صحابۂ کرامؓ، تابعین عظام اور حضرات مفسرین نے اس آیت کی یہ تفسیر کی ہے کہ اس میں موتہ کی ضمیر عیسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ یہ اہل کتاب یہود ونصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اب ایمان نہیں لا رہے ہیں، مگر ایک دن انہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان ضرور لانا پڑے گا اور وہ دن اس وقت آئے گا جب قیامت کے قریب حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ زمین پر تشریف لائیں گے، امام قرطبی نے یہ تفسیر صحابی رسول حضرت ابوہریرہؓ سے ان الفاظ میں نقل کی ہے: قال ابوهريرة قبل موت عيسى يعيدها ثلاث مرات.(۲) ''حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات سے پہلے (اہل کتاب ایمان ضرور لائیں گے) یہ بات حضرت ابوہریرہ نے تین مرتبہ دہرائی'' اگرچہ بعض کتب تفسیر میں دوسرے احتمالات

(۱) النساء: ۱۵۹. (۲) تفسیر قرطبی: ۶/۱۳۔

بھی نقل کئے گئے ہیں، مگر اس آیت کریمہ کے سیاق وسباق سے ان احتمالات کی تائید نہیں ہوتی اور نہ احادیث سے ان کی توثیق ہوتی ہے کلام کے سیاق وسباق سے اور بے شمار احادیث اور اقوال صحابہ سے جو بات نکھر کر سامنے آتی ہے وہ یہی ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام آسمان سے زمین پر زندہ سلامت تشریف لائیں گے، یہ معجزہ دیکھ کر اہل کتاب بہ طور خاص نصاریٰ ان پر ایمان لائیں گے، پھر ان کی وفات ہوگی، مشہور مفسر حافظ ابن کثیر نے امام التفسیر حافظ ابن جریر کے حوالے سے یہی تفسیر نقل کی ہے، اور خود بھی اسی کی تائید فرمائی ہے، فرماتے ہیں: ''صحیح ترین قول یہی ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام کے نزول کے بعد اہل کتاب میں سے کوئی شخص ایسا باقی نہیں بچے گا جو ان پر ایمان نہ لایا ہو، یہی قول درست اور حق ہے، انشاء اللہ ہم قطعی دلائل کے ذریعے اس کی حقانیت ثابت کریں گے، ان آیات کے سیاق سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ یہود کا یہ دعوی غلط ہے کہ انہوں نے حضرت عیسی علیہ السلام کو سولی پر چڑھایا تھا، بعض نادان نصاریٰ نے بھی یہودیوں کا یہ دعوی تسلیم کرلیا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید فرمائی کہ معاملہ ایسا نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ ان پر معاملہ مشتبہ کردیا گیا تھا، انہوں نے حضرت عیسی علیہ السلام سے مشابہ ایک شخص کو مار ڈالا اور وہ یہ سمجھتے رہے کہ انہوں نے حضرت عیسی علیہ السلام کو قتل کردیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے انہیں اپنی طرف اٹھالیا تھا، وہ باقی ہیں اور زندہ ہیں، اور قیامت سے پہلے دنیا میں نازل ہوں گے جیسا کہ متواتر روایات سے پتہ چلتا ہے''۔(۱)

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ یہ رائے صرف ابن جریر ہی کی نہیں ہے بلکہ اکثر اہل علم کی رائے یہی ہے۔(۲) حضرت الامام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے بھی اسی رائے کو ترجیح دی ہے اپنے ترجمۂ کلام پاک میں فرماتے ہیں: ''نباشد ہیچ کس از اہل کتاب اِلا البتہ ایمان آرد بہ عیسی پیش از مردن عیسی وروز قیامت باشد عیسی گواہ برایشاں''۔ ''مترجم گوید یعنی یہودی کہ حاضر شوند نزول عیسی راالبتہ ایمان آرند'' (ترجمہ فتح الرحمٰن) ''اہل کتاب میں سے کوئی شخص ایسا نہیں ہوگا جو حضرت عیسی علیہ السلام کے

(۱) تفسیر ابن کثیر: ۱/۶۲۷۔ (۲) فتح الباری: ۶/۴۹۲، کتاب احادیث الانبیاء۔

مرنے سے پہلے ان پر ایمان نہیں لائے گا اور قیامت کے دن حضرت عیسیٰ ان پر گواہ ہوں گے''، آیت کا یہ ترجمہ کرنے کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے تفسیری فوائد میں لکھا ہے کہ ''جو یہودی نزول عیسیٰ کے وقت حاضر ہوں گے وہ ضرور ایمان لائیں گے'' اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے زمین پر دوبارہ ضرور تشریف لائیں گے۔

اسی سلسلے کی دوسری آیت یہ ہے فرمایا: وَإِنَّهُ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا (۱) ''اور بلاشبہ وہ یعنی عیسیٰ علیہ السلام قیامت کی علامت ہیں، چنانچہ تم اس بارے میں تردد نہ کرو''۔ اکثر مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں یہی لکھا ہے کہ انہ میں ضمیر کا مرجع حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، اور معنی یہ ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کی ایک علامت ہیں یعنی وہ قیامت کے قریب نازل ہوں گے، اسی لیے ان کی تشریف آوری قیامت کی علامات میں سے ایک علامت قرار دی گئی ہے، حافظ ابن کثیرؒ نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے متواتر احادیث منقول ہیں جن میں یہ خبر دی گئی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت سے پہلے ایک امام عادل کی حیثیت سے تشریف لائیں گے، یہ قول حضرات صحابہؓ میں حضرت ابو ہریرہؓ، اور حضرت ابن عباسؓ اور تابعین میں حضرت مجاہد، ابو العالیہ ابو مالک، عکرمہ، حسن بصری، قتادہ، ضحاک اور دوسرے حضرات سے منقول ہے۔(۲) امام فخر الدین رازی نے لکھا ہے کہ ''وَاِنَّهٗ اَیْ عِیْسٰی (لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ) شرط من اشراطها(۳). حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے علم کا ذریعہ یعنی اس کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہیں'' قاضی بیضاوی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے :وإنه وإن عیسى لعلم الساعة لأن حدوثه أو نزوله من اشراط الساعة یعلم به دُنوها.(۴) ''حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کی علامت ہیں یعنی ان کی آمد اور ان کا نزول قیامت کی نشانیوں میں سے ہے، اس سے پتہ چلے گا کہ قیامت قریب آچکی ہے'' اس آیت کی ایک قرأت ع اور ل کے فتحے کے ساتھ لَعَلَمٌ بھی منقول ہے، اس سے معنی اور بھی زیادہ واضح ہو جاتے ہیں۔

(۱) الزخرف:۶۱۔ (۲) تفسیر ابن کثیر:۴/۱۶۷۔ (۳) تفسیر الکبیر:۲۷/۲۲۲۔ (۴) تفسیر البیضاوی:۴/۴۸۴۔

ایک اور آیت سے استدلال:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول پر مندرجہ ذیل آیت کریمہ سے بھی استدلال کیا جاسکتا ہے، اگر چہ یہ اس مفہوم میں پوری طرح واضح نہیں ہے تاہم اس آیت کے ایک لفظ کے لغوی مفہوم کو ذہن میں رکھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کا وہ وقفہ مراد ہے جب انسان اس مرحلے تک پہنچ جاتا ہے جس کا آیت میں ذکر ہے، فرمایا: وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا(۱) ''اور آپ (عیسیٰ علیہ السلام) لوگوں سے بات کریں گے گہوارے میں اور بڑی عمر میں بھی'' یہاں لفظ کہل استعمال کیا گیا ہے، یہ آدمی کی عمر کا وہ زمانہ ہے جب جوانی رخصت ہوجاتی ہے اور بڑھاپے کے آثار شروع ہوجاتے ہیں، اُردو میں اس کے لیے ادھیڑ عمر کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، امام راغب اصفہانیؒ نے لکھا ہے کہ کہولت اس وقت شروع ہوتی ہے جب بالوں میں سفیدی جھلکنے لگتی ہے۔(۲) حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھایا گیا اس وقت اُن کی عمر تیس سال تھی۔ (۳) گویا کہولت اور ادھیڑ عمری کے آثار شروع نہیں ہوئے تھے، آج بھی تیس سال کی عمر کے لوگوں کے بال بالعموم سیاہ ہوتے ہیں اور کوئی بھی انہیں ادھیڑ عمر کا نہیں کہتا بلکہ تیس پینتیس سال کی عمر کے لوگوں کو جوان کہا جاتا ہے، گویا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس وقت جوان تھے جب انہیں آسمان پر اٹھایا گیا، پھر مہد کے ساتھ کہولت کی عمر کا ذکر کیوں کیا گیا اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ کہولت کا زمانہ ان پر آیا ہی نہیں تھا، یقینی طور پر یہ زمانہ بعد میں آئے گا، اور اس وقت آئے گا جب وہ دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے اور زمانۂ دراز تک زندہ رہ کر طبعی طور پر وفات پائیں گے۔

نزول عیسیٰ علیہ السلام کی حکمت و مصلحت:

مفسر قرآن حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے نزول عیسیٰ کی حکمت و مصلحت پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے، نیز سورۂ آل عمران اور دوسری سورتوں

(۱) آل عمران:۴۶۔ (۲) مفردات القرآن:۱/۴۴۲۔ (۳) تفسیر معالم التنزیل للبغوی:۲/۷۷۔

میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مفصل تذکرے سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اگر اس پر عقل و انصاف کے ساتھ غور کیا جائے تو نزول عیسیٰ کے مسئلے میں ادنیٰ درجے کے شک وشبہے کی بھی گنجائش باقی نہیں رہتی، حضرت مفتی صاحبؒ نے اس سلسلے میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سورۂ آلِ عمران کے گیارہویں رکوع میں اللہ تعالیٰ نے کئی انبیائے کرام علیہم السلام کا ذکر فرمایا ہے لیکن ان سب کا ذکر ایک ہی آیت میں اجمال کے ساتھ ہے اس کے بعد تین رکوع کی بائیس آیتوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مفصل ذکر ہے، یہاں تک کہ آپ کے خاندان کا بھی تذکرہ ہے، اور اس شرح وبسط کے ساتھ ہے کہ خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی جو خاتم الانبیاء ہیں اور جن پر یہ کتاب نازل ہوئی ہے اتنے بسط وتفصیل کے ساتھ ذکر نہیں کیا گیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نانی کا ذکر، ان کی نذر کا بیان، والدہ کی پیدائش، ان کا نام، ان کی تربیت کے واقعات، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رحم مادر میں آنا، پھر ولادت کا حال، ولادت کے بعد ماں کی غذا کا ذکر، اپنے خاندان میں بچے کو ساتھ لے کر آنا، اہل خاندان کے طعن وتشنیع، ولادت کے فوراً بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قوت گویائی عطا کرنے کا واقعہ، جوانی کے ایام، دعوت اِلی اللہ، ان کی مخالفت، حواریین کی مدد ونصرت، یہودیوں کی دشمنی اور ان کو آسمان پر زندہ اٹھانا، یہ سب باتیں قرآن کریم میں بالتفصیل مذکور ہیں پھر احادیث متواترہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مزید اوصاف شکل وصورت، لباس اور حلیہ وغیرہ کی تفصیلات ذکر کی گئی ہیں، یہ ایسے حالات ہیں کہ قرآن وحدیث میں کسی نبی ورسول کے حالات اس تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کئے گئے، یہ بات ہر انسان کو دعوتِ فکر دیتی ہے کہ ایسا کیوں اور کس حکمت سے ہوا۔

ذرا بھی غور کیا جائے تو یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ خاتم الانبیاء سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کیوں کہ اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں اور اب قیامت تک آپ کے بعد کوئی دوسرا نبی یا رسول آنے والا نہیں ہے، اس لیے آپ نے اپنی تعلیمات میں اس کا بڑا اہتمام فرمایا ہے کہ قیامت تک امت کو جو مراحل پیش آنے والے ہیں ان کے متعلق ضروری باتیں ارشاد فرمادیں، ایک طرف تو آپ نے اس کا اہتمام فرمایا ہے کہ ان لوگوں

کے بارے میں امت کو بتلا دیا جائے جو آپ کے بعد قابل اتباع ہیں ان میں سے بعض کا ذکر محض اوصاف کے ساتھ ہے اور بعض حضرات کا تذکرہ نام کی تعیین کے ساتھ بھی فرمایا گیا ہے، دوسری طرف ان گمراہ لوگوں سے بھی باخبر کر دیا گیا جن سے امت کو خطرہ لاحق ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جو فتنے رونما ہوں گے اور جن سے امت کے دین و ایمان کو خطرہ لاحق ہوگا ان میں سب سے بڑا خطرہ دجال سے ہوگا، احادیث میں فتنۂ دجال کے اتنے حالات اور اوصاف بیان فرما دئے گئے ہیں کہ جب یہ فتنہ رونما ہوگا تو امت کسی شک میں مبتلا نہیں ہوگی اور اسے صاف پہچان لے گی، اسی طرح بعد میں جو مصلحین پیدا ہوں گے یا تشریف لائیں گے ان میں سب سے اہم شخصیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہوگی جن کو اللہ تعالیٰ نے نبوت و رسالت سے سرفراز فرمایا، اور فتنۂ دجال کی سرکوبی کے لیے اور امت کی اعانت کے لیے ان کو آسمان میں زندہ رکھا، جب قیامت کے قریب دجال ظاہر ہوگا تب آپ کو بھی آسمان سے زمین پر اتارا جائے گا اور آپ کے ذریعے دجال کو موت کے گھاٹ اتارا جائے گا، اس لیے ضرورت تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات وصفات بھی کھلے طور پر بیان کئے جائیں تاکہ جب وہ نازل ہوں تو کسی انسان کو ان کے پہچاننے میں غلطی نہ ہو۔ اس لیے کہ اگر امت انہیں شناخت نہ کر سکی اور ان کے سلسلے میں تذبذب کا شکار رہی تو ان کے نزول کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا، کیوں کہ جس قوم کی نصرت اور مدد کے لیے وہ تشریف لائیں گے اگر وہی قوم ان کو پہچان نہ سکے گی تو وہ کس کی مدد کریں گے اور کس کی دست گیری فرمائیں گے، یہی وجہ ہے کہ ان کی تشریف آوری آسمان سے علی الاعلان اسلامی حکومت کے دارالخلافہ میں ایسے مقام پر ایسے وقت ہوگی جب سب لوگ کھلی آنکھوں اُن کے نزول کا مشاہدہ کر سکیں گے۔

قرآن کریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تفصیلی ذکر کیوں ہے؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات کا تفصیلی ذکر اس لیے بھی ضروری تھا کہ اگر ان کے حالات مجمل طور پر بیان کئے جاتے اور علامات مبہم ہوتیں تو بہت سے لوگ اپنے بارے میں مسیح موعود ہونے کا دعوی کر بیٹھتے جیسا کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے یہ دعوی کیا

ہے، اگر حدیث کی کتابوں میں نہایت شرح وبسط کے ساتھ حضرت عیسی علیہ السلام کا ذکر نہ ہوتا تو غلام احمد قادیانی کے دعوے کی تردید وتکذیب مشکل ہو جاتی، علماء امت نے ان ہی علامات کی بنیاد پر اس کے دعوی کی تردید کی ہے، حضرت عیسی علیہ السلام اللہ کے نبی اور اس کے رسول ہیں، مگر وہ جس وقت دنیا میں تشریف لائیں گے فرائض نبوت ورسالت پر مامور ہو کر تشریف نہ لائیں گے بلکہ امت محمدیہ کی قیادت وامامت کے لیے بہ حیثیت خلیفۂ رسول تشریف لائیں گے مگر ذاتی طور پر ان کو جو منصب نبوت ورسالت حاصل ہے اس سے معزول بھی نہ ہوں گے، جس طرح ان کی نبوت سے انکار پہلے کفر تھا اس وقت بھی کفر ہوگا، امت مسلمہ جو پہلے سے ان کی نبوت پر قرآنی ارشادات کی بنا پر ایمان لائے ہوئے ہے اگر نزول کے وقت ان کو نہ پہنچانے تو انکار میں مبتلا ہو جائے گی، اس لیے ضرورت تھی کہ حضرت عیسی علیہ السلام کے حالات واوصاف کو واضح طور پر بیان کیا جائے۔(۱)

اس تفصیل کا حاصل یہ نکلا کہ حضرت عیسی علیہ السلام کے نزول کا عقیدہ نہ صرف احادیث مبارکہ سے بلکہ قرآنی آیات سے بھی ثابت ہے، اور اس سلسلے میں ایک سے زائد آیات موجود ہیں جن سے کھلے طور پر نزول عیسی کا عقیدہ ثابت ہوتا ہے، قرآن کریم میں حضرت عیسی علیہ السلام کے تفصیلی ذکر سے بھی یہی حکمت سمجھ میں آتی ہے کیوں کہ ان کو دوبارہ تشریف لانا ہے تو جس قوم میں وہ تشریف لائیں گے ان کے سامنے آنے والی شخصیت پوری طرح متعارف ہو جائے تا کہ کسی قسم کا کوئی اشتباہ باقی نہ رہے اور کوئی دوسرا شخص مسیح نہ بن بیٹھے اور اگر کوئی شخص اس قسم کا جھوٹا دعوی کرنے لگے تو جو اوصاف قرآن کریم میں مذکور ہیں وہ خود ہی اس کی تردید بن جائیں جس شخصیت کی آمد کی پیشین گوئی قرآن بھی کر رہا ہو، اور زبان رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ان کے نزول کی پیشین گوئی کی گئی ہو اس شخصیت کا انکار کرنا، یا ان کے نزول کا تمسخر اڑانا، یا اُن کے نزول کے واقعے کو حقیقت کے بجائے تمثیل پر محمول کرنا بڑی جسارت کا کام ہے اور یہ کام وہی کر سکتا ہے جسے آخرت کی جواب دہی کا خوف نہ ہو بلکہ تحقیق کے نام پر واہ واہ لوٹنے کا شوق ہو۔

(۱) ملخصا از معارف القرآن: ۲/ ۸۰، ۸۱۔

نزولِ عیسیٰ کے سلسلے میں کچھ روایات:

اب ہم کچھ روایات نقل کر کے نزولِ عیسیٰ کے موضوع کو ختم کرتے ہیں۔

(۱) ''حضرت سعید ابن المسیبؒ حضرت ابو ہریرۃؓ سے روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے: عنقریب تم میں عیسیٰ ابن مریم ایک عادل حاکم کی حیثیت سے نازل ہوں گے وہ صلیب توڑ ڈالیں گے (یعنی صلیب پرستی ختم کر دیں گے) خنزیر کو قتل کر دیں گے، جنگ کا خاتمہ کر دیں گے، (ان کے دور میں) مال و دولت کی اس قدر فراوانی ہوگی کہ کوئی اسے قبول کرنے والا نہ ہوگا(۱) (یہ روایت بیان کرنے کے بعد) حضرت ابو ہریرۃؓ فرماتے تھے کہ اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھ لو: وَإِنْ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ''۔(۲)

(۲) ''حضرت ابو ہریرۃؓ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس دن (مارے خوشی کے) تمہارا کیا حال ہوگا جب ابن مریم تمہارے درمیان نازل ہوں گے اور تمہارا امام (خود) تم میں سے ہوگا''۔(۳)

(۳) حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میری امت میں ایک جماعت قربِ قیامت تک حق کے لیے سربلندی کے ساتھ باطل سے لڑتی رہے گی یہاں تک کہ عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے تو اس جماعت کا امیر ان سے کہے گا تشریف لائیے اور ہمیں نماز پڑھائیے آپ فرمائیں گے نہیں اللہ نے اس امت کو اعزاز بخشا ہے تم (ہی) میں سے بعض بعض کے امیر ہوں گے۔(۴)

(۴) نواس ابن سمعانؓ کی روایت یاجوج ماجوج کے ضمن میں بیان کی جا چکی ہے، اس میں دجال کا ذکر بھی ہے، کہ وہ نکلے گا، ایسا ویسا ہوگا، اور ایسا ایسا کرے گا یہاں

---

(۱) بخاری، ۲/۴۷۷، رقم الحدیث: ۲۱۰۹، مسلم: ۱/۱۳۵، رقم الحدیث: ۱۵۵۔(۲) النساء: ۱۵۹۔ (۳) صحیح البخاری: ۳/۱۲۷۲، رقم الحدیث: ۳۲۶۵) یہ روایت صحیح مسلم: ۱/۱۳۵، رقم الحدیث: ۱۵۵، مسند احمد بن حنبل: ۲/۲۷۲، مسند ابی عوانہ: ۱/۱۰۶، صحیح ابن حبان: ۱۵/۲۱۳، رقم الحدیث: ۶۸۰۲، وغیرہ کتابوں میں بھی منقول ہے۔(۴) صحیح مسلم: ۱/۱۳۷، رقم: ۱۵۶، مسند احمد: ۳/۳۴۵، رقم: ۱۴۷۶۲۔

تک کہ وہ اسی حال میں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ مسیح ابن مریم کو بھیجے گا اور وہ دمشق کے مشرقی کنارے پر واقع سفید مینارے پر ہلکے زرد رنگ کے دو کپڑوں میں ملبوس دو فرشتوں کے کاندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھے ہوئے نازل ہوں گے، جب وہ سر جھکائیں گے تو اس سے پانی کے قطرات ٹپکیں گے اور جب سر اٹھائیں گے تو اس سے ایسے قطرے گریں گے جو چاندی کے دانوں کی طرح (چمک دار) اور موتیوں کی طرح (سفید) ہوں گے، جو کافر بھی ان کے سانس سے گرمی پائے گا اسی وقت مرجائے گا اور ان کی سانس کی حرارت وہاں تک پہنچے گی جہاں تک ان کی نظر جائے گی، وہ دجال کو تلاش کریں گے اور اسے لُد کے دروازے پر پالیں گے اور قتل کرڈالیں گے"۔ یہ حدیث بڑی تفصیلی ہے، اس میں یاجوج ماجوج کا بھی ذکر ہے، ایک وقت وہ بھی آئے گا کہ امت قحط سالی میں مبتلا ہوجائے گی، اور اللہ کے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی کوہ طور میں محصور ہوکر رہ جائیں گے، اسی دوران یاجوج ماجوج کسی وبائی بیماری سے مرجائیں گے، ان کی لاشوں کے تعفن سے سانس لینا دشوار ہوجائے گا، اللہ تعالیٰ کسی خاص جانور کو بھیج کر اس گندگی سے نجات دے گا، ایک وقت وہ آئے گا کہ خوب بارشیں ہوں گی، زمین کی پیداوار بڑھ جائے گی، بڑے بڑے پھل نکلیں گے جانوروں کے دودھ میں اضافہ ہوجائے گا، یہ سب واقعات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں رونما ہوں گے۔(۱)

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جس وقت سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم دمشق کے مشرق میں واقع سفید مینار پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا ذکر فرمارہے ہیں اس وقت وہاں کوئی مینار نہیں تھا، یہاں تک کہ آٹھویں صدی ہجری تک بھی وہاں کوئی مینار وجود میں نہیں آیا تھا، حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی کتاب "البدایہ والنہایہ" میں انکشاف کیا ہے کہ ہمارے زمانے میں (وفات ۷۷۴ھ) میں عیسائیوں نے سفید پتھر سے ایک مینار تعمیر کیا ہے، ممکن ہے اسی پر نزول فرمائیں، بعض لوگوں نے الجامع الاموی دمشق کے مشرقی مینار کو بھی اس کا مصداق قرار دیا ہے، اور یہی زیادہ قرین قیاس بھی معلوم ہوتا ہے کیوں کہ جس

(۱) تفصیل کے لیے دیکھئے نواس ابن سمعان کی روایت مسلم: ۲/۵۲۰، رقم الحدیث: ۴۳۲۱، ابن ماجہ: ۲/۱۳۵۶، رقم الحدیث: ۴۰۷۵، وغیرہ۔

وقت حضرت عیسی علیہ السلام نازل ہوں گے فجر کی اقامت کہی جا چکی ہوگی اور امام مصلے پر پہنچ چکا ہوگا، اگر مینار سے مراد جامع اموی کا مینار ہو تو بھی یہ کیا کچھ کم حیرت انگیز بات نہیں ہے کہ ایک ایسے مینار کی صراحت کی جارہی ہے جس کا اس وقت تک کوئی وجود نہیں تھا، بعد میں اللہ تعالیٰ نے مینار وجود میں لاکر اس پیشین گوئی کے اس حصے کی تکمیل فرمادی، اب نزول کا مرحلہ باقی ہے اللہ کی ذات سے امید ہی نہیں یقین کامل ہے اور ایک مؤمن کا یہی پختہ عقیدہ ہونا چاہئے کہ جو کچھ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا بالکل اسی طرح حضرت عیسی علیہ السلام نازل ہوں گے۔

(۵) ''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرے اور ان کے یعنی حضرت عیسی علیہ السلام کے درمیان کوئی نبی نہیں اور وہ نازل ہونے والے ہیں، جب تم ان کو دیکھو تو ان کو پہچان لینا، ان کا قد درمیانی اور معتدل ہوگا رنگ سرخ وسفید ہوگا، ہلکے زرد رنگ کے دو کپڑوں میں ہوں گے، سر کے بال ایسے (چمک دار) ہوں گے گویا ان سے پانی ٹپک رہا ہے، اگرچہ گیلے نہیں ہوں گے، اسلام کے لیے لوگوں سے جنگ کریں گے، صلیب توڑ دیں گے، خنزیر کو قتل کر دیں گے، جزیہ لینا بند کر دیں گے، اللہ تعالیٰ ان کے دور میں اسلام کے علاوہ تمام مذاہب کو ختم کر دے گا، وہ مسیح دجال کو ہلاک کریں گے، دنیا میں ان کا قیام چالیس سال تک رہے گا، پھر ان کی وفات ہوجائے گی اور مسلمان ان کے جنازے کی نماز پڑھیں گے''۔(۱)

اور اب آخری حدیث پیش کر کے اس موضوع کو ختم کیا جاتا ہے حضرت عبداللہ بن عمر روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''عیسیٰ بن مریم زمین پر تشریف لائیں گے، ان کی شادی ہوگی، ان کی اولاد بھی ہوگی، وہ زمین پر پینتالیس سال قیام کریں گے، پھر انتقال کر جائیں گے، ان کی تدفین میرے ساتھ میری قبر میں ہوگی چنانچہ (بہ روز قیامت) میں اور عیسی بن مریم، ابوبکر وعمر کے درمیان ایک قبر سے اٹھیں گے''۔(۲)

(۱) ابوداؤد: ۲/۵۲۰، رقم الحدیث: ۴۳۲۴، مصنف ابن ابی شیبہ: ۷/۴۹۹، رقم الحدیث: ۳۷۵۲۶، مسند احمد بن حنبل: ۲/۴۳۷، رقم الحدیث: ۹۶۳۰، صحیح ابن حبان: ۱۵/۲۳۳، رقم الحدیث: ۶۸۲۱۔ (۲) کتاب الوفاء ابن الجوزی: ص ۸۱۴۔

بعثت انبیاء کا مقصد:

تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کا مقصد لوگوں کی اصلاح ہے اور ان کی دعوت کا خلاصہ توحید ہے، قرآن کریم میں صاف اعلان ہے: شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا۔(۱) ''اللہ نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا جس کی وصیت نوح کو کی تھی اور جس کو ہم نے آپ پر وحی کیا اور جس کی ہم نے ابراہیم اور موسیٰ عیسیٰ علیہما السلام کو وصیت کی تھی کہ دین کو قائم رکھنا اور اس میں جھگڑا مت کرنا''۔ ایک اور آیت میں اس کی وضاحت کر دی گئی کہ وہ دین جس کو قائم رکھنے کے لئے کہا جا رہا ہے وہ کیا ہے ''آپ سے پہلے جب بھی ہم نے کسی رسول کو بھیجا تو اس کو یہی تعلیم دی کہ میرے (اللہ کے) سوا کوئی معبود نہیں، اس لئے تم سب میری ہی عبادت کرو''۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی انبیاء کے اسی سلسلے کی کڑی ہیں، ان کی دعوت کا محور بھی توحید ہی تھا اور وہ اسی کا پیغام لے کر بنی اسرائیل میں پہنچے، قرآن کریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کی نبوت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا تتمہ اور تکملہ تھی اسی لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تورات کے احکام پر خود بھی عمل کرتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کے احکام پر چلنے کی تلقین فرماتے تھے، گویا وہ دین موسوی کی تجدید کے لئے تشریف لائے تھے، البتہ ان کو بھی ایک کتاب انجیل عطا کی گئی، اس میں بھی احکام تورات کی تصدیق وتائید ملتی ہے، تاہم انھوں نے اپنے اختیارات خصوصی سے کام لیتے ہوئے بہ حکم خدا تورات کے بعض احکام کو منسوخ کر دیا، کچھ چیزیں جو شریعت موسوی میں حرام تھیں ان کو حلال کر دیا اور جو حرام تھیں ان کو حلال کر دیا۔

یہودیوں کی سرشت میں بغاوت:

یہودیوں کی سرشت میں احکام الٰہی سے بغاوت اور آسمانی شریعت سے روگردانی وسرکشی ہمیشہ سے رہی ہے، انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتنی کچھ تکلیفیں پہنچائی ہیں اور اپنی ضد وہٹ دھرمی سے ان کا کتنا دل دکھایا ہے اس کی تفصیلات آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام

(۱) الشوریٰ: ۱۳۔

کے واقعات میں پڑھ چکے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا زمانہ جس قدر دور ہوتا گیا ان کی گمراہیوں کا سلسلہ اسی قدر دراز ہوتا چلا گیا، ایک وقت وہ آیا کہ جو دین شریعت موسوی کی شکل میں ان کو دیا گیا تھا اس کا نام ہی نام باقی رہ گیا، اس کی روح اور حقیقت سے وہ اپنی بداعمالیوں کے سبب محروم ہو گئے، اس عرصے میں بنی اسرائیل کے مختلف علاقوں اور قبیلوں میں پیغمبروں کی آمد کا سلسلہ بھی جاری رہا مگر ان کی اصلاح نہ ہو سکی، ان کے حالات اس قدر خراب ہو چکے تھے کہ وہ اپنے پیغمبروں تک کو قتل کر ڈالتے تھے جیسا کہ انھوں نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا، ضرورت تھی کہ ایک اور پیغمبر مبعوث کئے جاتے جن کا دائرۂ کار نسبتاً وسیع ہوتا، اگرچہ وہ تورات کے مصدق اور مؤید بن کر تشریف لاتے مگر ان کو بھی آسمانی کتاب عطا کی جاتی اور ساتھ ہی انہیں دین موسوی کے بعض احکام کو منسوخ کرنے اور اس میں کچھ احکام کا اضافہ کرنے کا اختیار بھی ہوتا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایسی ہی ایک کتاب انجیل کے ساتھ تشریف لائے اور زمانے کی ضرورت کے مطابق انھوں نے اپنے پیش رو پیغمبر کی لائی ہوئی شریعت میں حک واضافہ بھی کیا۔

بنی اسرائیل کے مختلف گمراہ طبقات:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے وقت بنی اسرائیل مختلف قسم کی گمراہیوں میں مبتلا تھے جو کچھ اس طرح کی تھیں:

(۱) انسان کے اچھے برے اعمال کی سزا اسے دنیا میں مل جاتی ہے، قیامت، آخرت، جزا و سزا اور حشر و نشر کی جو باتیں انبیاء کرتے ہیں وہ سب مفروضات ہیں، ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے، کوئی قیامت آنے والی نہیں ہے اور نہ کوئی سزا جزا ملنے والی ہے، اس طرح کے نظریات کے حاملین بڑی تعداد میں تھے اور صدوقی کہلاتے تھے۔

(۲) ایک فرقہ اگرچہ آخرت پر یقین رکھتا تھا، مگر وہ کہتا تھا کہ اللہ تک پہنچنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے ترک دنیا، وہی شخص آخرت کی زندگی میں کامیابی سے ہم کنار ہوگا جو دنیا کی لذات اور اہل دنیا سے کنارہ کش ہو کر صرف اللہ کی عبادت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دے گا، چناں چہ اس فرقے کے لوگ بستیوں کو چھوڑ کر جنگلوں میں چلے جاتے اور وہاں خانقاہیں بنا کر رہتے، انہیں دنیا اور اہل دنیا سے کوئی سروکار نہ ہوتا، شروع

شروع میں تو اس راہبانہ زندگی کے حقیقی جلوے نظر آئے، مگر بعد میں یہ خانقاہیں اور عبادت خانے جو تنہائی میں رہ کر عبادت وریاضت کے لئے تعمیر کیئے گئے تھے عیاشی کے اڈے بن گئے اور جو کام بستیوں میں مشکل تھا وہ یہاں آسانی سے ہونے لگا، یہ فرقہ فریسی کہلاتا تھا۔

(۳) بنی اسرائیل میں ایک مستقل جماعت مذہبی رسوم انجام دلانے پر مامور رہتی تھی، اس جماعت کے لوگ دن رات ہیکل کی خدمت میں لگے رہتے اور جو لوگ اس کی زیارت وعبادت کے لئے آتے ان کی رہبری کرتے، ابتداء میں یہ کام اخلاص کے ساتھ ہوتا تھا اور اس سے اللہ کی رضا مقصود ہوتی تھی، آہستہ آہستہ ہیکل کی خدمت پیشہ بن گئی اور اسے دولت کمانے کا ذریعہ سمجھ لیا گیا، صورت حال بدلی تو مطمح نظر بھی بدل گیا، اخلاص کی جگہ ریا کاری آگئی، رضاء الٰہی کی جگہ مال ودولت کی ہوس نے لے لی، نوبت یہاں تک پہنچی کہ دنیوی مقاصد کی تکمیل کے لئے وہ لوگ تورات کے احکام بدلنے لگے، ہر ضرورت مند کو اس کے مطلب کی بات بتلاتے اور اس سے نذرانے وصول کر لیتے، یہ لوگ کاہن تھے۔

(۴) چوتھی جماعت ان سب پر حاوی تھی، یہ احبار ورہبان یعنی علماء یہود تھے، ان کے پاس آسمانی کتابوں کا علم تھا اس لئے وہ خود کو انتہائی مقدس اور انتہائی معتبر سمجھتے تھے، پورا دین انھوں نے اپنی مٹھی میں کر لیا تھا، ان کا کہنا یہ تھا کہ شریعت وہ ہے جو ہم بتلائیں، حکم الٰہی وہ ہے جو ہماری زبان سے نکلے، آخرت کی جزا اور سزا ہمارے اختیار میں ہے، ہم جسے پروانۂ نجات عطا کریں وہ ناجی ہے اور جس سے ناراض ہوں وہ جہنمی ہے، اپنے حقیر مادّی مقاصد کے لئے انھوں نے تورات کی آیتوں میں تحریف تک کر ڈالی تھی، قرآنی الفاظ میں وہ ارباباً من دون اللہ بنے ہوئے تھے، یہ فرقہ احبار کہلاتا تھا۔

بنی اسرائیل اگرچہ جزیرۃ العرب کے ایک وسیع رقبے پر پھیلے ہوئے تھے مگر جہاں بھی تھے وہ انہی چار فرقوں کی گرفت میں تھے، ان حالات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی، ان کو بغیر باپ کے صرف ماں کے پیٹ سے پیدا کر کے بنی اسرائیل تک یہ پیغام پہنچا دیا گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اب ایک اور پیغمبر تشریف لائے ہیں، اس کا اعلان حضرت عیسیٰ نے پیدا ہوتے ہی کر بھی دیا کہ میں اللہ کا رسول ہوں، قرآن کریم نے یہ بیان نہیں کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دعوت واصلاح کا آغاز کتنی عمر سے کیا،

اور نہ یہ بتلایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا زمانہ کتنا ہے، البتہ انجیل لوقا سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کار نبوت شروع کیا اس وقت ان کی عمر تیس سال تھی مگر یہ سلسلہ دعوت کب تک چلتا رہا اس میں اختلاف ہے، انجیل لوقا میں یہ مدت ڈیڑھ پونے دو ماہ سے زیادہ نہیں ہے، البتہ انجیل یوحنا میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کا دورانیہ سوا تین سال بیان کیا گیا ہے، اس عرصے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے والے کی تعداد انتہائی کم رہی، اور اس میں بھی بیشتر وہ لوگ تھے جو معاشرے میں کسی خاص پوزیشن کے حامل نہیں تھی، اکثریت نہ ماننے والوں کی تھی اور ان میں بھی زیادہ تر وہ لوگ تھے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنے مقاصد کی راہ میں مشکلات پیدا کرنے والے سمجھتے تھے، جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور جنھوں نے آپ کے مقاصد نبوت کی تکمیل میں آپ کا ساتھ دیا ان کو قرآن کریم میں حواری کا لقب دیا گیا ہے، انجیل متی میں بارہ حواریوں کے نام دئے گئے ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تبلیغ کی ضرورت کے لئے ابتدا میں ستر افراد کا انتخاب کیا اور ان کو تبلیغ و دعوت کے لئے روانہ کیا، جنھوں نے اپنا کام خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا اور واپس آ کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں اپنی رپورٹ پیش کی، اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام بہت خوش ہوئے۔

حواریین کی جماعت:

حواریین کی یہ جماعت اگرچہ مخلص، وفادار اور فدا کار تھی، مگر سادہ لوح بھی تھی، کسی کے دل میں کبھی کوئی بات آتی وہ بلا تکلف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں عرض کر دیتا، ایک مرتبہ کچھ حواریین نے عرض کیا کہ اے پیغمبر! خدا تعالیٰ نے آپ کو بے باپ کا پیدا کیا، ماں کی گود میں بولنے کی قدرت بخشی، آپ کو اپنا رسول بنایا، آپ کو ایسے معجزات عطا کئے جو نہایت تعجب خیز ہیں، ایک خلق خدا آپ کے ان معجزات سے فیض اٹھا رہی ہے، آپ تن مردہ میں جان ڈال دیتے ہیں، مایوس اور لا علاج مریضوں کو اچھا کر دیتے ہیں، بلاشبہ یہ سب آیات نبوت ہیں اور آپ کی رسالت کی تصدیق کے لئے کافی ہیں، جس خدا نے آپ کو یہ طاقت اور قوت عطا کی ہے کیا وہ ایسا نہیں کر سکتا کہ ہمارے لئے آسمان سے ایک دستر خوان نازل فرما دے جس میں کھانے پینے کی مختلف النوع چیزیں ہوں، ہماری یہ

خواہش بھی ہے اور آپ سے یہ درخواست بھی کہ آپ اس دسترخوان کے نزول کی دُعا فرمائیں، اللہ نے اگر آپ کی یہ دُعا سن لی اور خوانِ نعمت نازل فرما دیا تو ہم روزی روٹی کمانے سے بے نیاز ہو جائیں گے اور دل لگا کر اللہ کی عبادت کریں گے، بل کہ اپنا تمام وقت عبادت الٰہی میں صرف کر دیں گے، قرآن کریم نے حواریین کی اس کے درخواست کا تذکرہ اس پیرائے میں فرمایا ہے:

إِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ أَنْ يُنَزِّلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ قَالَ اتَّقُوا اللَّهَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ قَالُوا نُرِيدُ أَنْ نَأْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوبُنَا وَنَعْلَمَ أَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُونَ عَلَيْهَا مِنَ الشَّاهِدِينَ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ تَكُونُ لَنَا عِيدًا لِأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا وَآيَةً مِنْكَ وَارْزُقْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ قَالَ اللَّهُ إِنِّي مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ فَمَنْ يَكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَإِنِّي أُعَذِّبُهُ عَذَابًا لَا أُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِنَ الْعَالَمِينَ. (۱)

"اور اے عیسیٰ! یاد کرو جب حواریوں نے کہا تھا کہ اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تمہارا رب ایسا کرسکتا ہے کہ ہمارے اوپر آسمان سے ایک دسترخوان نازل کرے، عیسیٰ نے کہا کہ (لوگو) اللہ سے ڈرو، اگر تم ایمان والے ہو، کہنے لگے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس دسترخوان میں (جو غذائیں نازل ہوں ان میں) سے کھائیں، اور ہمارے دل مطمئن ہو جائیں، (اس کے ساتھ ہی) ہم یہ بھی جان لیں کہ آپ نے ہم سے سچ بتلایا تھا اور ہم اس پر (آپ کے حق میں) گواہ بھی بن جائیں، عیسیٰ ابن مریم نے دعا کی کہ اے ہمارے رب ہم پر آسمان سے دسترخوان نازل فرمادے تا کہ وہ ہمارے لئے اور ہمارے اگلوں پچھلوں کے لئے عید (خوشی کا سبب) قرار پائے اور آپ کی طرف سے (فضل وکرم کی) ایک نشانی ہو، ہمیں رزق عطا کر، اس لئے کہ تو سب سے بہتر رزق دینے والا ہے، اللہ تعالیٰ نے کہا میں تمہارے پاس دسترخوان بھیجوں گا، لیکن اگر اس کے بعد تم میں سے کسی نے (میری) تکذیب کی تو میں اسے ایسا عذاب دوں گا کہ تمام دنیا میں کسی کو بھی ایسا عذاب نہیں دیا جائے گا"۔

(۱) المائدہ:۱۱۲-۱۱۵۔

آسمان سے خوان نعمت کے نزول کا مطالبہ:

قرآن کریم میں اس کی کوئی تفصیل ہمیں نہیں ملتی کہ یہ خوانِ نعمت آسمان سے نازل ہوا تھا یا نہیں، اگر نازل ہوا تھا تو اس میں کھانے پینے کی کون کون سی چیزیں تھیں، اس سوال کے جواب میں بھی قرآن کریم خاموش ہے کہ حواریین نے آسمان سے نازل ہونے والی چیزیں کھائیں یا نہیں کھائیں، قرآن کریم میں تو یہ تفصیلات موجود نہیں ہیں، البتہ مفسرین نے صحابہ وتابعین کے حوالے سے بہت کچھ لکھا ہے، حضرت مجاہدؒ اور حسن بصریؒ تو یہ فرماتے ہیں کہ نزولِ مائدہ ہوا ہی نہیں، کیوں کہ نزول کے بعد تکذیب وتکفیر کی صورت میں جس خوفناک عذاب سے اس کو مشروط کیا گیا تھا اس کے بعد کسی کو یہ جرأت ہی نہیں ہوسکتی تھی کہ وہ اپنے مطالبے پر ڈٹا رہتا، یہ حضرات کہتے ہیں کہ جن لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے نزول مائدہ کی درخواست کی تھی وہ یہ شرط سن کر ڈر گئے اور انھوں نے اپنی درخواست واپس لے لی، ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر مائدہ نازل ہوتا تو نصاریٰ کے لئے یہ بڑے فخر کی بات ہوتی اور اس کی شہرت ان کی نسلوں میں منتقل ہوتی رہتی، جب کہ نصاریٰ کے یہاں اس کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا، مگر تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے کہ نصاریٰ کے یہاں مائدہ کا ذکر نہیں ملتا، یوحنا کی انجیل باب ٦ میں یہ واقعہ موجود ہے، اس میں یہ بھی ہے کہ مائدہ کا نزول عید فصیح کے موقع پر ہوا۔

خوان نعمت کا نزول:

اکثر مفسرین نے حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ اور حضرت عمار بن یاسرؓ سے منقول روایات کی بنیاد پر یہ لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دُعا شرفِ قبولیت سے سرفراز ہوئی اور آسمان سے مائدہ (خوان نعمت) کا نزول ہوا اور اس طرح ہوا کہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ فرشتے مائدہ لے کر آسمان سے نیچے آرہے ہیں، یہ منظر دیکھ کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ عبادت میں مشغول ہوگئے اور ان کے حواریین نہایت اشتیاق اور بے صبری کے ساتھ فرشتوں کے زمین پر اترنے کا انتظار کرنے لگے، کچھ لمحوں کے بعد وہ خوان زمین پر لاکر رکھ دیا گیا، سب سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام

نے دو رکعت نمازِ شکر ادا کی، پھر دستر خوان کھولا، اس میں تلی ہوئی مچھلیاں، تر و تازہ پھل اور روٹیاں تھیں، ان آسمانی غذاؤں سے بے حد نفیس اور اشتہا انگیز خوشبو آ رہی تھی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریین سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارا مطالبہ پورا کر دیا ہے، اس کا شکر ادا کرو، اور جو نعمتیں اس نے تمہیں بھیجی ہیں انہیں استعمال کرو، لوگوں نے عرض کیا کہ پہلے آپ کچھ تناول فرمالیں پھر ہم کھائیں گے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا یہ کھانے میرے لئے نہیں ہیں، تمہاری درخواست پر اتارے گئے ہیں اس لئے تم ہی کھاؤ، یہ سن کر حواریین ڈر گئے کہ معلوم نہیں کھانے کے بعد کیا صورت حال ہو، ایسا نہ ہو کہ ہمیں اس جرأت بے جا کی سزا ملے، یہ سوچ کر حواریین نے کھانے سے انکار کر دیا، تب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر تم نہیں کھاتے تو فقراء، مساکین، معذور اور بیمار لوگوں کو بلا کر لاؤ، یہ ان کا حق ہے وہ کھائیں گے، چناں چہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ آئے، سب نے شکم سیر ہو کر کھایا، مگر دستر خوان میں کھانے کی چیزیں جوں کی توں رہی۔

نزولِ مائدہ پر تو اکثر مفسرین کا اتفاق ہے مگر یہ سب حضرات اس سلسلے میں مختلف رائے رکھتے ہیں کہ یہ خوانِ نعمت ایک مرتبہ نازل ہوا یا کئی مرتبہ ہوا، بعض مفسرین تو یہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ نازل ہوا، اور بعض کہتے ہیں کہ چالیس روز تک نازل ہوتا رہا، بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ چالیس روز تک یہ نعمتیں آسمان سے اترتی رہیں اور لوگ شکم سیر ہو کر کھاتے رہے، چالیس روز کے بعد یہ سلسلہ موقوف ہو گیا، کیوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کھانوں کی اجازت فقراء، مساکین اور معذورین کو دی تھی، مگر اچھے خاصے بھلے چنگے لوگ بھی کھانے لگے، لوگوں سے یہ کہا گیا تھا کہ تمہیں صرف کھانے کا حق ہے، لے کر جانے اور ذخیرہ کرنے کی اجازت نہیں ہے، بعض لوگوں نے اس حکم کی خلاف ورزی بھی شروع کر دی، وہ لوگ جتنا کھاتے اس سے زیادہ اپنے ساتھ لے کر جانے لگے، اللہ رب العزت نے ناراض ہو کر یہ سلسلہ موقوف فرما دیا اور جن لوگوں نے خلاف روزی کی تھی ان کو دردناک عذاب میں بھی مبتلا فرمایا، مفسرین نے لکھا ہے کہ ایسے لوگوں کو خنزیر اور بندر بنا دیا گیا۔

یہ واقعہ لکھنے کے بعد مفسرین نے لکھا ہے کہ اہل ایمان کو معجزات کا مطالبہ نہیں کرنا چاہیئے، کیوں کہ اس طرح کے مطالبات کرنے کا مطلب خدا کو آزمانا ہے، جس کا ہمیں کوئی حق نہیں ہے، اہل ایمان کو چاہیئے کہ وہ قانون فطرت کے مطابق زندگی گزاریں، اور اپنا رزق ان وسائل و ذرائع سے حاصل کرنے کی کوشش کریں جو قدرت نے مقرر کردئے ہیں، حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ نے تفسیر موضح القرآن میں لکھا ہے کہ مائدہ نہیں اترا، عذاب کی تہدید سن کر مطالبہ کرنے والے ڈر گئے اور اپنی درخواست واپس لے لی، مگر کیوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دُعا کر چکے تھے اور پیغمبروں کی دُعا بیکار نہیں جاتی، شاید اسی دُعا کا اثر ہے کہ نصاریٰ ہمیشہ آسودہ حال رہے ہیں، اس میں مسلمانوں کے لئے عبرت یہ ہے کہ اپنا مدعا خرق عادت کی راہ سے نہ چاہے، پھر اس کی شکر گزاری بے حد مشکل ہے، اسباب ظاہری پر قناعت کرے تو بہتر ہے اس قصے سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو آزمانے کے لئے مطالبے نہیں کئے جاتے بل کہ اپنی حاجات کی تکمیل کے لئے دعائیں کی جاتی ہیں۔

بنی اسرائیل کی زندگی کا ایک پہلو تو وہ ہے جس پر قرآن کریم کی سینکڑوں آیات میں روشنی ڈالی گئی ہے، یعنی سرکشی، بغاوت، پیغمبروں سے عناد، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھی انھوں نے یہی رویّہ رکھا، یہاں تک کہ انھوں نے اپنی دانست میں انہیں پھانسی دے کر یہ قصہ ہی ختم کر ڈالا تھا، یہ اور بات ہے کہ یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہ قتل کر سکے اور نہ سولی دے سکے، بل کہ ایک اور شخص کو جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے شکل وصورت میں ملتا جلتا تھا سولی پر چڑھا کر خوش ہوگئے، ان میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو پیغمبروں سے غلو کی حد تک عقیدت رکھتا تھا، یہ بھی کج روی اور راہ حق سے انحراف کا ایک پہلو ہے کہ انبیاء کی شان اس قدر بڑھادی جائے کہ ان کو الہ العالمین اور خالق کائنات کے برابر مان لیا جائے، اور ان کی عبادت اسی طرح کی جائے جیسے معبود حقیقی کی کی جاتی ہے، کہاں تو اس قدر افراط کہ جو بھی نبی ان کے پاس بھیجا جاتا، اس کی تکذیب کرتے، بل کہ بعض انتہا پسند تو اس پیغمبر کو قتل تک کر ڈالتے اور کہاں اس قدر تفریط کہ پیغمبروں کو خدا سمجھ کر ان کی پرستش شروع کردیتے۔

یہود کا گمراہ کن عقیدہ:

قرآن کریم کی سورۂ مائدہ میں یہود کی اس کج روی کو نمایاں کیا گیا ہے کہ ان میں سے ایک فریق یہ کہتا ہے کہ اللہ ہی عیسیٰ ابن مریم ہے، حالاں کہ عیسیٰ ابن مریم کا کہنا یہ ہے کہ اے بنی اسرائیل ایک اللہ کی عبادت کرو جو تمہارا بھی رب ہے اور میرا بھی رب ہے، اس کے ساتھ کسی کو شریک مت بناؤ، کیوں کہ جو ایسا کرے گا اللہ تعالیٰ اس پر اپنی جنت حرام کردے گا اور اس کا ٹھکانہ جہنم ٹھہرے گا، ایسے ظالموں کی کوئی مدد بھی نہیں کرے گا جو اس طرح کے کفریہ کلمات کہتے ہیں اور اللہ کے بندے کو اس کا عین قرار دیتے ہیں، ایسے لوگوں کے کفر میں کوئی شبہ نہیں ہے، وہ لوگ بھی کافر ہیں جو عیسیٰ ابن مریم کو اللہ کا عین ذات تو نہیں کہتے مگر انہیں تین خداؤں میں سے ایک کہتے ہیں، یعنی وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تین میں سے ایک ہے، گویا خدائی تین کے مجموعے کا نام ہے جن میں سے ایک حضرت مسیح ہیں، دوسرا روح القدس اور تیسرا اللہ ہے، یا ایک عیسیٰ ہیں، دوسری ان کی والدہ مریم اور تیسری ذات اللہ کی ہے، ظاہر ہے ان کے کفر وشرک میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے۔

عیسائیوں کا عقیدۂ تثلیث:

عقیدۂ تثلیث عیسائیوں کا معروف عقیدہ ہے، ان کے مختلف فرقے آج تک اسی عقیدے کے پیچ وخم میں الجھے ہوئے ہیں، نزول قرآن کے وقت بھی نصاریٰ اس کفریہ عقیدے کی گرفت میں تھے، یہ تین طرح کے لوگ تھے، بعض کہتے تھے کہ مسیح عین خدا ہے، اور خدا ہی بہ شکل مسیح دنیا میں اتر آیا ہے، کچھ لوگ یہ کہتے تھے کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں، کچھ لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ الوہیت تین کے مجموعے کا نام ہے، باپ (اللہ) بیٹا (مسیح) اور مریم، پھر اس میں بھی ایک گروہ مریم کی جگہ روح القدس کو خدا قرار دیتا ہے، اس مجموعے کا نام اقانیم ثلاثہ ہے۔

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ لکھتے ہیں کہ تثلیث کا یہ عقیدہ دین مسیحی کے رگ وپے میں اس طرح سے خون بن کر سرایت کر گیا کہ نصاریٰ کے دو بڑے فرقوں رومن کیتھولک اور پراٹسٹنٹ کے درمیان سخت بنیادی اختلافات کے باوجود بنیادی طور پر اس

معاملے میں اتفاق ہی رہا، اور صرف یہی نہیں بل کہ اس سے بھی زیادہ قابل حیرت یہ بات ہے کہ لوتھر کی جماعت اور اصلاح پسند کلیساؤں نے بھی ایک عرصۂ دراز تک اس کیتھولک عقیدے کو ہی بغیر کسی اصلاح و ترمیم کے عقیدہ تسلیم کرلیا، البتہ تیرھویں صدی عیسوی میں فرقۂ لاہوتی کی اکثریت نے اور جدید فرقوں سوسینائی جرمانی، موحدین اور عمومیین وغیرہ نے اس عقیدے کو عقل و نقل کے خلاف کہہ کر تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔

اس عقیدے کا خلاف عقل ہونا تو بالکل واضح ہے، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی سورۂ مائدہ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ذرا غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ جو شخص کھانے پینے کا محتاج ہے، وہ تقریباً دنیا کی ہر چیز کا محتاج ہے، زمین، ہوا، پانی، سورج، اور حیوانات و نباتات سے اسے استغناء نہیں ہوسکتا، غلّے کے پیٹ میں پہنچنے اور ہضم ہونے تک خیال کرو بالواسطہ یا بلا واسطہ کتنی چیزوں کی ضرورت ہے، پھر کھانے سے جو اثرات و نتائج پیدا ہوں گے ان کا سلسلہ کہاں تک جاتا ہے، احتیاج و افتقار کے اس طویل الذیل سلسلے کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم الوھیت مسیح و مریم کو بہ شکل استدلال یوں بیان کرسکتے ہیں کہ مسیح و مریم اکل و شرب کی ضروریات سے مستغنی نہ تھے، جو مشاہدے اور تواتر سے ثابت ہے، اور جو اکل و شرب سے مستغنی نہ ہو وہ دنیا کی کسی چیز سے مستغنی نہیں ہوسکتا، پھر تم ہی کہو کہ جو ذات تمام انسانوں کی طرح اپنی بقا میں عالم اسباب سے مستغنی نہ ہو وہ خدا کیوں کر بن سکتی ہے، یہ ایسی قوی اور واضح دلیل ہے جسے عالم و جاہل یکساں طور پر سمجھ سکتے ہیں، یعنی کھانا پینا الوھیت کے منافی ہے، اگرچہ نہ کھانا بھی کوئی الوھیت کی دلیل نہیں ہے ورنہ سارے فرشتے خدا بن جائیں، بل کہ احتیاج و افتقار الوھیت کے منافی ہے۔

قرآن کریم میں عقیدۂ تثلیث کی تردید:

قرآن کریم نے نصاریٰ کے عقیدۂ ابنیت اور عقیدۂ تثلیث کی تردید میں یہ اسلوب اختیار کیا ہے کہ ایک جگہ تو ان کے اس عقیدے کی تردید کی کہ وہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں وہ صحیح نہیں ہے، بل کہ صحیح بات وہ ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام اپنی قوم کے لوگوں سے کہتے رہے، حیرت کی بات یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام جن بنیادی عقیدوں کا ذکر کرتے

رہے اور جن کی بنی اسرائیل کو تلقین کرتے رہے ان کو تو ان بدبختوں نے نظر انداز کیا اور جو عقیدہ کبھی نہیں اپنایا اور وہ بات جو کبھی اپنی زبان سے نہیں نکالی اس کو انھوں نے اپنا عقیدہ بنالیا، قرآن کریم نے نصاریٰ کے اس عقیدے کا رد کچھ اس طرح کیا ہے۔

۱- لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَنْ يُهْلِكَ الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ.(۱) ''بلاشبہ ان لوگوں نے کفر اختیار کرلیا جنھوں نے یہ کہا بیشک اللہ ہی مسیح بن مریم ہے، کہہ دیجیے کہ اگر اللہ یہ ارادہ کرلے کہ مسیح بن مریم، مریم اور کائنات زمینی پر جو کچھ بھی ہے سب کو ہلاک کرڈالے تو کون شخص ہے جو اللہ سے (اس کے خلاف) کسی شیٔ کے مالک ہونے کا دعویٰ کرسکے اور اللہ کے لئے ہی بادشاہت ہے آسمانوں کی اور زمین کی وہ جو چاہتا ہے اس کو پیدا کرسکتا ہے اور اللہ ہر شیٔ پر قدرت رکھنے والا ہے''۔

۲- لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ وَقَالَ الْمَسِيحُ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ. ''بلاشبہ اں لوگوں نے کفر اختیار کیا جنھوں نے کہا بلاشبہ اللہ وہی مسیح بن مریم ہے، حالاں کہ مسیح نے یہ کہا: اے بنی اسرائیل اللہ کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے بیشک جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے پس یقیناً اللہ نے اس پر جنت کو حرام کردیا ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ظالموں کے لیے کوئی مددنہیں ہے''۔(۲)

۳- وَقَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا سُبْحَانَهُ بَلْ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلٌّ لَهُ قَانِتُونَ.(۳) ''اور انھوں نے کہا: اللہ نے بیٹا بنالیا ہے وہ ذات تو ان باتوں سے پاک ہے بل کہ (اس کے خلاف) اللہ کے لیے ہی ہے جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے ہر شیٔ اللہ کے لیے تابعدار ہے''۔

(۱) المائدہ:۱۷۔ (۲) المائدہ:۷۲۔ (۳) البقرہ:۱۱۶۔

۴- إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ. (۱) ''بلاشبہ عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے کہ اس کو مٹی سے پیدا کیا، پھر اس کو کہا ہو جا تو وہ ہو گیا''۔

۵- يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللّٰهِ إِلَّا الْحَقَّ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِنْهُ فَآمِنُوا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِ وَلَا تَقُولُوا ثَلَاثَةٌ انْتَهُوا خَيْرًا لَكُمْ إِنَّمَا اللّٰهُ إِلٰهٌ وَاحِدٌ سُبْحَانَهُ أَنْ يَكُونَ لَهُ وَلَدٌ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَكَفَىٰ بِاللّٰهِ وَكِيلًا. (۲) ''اے اہل کتاب اپنے دینی معاملے میں حد سے نہ گذرو اور اللہ کے بارے میں حق کے ماسوا کچھ نہ کہو بلاشبہ مسیح ابن مریم اللہ کے رسول ہیں اور اس کا کلمہ ہیں جس کو اس نے مریم پر ڈالا (یعنی بغیر باپ کے اس کے حکم سے مریم کے بطن میں وجود پذیر ہوئے) اور اس کی روح ہیں پس اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور تین (اقانیم) نہ کہو اس سے باز آجاؤ تمہارے لئے بہتر ہوگا بلاشبہ اللہ خدائے واحد ہے، پاک ہے، اس سے کہ اس کا بیٹا ہو، اسی کے لیے ہے (بلاشرکتِ غیرے) جو کچھ بھی ہے آسمانوں اور زمین میں اور کافی ہے اللہ ''وکیل'' ہو کر''۔

۶- بَدِيعُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ وَلَدٌ وَلَمْ تَكُنْ لَهُ صَاحِبَةٌ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ. (۳) ''وہ (خدا) موجد ہے آسمانوں اور زمین کا اس کے لیے بیٹا کیسے ہو سکتا ہے اور نہ اس کے بیوی ہے اور اس نے کائنات کی ہر شئ کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر شئ کا جاننے والا ہے''۔

۷- مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ. (۴) ''مسیح بن مریم نہیں ہیں مگر خدا کے رسول بلاشبہ ان سے پہلے رسول گذر چکے ہیں اور ان کی والدہ صدیقہ ہیں، یہ دونوں کھانا کھاتے تھے (یعنی دوسرے انسانوں کی طرح کھانے پینے وغیرہ امور میں وہ بھی محتاج تھے)۔

(۱) آل عمران: ۵۹۔ (۲) النساء: ۱۷۱۔ (۳) الأنعام: ۱۰۱۔ (۴) المائدہ: ۷۵۔

۸- لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ أَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ إِلَيْهِ جَمِيْعًا.(۸) ''ہرگز مسیح اس سے ناگواری نہیں اختیار کرے گا کہ وہ اللہ کا بندہ کہلائے اور نہ مقرب فرشتے حتیٰ کہ روح القدس ''جبرئیل'' ناک بھوئیں چڑھائیں گے اور جو عبادت سے ناگواری کا اظہار کرے اور غرور اختیار کرے تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنی جانب اکٹھا کرے گا یعنی جزاوسزا کے دن سب حقیقتِ حال کھل جائے گی''۔

۹- وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ن ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ أَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ.(۹) ''اور یہود کہتے ہیں کہ عُزیر خدا کا بیٹا ہے اور نصاریٰ کہتے ہیں مسیح خدا کا بیٹا ہے یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں ریس کرنے لگے اگلے کافروں کی بات کی اللہ ان کو ہلاک کرے کہاں سے پھرے جاتے ہیں''۔

۱۰- قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا أَحَدٌ.(۱۰) ''اے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجئے اللہ کہتا ہے اللہ بے نیاز ہستی ہے، نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا اور کائنات میں کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے''۔

---

(۸) النساء:۱۷۲۔(۹) التوبہ:۳۰۔(۱۰) الاخلاص۔

DARUL KITAB

DEOBAND, DIST. SAHARANPUR, U.P. (INDIA) PIN-247554

Mobile: 9412557658, 9997520332 Phone: 01336-222558

Email : nadimulwajidi@gmail.com